3 (1)

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

النّدوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

9/23

مرتبہ

سید ابو الحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبد السلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۳　　　نمبر ۱

ذی الحجۃ المکرم ۱۳۶۰ھ مطابق جنوری ۱۹۴۲ء

قیمت فی پرچہ تین آنے　　　سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر منیجر "الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ" کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

نومبر کی اشاعت میں عربی مدارس کی اصلاح و تنظیم سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا بعض دوستوں نے اسے بہت پسند کیا، لیکن شاید ہماری آواز ابھی تک دینی تعلیم کے ان مرکزوں تک نہیں پہونچ سکی جہاں اسکی سب سے زیادہ ضرورت تھی، کیونکہ علمی انقلاب کا کیا ذکر ہو ابھی وہاں فکر و خیال میں بھی کسی جنبش کے آثار نظر نہیں آتے، حالانکہ مدتوں سے حالات کا مقتضا ہو کہ ہماری یہ درسگاہیں اپنے نصاب و نظام تعلیم پر نظر ڈالیں تاکہ دین و ملت کے ایسے خدمتگذار پیدا ہوں جو شک و ارتیاب اور انکار و الحاد کے اس بڑھتے ہوئے طوفان میں اُمت کے سفینہ کی ناخدائی کر سکیں۔

ذہنی انتشار اور فکری کشاکش تاریخ اسلام کا کوئی نیا حادثہ نہیں ہو، ایسے پُرآشوب دور خدا معلوم ہماری تاریخ میں کتنی بار آچکے ہیں کبھی رومی تمدن جاذب نظر بنا ہو کبھی یونانی فلسفہ نے نگاہیں خیرہ کی ہیں کبھی مسیحی رہبانیت نے ذہنوں کو متاثر کیا ہو کبھی ہندوستانی یوگ نے دلوں کو لبھایا ہو کبھی ہندی تہذیب باعث کشمکش بنی ہو، لیکن ہر دور میں علماء حق نے رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہو۔ کبھی عمر ابن عبدالعزیزؒ کے قالب میں کبھی اشعریؒ اور غزالیؒ کے رنگ میں کبھی ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کے انداز میں، کبھی مجدد سرہندیؒ اور سید شہیدؒ کی صورت میں حق کے جلوے نظر آئے ہیں۔ ان بزرگوں نے (اللہ ان پر اپنی رحمت کے پھول برسائے) اصلاح و تجدید کی ایسی شاندار خدمتیں انجام دی ہیں جو مسلمانوں کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی اور ان کے نقش قدم آئندہ نسلوں کے لئے دلیل راہ کا کام دیں گے۔

آج بھی حق و باطل کا وہی معرکہ درپیش ہو، حریفوں نے اپنی محفلیں کچھ اس ساز و سامان سے

آراستہ کی ہیں کہ نگاہیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں، دل ان کے ظاہری طمطراق سے مسحور اور قدم ان کے مادی جلال و جبروت سے لرزاں ہیں۔ ضرورت ہو کہ علماء وقت کی اس نزاکت کو محسوس کریں اور سلف کی انقلاب آفریں کوششوں کو دلیل راہ بنا کر قدامت کے بوسیدہ کھنڈر پر پھر ایک جہان نو کی تعمیر کریں تا کہ ملت کا درماندہ راہ قافلہ پھر راہ یاب ہوسکے۔ جمود کے پردے چاک ہوں اور مدتوں کے بھٹکے ہوئے راہی منزل تک پہونچ سکیں۔

اسوقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہو کہ علماء اور عربی مدارس کے متنظمین کسی جگہ جمع ہوں، تا کہ باہم تبادلۂ خیالات کے بعد کوئی صحیح اور متعین راہ اختیار کی جاسکے۔ تذبذب اور گومگو سے سخت نقصان پہونچ رہا ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ علماء کا وقار دین کا وقار ہو۔ ان کی بے وقعتی کم نگاہوں کی نظر میں مذہب کو بے وقعت بنادیگی۔ یہ دعوت ہم پہلے بھی دے چکے ہیں اور آج پھر اسی کا اعادہ کر رہے ہیں۔ کاش ہماری یہ آواز مؤثر ثابت ہو اور ہم علماء کے حلقوں کو وقت کی سب سے بڑی دینی خدمت کے لئے آمادہ کرسکیں۔

معین الندوہ کے مختلف حلقوں کا ذکر ان صفحات میں ہوتا رہا ہو۔ دسمبر میں انجمن کا ایک وفد جونپور گیا تاکہ وہاں بھی ندوہ کے ہمدردوں کا ایک حلقہ قائم ہوجائے۔ مولوی ضیاء اللہ صاحب ندوی مدیر "مستقبل" کے یہاں ارکان وفد کا قیام رہا موصوف نے نہ صرف خندہ پیشانی سے میزبانی کے فرائض انجام دیے بلکہ بیحد مشغولیت کے باوجود ارکان وفد کے ساتھ دوڑ دھوپ میں بھی برابر شریک رہو اس سلسلہ میں ہم جناب مولوی علی حسن صاحب قدوائی اور جناب بشیر احمد صاحب وکیل کے بھی بیحد ممنون ہیں کہ انھوں نے خود بھی ندوہ کے پیغام کو سنا اور دوسروں تک بھی اس آواز کو پہونچایا۔ مولوی علی حسن صاحب نے ارکان وفد کو ایک دن اپنے مکان پر دعوت بھی دی۔ ہمیں جونپور کے دوستوں اور ہمدردوں سے اُمید ہو کہ انکی توجہ کا سلسلہ جاری رہیگا اور جو حلقہ اسوقت بنگیا ہو وہ آیندہ برابر ترقی کرتا رہیگا

میری محسن کتابیں

از جناب خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر تعلیمات ریاست کشمیر

جہاں تک یاد پڑتا ہے مجھے ۱۹۱۳ء سے مطالعہ کا باقاعدہ شوق پڑا۔ میں اُسوقت پانی پت کے میونسپل اسکول میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور گرمیوں کی چھٹیاں بسر کرنے کے لئے میرٹھ گیا تھا جہاں میرے والد خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم اس زمانہ میں وکالت کرتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے اپنے کتبخانہ کی ایک مکمل فہرست تیار کرنیکی فرمائش کی اور میں نے بہت خوشی سے یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ انکے پاس ایک بہت بڑا کتبخانہ تھا جسمیں مختلف علوم وفنون اور زبانوں کی کتابیں تھیں۔ مذہب، فلسفہ، منطق، تاریخ، فقہ، ناول، ادب، قانون، معاشیات غرض ہر قسم کی کتابیں اُنھوں نے جمع کی تھیں اور ان کا بہت غور اور شوق کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ ان کو علاوہ اردو اور فارسی کے عربی اور انگریزی پر بھی غیر معمولی عبور تھا۔ اور وہ ان تمام زبانوں میں بے تکلف تحریر اور تقریر کرسکتے تھے۔ میری ملاقات اور واقفیت خاصی وسیع ہے لیکن میں کسی اور شخص سے واقف نہیں جس کا مطالعہ ان جیسا وسیع اور متنوع ہو اور جس نے اسقدر مختلف علوم میں ایسی بصیرانہ نظر پیدا کی ہو۔ خیر یہ احساس تو مجھے بعد میں ہوا جب میں نے ان کے انتقال کے بعد ان کی تصانیف اور مضامین کو پڑھا اور ان کے معاصرین سے انکی ذہانت اور وسعت معلومات کی داستانیں سُنیں۔ اُسوقت تو مجھے صرف اس بات پر تعجب ہوا کہ انھیں اسقدر مختلف علوم میں کیسے دلچسپی ہوسکتی ہے۔

بہرحال میں نے لائبریری کی فہرست تیار کرنی شروع کی، لیکن کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ منھ کالے ہونے ضروری ہیں! رجسٹر میں کتابوں کے نام درج کرنے اور ان پر کاغذ کی چٹیں لگانے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی دلچسپی کی کتابیں پڑھنی شروع کردیں۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ میں گھنٹوں بجائے

اپنا مفوضہ کام کرنے کے اپنا وقت کتابوں کے پڑھنے میں "ضائع" کرتا۔ والد مرحوم نے بہت دفعہ اس "تضیع اوقات" کو دیکھا لیکن کبھی اس پر نہیں ٹوکا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اسطرح مطالعہ کا سچا شوق پیدا ہو جائے تو وہ عمر بھر انسان کے لئے ایک بہترین رفیق ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ بعض والدین اور استادوں کی طرح ہمدردی اور تخیل سے محروم ہوتے اور بچوں کی نفسیات سے واقف نہ ہوتے تو یقیناً مجھے ٹوک دیتے اور میری ذہنی دلچسپیوں کی دنیا ہی مختلف ہوتی، لیکن انھوں نے بڑی محبت اور دور اندیشی کے ساتھ میری ہمت افزائی کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے دو ماہ میں ہزاروں کتابوں کی فہرست تیار کی اور ہزاروں صفحے پڑھ ڈالے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اسوقت جتنا کچھ پڑھا وہ سب سمجھا نہیں۔ لیکن اس تجربہ سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ روانی اور تیزی کے ساتھ پڑھنے کی عادت پیدا ہو گئی۔ اور میں بجائے ہونٹوں سے اور آواز بلند پڑھنے کے آنکھوں سے پڑھنے لگا جو خاموش مطالعہ کے لئے ایک شرط لازم ہے۔

یہ تو میرا بچپن کا زمانہ تھا، لیکن اسکے چند سال بعد مجھے کئی سال تک اپنے عم محترم مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب مرحوم کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ انکی ساری زندگی علم اور مذہب کے دائرہ میں محدود تھی۔ دنیا کے معمولی کاروبار انکو لئے ایک قسم کی کوفت کا باعث ہوتے تھے۔ ان کو حقیقی مسرت صرف علمی اور مذہبی کاموں میں، وعظ و تقریر میں، تحریر و تصنیف میں حاصل ہوتی تھی۔ ان کا مطالعہ اسقدر وسیع اور متنوع تو نہ تھا جسقدر والد مرحوم کا، لیکن اپنی دلچسپی کے خاص مضامین کا انھوں نے غیر معمولی محنت، استقلال اور دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ قرآن شریف پر انھیں کمال کا عبور تھا اور اسکے مطالب ہر وقت انکی زندگی اور انکی تحریر و تقریر میں جاری اور ساری رہتے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص انکی صحبت میں رہے اور قرآن شریف کی عظمت کا قائل نہ ہو جائے۔ اور یہ احساس عظمت بھی محض اعتقادی اور نظری نہ ہوتا تھا بلکہ عملی ہوتا تھا۔ وہ بھی انکی طرح قرآن شریف کو زندگی کے لئے ایک شمع ہدایت سمجھ-

اور اپنے اعمال و افکار کا سرچشمہ اسی میں تلاش کرتا ہوں۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ انکی صحبت میں مجھے قرآن شریف کے اتھاہ خزانوں پر عبور حاصل ہوگیا، لیکن ان کے طفیل میرے دل پر اسکی عظمت کا نقش بیٹھ گیا اور میں نے اتنی عربی سیکھ لی کہ اس کا مطلب نکال سکوں۔ انھیں کی بدولت مجھے یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ قرآن کو محض "برکت" حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ لینا جس کے الفاظ کو پڑھکر انسان داخل ثواب ہوجاتا ہو غلط ہو، اس کو مذہبی اعتقادات کا مجموعہ سمجھ لینا بھی کافی نہیں، بلکہ ضرورت یہ ہے کہ اس کے عظیم الشان اخلاقی اور معاشرتی اصولوں کو زندگی کے ہنگامہ خیز مسائل کے حل کرنے میں استعمال کیا جائے۔ مذہب کے بارہ میں یہ عملی نقطۂ نظر جو شاید ابتدا میں غیر شعوری طور پر قائم ہوا ہو ہمیشہ میرے مطالعہ اور غور و فکر پر اثر انداز رہا ہو، ان کے فیض صحبت سے میں نے یہ بھی سیکھا کہ علم اور مذہب اور فکر انسانی کی دنیا اس مادّی دُنیا سے جہاں محض معاش کے لئے مسلسل جد و جہد ہوتی رہتی ہو کم وقیع اور کم حقیقی نہیں بلکہ زیادہ اہمیت اور معنویت رکھتی ہے۔

چونکہ ابتدا میں اتفاق سے قرآن شریف کا ذکر آگیا ہو اسلئے میں اسی سلسلہ میں چند مذہبی کتابوں کا اور ذکر کر دوں تو مناسب ہوگا۔ میں نے مذہبی کتابیں زیادہ نہیں پڑھیں اور میرا خیال ہو کہ خالص فقہی اور مذہبی مسائل کی کتابیں جنمیں بعض اوقات جزوی تفصیلات حقیقت کے روشن چہرے کو چھپا لیتی ہیں، عام لوگوں کے لئے چنداں اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان کا مطالعہ صرف ان لوگوں کے لئے ضروری ہو جو نفس مذہب کو اپنا مخصوص موضوع بنانا اور اس میں تحقیق اور تجسس کرنا چاہیں، عام لوگوں کیلئے مذہب کے بڑے بڑے اصولوں سے واقف ہونا اور ان کو عام تجربے اور معلومات کی روشنی میں پرکھنا زیادہ مفید ہو۔ قرآن شریف کی تفسیروں اور ترجموں میں سے میں نے چند کو پڑھ لیا ہے لیکن ان سب میں مقابلۃً مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن نے مجھے زیادہ متاثر کیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے قرآن شریف کی تعلیم کو اصطلاحی اور فقہی نقطۂ نظر سے پیش نہیں کیا بلکہ اس کے وسیع تر مطالب کو بھی واضح کیا ہو، اور زندگی کے بعض اہم مسائل سے اس کا تعلق دکھایا ہو۔ کاش انھیں اتنا موقع اور [illegible] ملے کہ وہ اس ترجمے کو مکمل کرسکیں۔

ایک اور کتاب جس نے مجھے کافی اثر کیا ہے علامہ عبد العلی صاحب ہروی کی "مواعظ حسنہ" ہے یہ علامہ مرحوم کی دس بارہ تقریروں کا ترجمہ ہے جسے مولوی محمد سبطین صاحب لدھیانوی نے جمع کرکے شائع کیا ہے۔ غالباً بہت سے حضرات علامہ مرحوم کے نام اور شہرت سے واقف نہ ہوں گے۔ علامہ عبد العلی مرحوم شاید ۱۹۱۰ء میں ایران کے سیاسی انقلاب کی وجہ سے ہندوستان آئے تھے۔ اس زمانے میں والد مرحوم مالیر کوٹلہ میں جج تھے۔ اور وہیں انکی ملاقات علامہ موصوف سے ہوئی۔ والد مرحوم کو "پیشہ ور" مولویوں کے بارے میں زیادہ خوش فہمی نہ تھی، وہ محض خوش عقیدگی کی بنا پر ہر مولوی نما شخص کے قائل نہ ہوتے تھے۔ لیکن انھیں کئی ماہ تک مسلسل علامہ موصوف کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا اور انھوں نے ان سے نہ صرف مذہب اور فلسفۂ قدیم پر بلکہ علوم جدید پر بھی لمبی لمبی بحثیں کیں اور یہ اندازہ لگایا کہ وہ واقعاً ایک زبردست اور متبحر عالم ہیں جنھوں نے دقت نظر سے مذہب کا اور علوم جدید کا مطالعہ کرکے درجۂ اجتہاد حاصل کیا ہو یعنی انھیں اپنی علمی قابلیت اور جدت فکر کی بدولت یہ حق حاصل ہو کہ وہ مذہبی مسائل میں اجتہاد کر سکیں۔ اسوقت سے والد مرحوم ان کے بہت قائل ہو گئے۔ اور اکثر جب وہ کسی جلسے میں تقریر کرتے تھے تو والد مرحوم اس کا ترجمہ فارسی سے اردو میں فی البدیہہ بیان کر دیتے تھے۔ یہ خدمت بعض اوقات مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب مرحوم اور مولوی محمد سبطین صاحب بھی انجام دیتے تھے اور یہ تینوں حضرات انکی پرمغز اور بصیرت افروز تقریروں اور انکی ذہنی جودت کے بہت مداح تھے۔ میں نے بھی انکی بعض شگفتہ فارسی تقریریں سنی ہیں منھ سے پھول جھڑتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" مواعظ حسنہ میں ان کی جو تقریریں شائع ہوئی ہیں وہ دراصل مجالس عزا کے موقع پر کی گئی تھیں اور ان سب کے آخر میں سید الشہدا علیہ السلام کی شہادت کا بیان ہو لیکن ہر تقریر میں قرآن شریف کے مطالب اور اسلامی اخلاق کے اصولوں کو اسقدر عمدگی اور ندرت خیال کے ساتھ بیان کیا گیا ہو کہ ان کو پڑھکر اسلام کے بلند تصور حیات کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ کچھ تو انکی غیر معمولی طور پر جاذب شخصیت کا سحر ہوگا اور کچھ ان تقریروں کی خوبی

بہر حال جب میں نے اس کتاب کو پڑھا تھا تو مجھ پر اس کا بہت کافی اثر پڑا تھا۔

لیکن حقیقت یہ ہو کہ روح اسلام کی سب سے بہتر تفسیر میں نے علامہ اقبال کی شاعری اور تصانیف میں پائی۔ بحیثیت شاعر کے میں انکی بہت قدر کرتا ہوں اور بعض اعتبار سے انھیں اردو زبان کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ میں انکی ذہانت اور قوتِ فکر کا بہت قائل ہوں۔ مغربی تہذیب کی جو جامع تنقید انھوں نے کی ہے اسکا میری نظر میں بہت بلند علمی مرتبہ ہو۔ مگر ان کی شاعری کا ایک اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اسنے اسلام کا ایک زندہ تصور میرے سامنے پیش کیا اور مجھے اس حقیقت سے روشناس کیا کہ مذہب گوشہ گیری یا محض ریاضت و عبادت کا نام نہیں بلکہ وہ بعض بنیادی اصولوں کے ماتحت زندگی کی تنظیم کی تعلیم دیتا ہے، اور اس کے بے اندازہ امکانات کو ظہور میں لانے کے لئے جد و جہد کرنا سکھاتا ہے۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے	شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل	یا خاک کے آغوش میں راتوں کو مناجات
یہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست	وہ مذہب ملّا و جمادات و نباتات

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

اے مردِ خدا تجھکو وہ قوت نہیں حاصل	جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید	جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت	ناداں یہ سمجھتا ہو کہ اسلام ہو آزاد

اقبال کے کلام نے مجھے زندگی کے ایک نئے حرکت آفریں تصور سے روشناس کیا اور دین اور دنیا کا حقیقی تعلق سمجھایا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ دورِ حاضر کی ترقی اور سائنس کے کمالات اور معجزات کن شرائط کے اندر خدا کی نعمت ہیں اور کب عذاب الٰہی بنجاتے ہیں۔ دیکھئے دین اور دنیا کے تعلق پر کسقدر انوکھے لیکن فیصلہ کن انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

ہر کہ بر افلاک رفتارش بود　　　بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

یعنی جو شخص یا جو قوم اپنی دنیاوی زندگی کو نہ سنوار سکے اور اسمیں حسن اور عظمت کی شان پیدا نہ کرسکے اسکا دینداری اور عبادت گذاری کا دعویٰ کرنا یا تو خود فریبی ہے یا عالم فریبی۔ جو جماعت خدا کی رسی کو مضبوط پکڑ لیتی ہو اسکو نہ پل صراط پر سے گذرنے میں مشکل ہونی چاہئے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہو۔ نہ سیاسی اور معاشرتی الجھنوں کو سلجھانے میں۔ لیکن ان مشکلات سے عقل بغیر عشق کی روشنی اور سوز کے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ عقل چراغ راہ ہے لیکن "عشق" (جسمیں عشق الٰہی اور انسانوں کی پرخلوص خدمت کا ولولہ دونوں شامل ہیں۔) منزل کا تعین کرتا ہے اور مذہب ان دونوں میں توازن قائم رکھتا ہے۔ جب عقل وعشق کا یہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، جب عقل بے زمام ہوجاتی ہو اور مذہب کی تابع نہیں رہتی تو انسانی تہذیب ظلم، ناانصافی اور تخریب کے دلدل میں پھنس کر تباہ ہونے لگتی ہو جیسا کہ آجکل ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو" دور حاضر کے انسان" کے عنوان سے اقبال نے اسی المناک صورت حال کا نقشہ کھینچا ہے۔

عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار　　　عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا　　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا　　　آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　　زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اقبال کی بعض نہایت اثر آفریں نظمیں اسکے پہلے مجموعۂ بانگ درا میں شامل ہیں۔ اسکے فارسی کلام کا شورانگیز شباب پیام مشرق میں پایا جاتا ہو لیکن میرے خیال میں اسکے تصور حیات کی تفسیر کے لئے ان دونوں مجموعوں سے زیادہ اہم اسکی مثنویاں "اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" "جاوید نامہ" اور دو آخری اردو مجموعے "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" ہیں۔ محض فنی اعتبار سے ضرب کلیم میں وہ خوبیاں نہیں جو بال جبریل یا بانگ درا کی بعض نظموں میں ہیں کیونکہ اس مجموعہ میں فکر آرٹ پر غالب آگیا ہے۔ لیکن اسمیں کلام نہیں کہ ان بعد کی نظموں میں اقبال محض وطنی اور قومی بلکہ اسلامی شاعری کی منزل کو بھی گزر کر عالم انسانیت کا شاعر بن گیا ہو اور دنیا کے سامنے بالعموم اور مسلمانوں کے سامنے بالخصوص وہ زندگی کا ایک ایسا بلند نصب العین پیش کرتا ہو جس سے رگوں میں خون تیز ہوجاتا ہو اور انسان کے غیر محدود امکانات کی جھلک

نظر آجاتی ہو۔ بالِ جبریل میں اسکا ساقی نامہ پڑھئے جس میں ان امکانات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بتخانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہو فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہو تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیِ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اقبال کے علاوہ دو اور شاعر ایسے ہیں جنکا اثر یقیناً میرے خیالات اور جذبات پر پڑا ہو ایک حالی اور دوسرے انیس۔ حالی کی مسدس دُنیائے ادب کی ممتاز ترین تصانیف میں سے ہو اسکو میں نے اپنی عمر کی مختلف منزلوں میں پڑھا ہے اور عجیب بات ہو کہ جب کبھی میں نے اسکو چند ماہ یا چند سال بعد از سرِ نو پڑھا ہے اسکی ادبی اور فکری عظمت کا احساس اور گہرا ہو گیا ہے۔ مسدس حالی کے معتقدوں کی تعداد لاکھوں تک پہونچتی ہے لیکن مختلف لوگوں پر اسکا اثر مختلف وجوہ سے ہوا ہو بعض نے اس کا خیر مقدم اس اعتبار سے کیا کہ یہ جدید شاعری کی پہلی اہم تصنیف ہو بعض کے دل پر مسلمانوں کے زوال کی داستان کی گہری چوٹ لگی۔ لیکن مجھے اس کے جس پہلو نے سب سے زیادہ متأثر کیا ہو وہ اسکی سلامتیِ فکر اور وسعتِ نظر ہے۔ مسدس حالی محض ایک بیانیہ تاریخی نظم نہیں بلکہ یہ تاریخ کے ایک اہم دور کی نفسیاتی اور فلسفیانہ تفسیر کرتی ہے۔ حالی نے غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کے ساتھ مسلمانوں کے عروج اور زوال کے اسباب بیان کئے ہیں اور یہ بتایا ہو کہ اگر اس زمانے میں مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اپنے میں کونسی انفرادی اور اجتماعی صفات اور عادتیں پیدا کرنی چاہئیں۔ قوم کے مرض کیلئے

نسخہ لکھنے میں حالی نے اپنا ذہنی توازن ایک ایسے نازک اور پُرآشوب دور میں بھی قائم رکھا جب مشرقی اور مغربی تہذیب کے تصادم نے تقریباً سب لوگوں کے توازن اور نظامِ اقدار کو درہم وبرہم کر دیا تھا۔ بعض لوگ ہر مغربی چیز کو بُرا سمجھتے اور اسکے استعمال کو کفر قرار دیتے تھے۔ بعض لوگ آنکھیں بند کرکے تمام مغربی رسوم ورواج اور اداروں کو اختیار کرنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن حالی نے قدیم وجدید مشرق ومغرب کے مطالبات کو ایک صحیح کسوٹی پر پرکھا اور ان تمام چیزوں کو مسترد کیا جو قومی ترقی کے راستے میں حائل تھیں یا محض اپنی ظاہری چمک سے کم سمجھ لوگوں کی نگاہ کو خیرہ کئے دیتی تھیں۔ مگر اس نے فراخدلی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ ان تمام چیزوں کا خیر مقدم کیا جو زوال پذیر ہندوستانیوں کی بجھی ہوئی زندگی میں شرر پیدا کر سکتی تھیں۔ مسدس حالی میں کیا کچھ نہیں ہے؟ محنت کی عظمت کا اعتراف ہے، بیکاری اور کاہلی کی مذمّت ہے دولتمندوں کے مظالم اور اسراف، غریبوں کی کم ہمّتی، مذہبی پیشواؤں کی بے راہروی اور اہلِ سیاست کے تعصب اور تنگ نظری پر احتساب ہے جھوٹی اور اوچھی شرافت کی پردہ دری ہے مزدوروں اور کسانوں اور محنت کشوں کی ہمدردی ہے۔ غرض وہ تمام چیزیں جو ایک معقول اور باانصاف نظامِ معاشرت کو قائم کرنے کے لئے یا افراد کی سیرت کی صحیح تشکیل کے لئے ضروری ہیں حالی کے یہاں موجود ہیں۔ اور اگر میں کسی حد تک یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری (SENSEVALUES) یعنی چیزوں کی اضافی قدر وقیمت کے متعلق میرا اندازہ صحیح اور مناسب ہو تو اسکو زیادہ تر مسدس حالی کے مطالعہ کا تصدق سمجھنا چاہیئے اور حالی کے خیالات کی اس تفسیر کا جو میرے عم محترم جناب خواجہ غلام السطین صاحب مدظلہٗ نے اپنی تعلیم اور اپنی مثال کے ذریعہ کی ہے۔

دوسرا شاعر جس نے مجھے متأثر کیا ہے، انیس ہے۔ انیس کو قدرت سے دو غیر معمولی عطیے ملے۔ ایک تو شعر گوئی کا ایسا ملکہ جو اعجاز کی حد تک پہونچتا ہے اور دوسرے ایسے موضوع کا انتخاب جسمیں درد اور اثر آفرینی بدرجہ اتم موجود ہیں یعنی کربلا کا واقعہ اور سیّد الشہدا حضرت امام حسینؑ کی ذات مبارک۔ آپ میں نے

اپنے مرثیوں میں ایثار، محبت، ہمدردی، شرافت، جرأت، انسانی دوستی اور خدا ترسی کے جو جیتے جاگتے
نقشے کھینچے ہیں اور ان محبوب شخصیتوں کی سیرت نگاری میں جس سوز اور خلوص اور فنی قابلیت سے کام لیا ہے
اس سے متاثر نہ ہونا ممکن ہی نہیں۔ انیس کو پڑھکر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انسان جو اسقدر کمزور بھی ہے
اور ظالم ہے، جو اکثر خود اپنی اسفل فطرت کے ہاتھوں بے بس ہوجاتا ہے، جو اپنے چھوٹے چھوٹے اور
گھٹیا مقاصد کے لئے اخلاق اور مروت اور اصول پرستی کا خون کرنے سے نہیں چوکتا اور بے تکلف
دوسروں کی حق تلفی کرتا ہے، یہی انسان اخلاقی اور روحانی ترقی کے منازل طے کرکے اس بلند مقام
تک پہونچ سکتا ہے جو انیس کے ہیرو اور انسانی تاریخ کے سب سے بڑے مجاہد اور شہید امام حسینؑ کو حاصل ہو۔
جب زندگی کی تحریصیں اور اسکی آزمائشیں یورش کرتی ہیں، جب دیانت اور ایمان کی ٹمٹاتی ہوئی روشنی
بجھنے لگتی ہے، جب انسان حالات سے مجبور ہوکر چاہتا ہو کہ اصول اور عدالت کے کٹھن راستے کو ترک
کرکے عام لوگوں کے رنگ میں رنگ جائے اور انکی آسان پسندی اختیار کرلے، اسوقت حسین ابن علیؓ کی
مثال سامنے آکر دستگیری کرتی ہے اور زندگی کے ایک بہتر لیکن دشوار گزار راستے کی طرف رہنمائی
کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بہت سے لوگوں کو ایسا تجربہ ہوا ہوگا اور اس تجربے میں انیس کی شاعری کو
بڑا دخل ہو جس نے واقعۂ کربلا کو لافانی شعر کے قالب میں ڈھال کر اسکی حقیقی اہمیت اور معنویت کو
عام لوگوں تک پہونچایا ہے۔

میں نے اُردو کی بہت کافی کتابیں پڑھی ہیں اور انمیں سے بعض یقیناً فنی اور فکری اعتبار سے
بہت قابل قدر ہیں۔ مثلاً پریم چند کے ناول اور افسانے جنمیں ہندوستانی زندگی کی نبض چلتی ہوئی
دکھائی دیتی ہو۔ حالی کی "حیات جاوید" جسمیں اس نے اپنے ممدوح سرسید کی ہمہ گیر اور متنوع شخصیت کی
ایک امٹ تصویر کھینچی ہے۔ (میرا خیال ہو کہ سوائے ٹیگور کے ہندوستان کے مشاہیر میں سے کسی اور کے
حصے میں اتنی مختلف قسم کی صلاحیتیں اور قوتیں اسقدر فراوانی کے ساتھ نہیں آئیں) سرشار کا

فسانۂ آزاد جسمیں ایک بہت دلچسپ لیکن زوال پذیر تمدّنی دور کا نقشہ بڑی چابک دستی سے کھینچا گیا ہو.
فرحت اللہ بیگ کے مضامین، ٹیگور کی بعض ادبی اور قومی تصانیف (یعنی ان کے بُرے بھلے ترجمے) وغیرہ وغیرہ
جب میں نے ان کتابوں کو پڑھا تھا میں ان سے یقینًا متأثر ہوا تھا اور محسوس یا غیر محسوس طریقے پر
انھوں نے بھی اور بہت سی کتابوں کی طرح میرے خیالات کی دُنیا کو وسیع کرنے اور میری انسانی ہمدردی کو
ہمہ گیر بنانے میں حصہ لیا لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے شعوری طور پر میرے خیالات اور جذبات کو
ان کا مخصوص رنگ دیا ہو اسلئے اس فہرست کو زیادہ لمبا کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا. علاوہ اسکے بہت سی
کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنکو انسان دلچسپی اور شوق کے ساتھ پڑھتا ہو، لیکن بعد میں ان کا مضمون بلکہ ان کا
اور ان کے مصنف کا نام بھی یاد نہیں رہتا. لیکن ایسی کتابوں کے متعلق میرا ایک تسکین دہ نظریہ ہو جسکا ذکر
میں آگے چل کر کروں گا. لیکن یہاں بہرحال صرف ان کتابوں کا تذکرہ مقصود ہو جن کا شعوری اثر خاص
طور پر گہرا ہوا ہو. اس زمرہ میں شاید مندرجۂ بالا کتابیں کافی ہوں گی.

نظامِ تعلیم کا "فیض" سمجھئے یا مقابلۃً ہماری زبان کی کم مائگی، مجھے اردو کتابوں سے زیادہ انگریزی
کتابوں کو پڑھنے کا اتفاق ہوا ہو. لیکن یہ بھی واقعہ ہو کہ انگریزی زبان میں ادب اور علوم کے ان گنت اور انمول
خزانے بھرے ہوئے ہیں اور ہم لوگوں کے لئے تو دوسری مغربی زبانوں اور ان کے ادب کی کنجی بھی انگریزی زبان
ہی ہے کیونکہ اسمیں بیشتر یورپی زبانوں کی مستند تصانیف کے ترجمے موجود ہیں. انگلستان اور ہندوستان کے
سیاسی تعلق کی وجہ سے جہاں ہندوستان کی قومی زندگی اور ارتقا کو بہت کچھ نقصان پہونچا ہے اور انگریزی
تعلیم کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم اور ہماری ملکی زبانوں کا حیات بخش رشتہ ٹوٹ گیا ہے، وہاں اس حقیقت سے بھی
انکار نہیں ہو سکتا کہ انگریزی زبان اور ادب اور مغربی علوم کے مطالعہ نے ہماری نظر کو زیادہ وسیع اور بعض
اعتبار سے ہمارے ذہنی ارتقا کو زیادہ تیز بنا دیا ہے. اگر ہماری سیاسی تاریخ مختلف ہوتی تو شاید ہم مغربی
علوم تک کسی اور راستے سے پہونچتے. لیکن شاید مشیت الٰہی اسی طرح تھی!

جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اس مضمون میں کونسی انگریزی کتابوں کا تخصیص کے ساتھ ذکر کروں تو مجھے ایک مشکل پیش آتی ہے۔ کتابیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان سب کا مفصل تذکرہ کرنا ناممکن اور صرف فہرست لکھ دینا بیکار ہے۔ علاوہ اسکے میرا خیال یہ ہے کہ بہت سی اچھی اور مفید کتابیں جو ہم پڑھتے ہیں انکا نقش انفرادی حیثیت سے ہمارے دل اور دماغ پر قائم نہیں رہتا بلکہ بعض اوقات ہم ان کے مطالب کا خلاصہ ان کا پلاٹ بلکہ ان کے مصنف کا نام تک بھول جاتے ہیں۔ کم از کم میرا تجربہ یہی ہے۔ لیکن اسکا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کا مطالعہ بیکار گیا۔ درحقیقت اس کتاب کی جزوی تفصیلات محو ہو جاتی ہیں لیکن اس کی روح، اسکے کرداروں کی سیرت، انکی شرافت اور انسانیت اور اس کا مرکزی خیال ہمارے دل اور دماغ کی گہرائیوں میں جا بیٹھتا ہے اور غیر شعوری طور پر ہمارے خیالات اور جذبات، ہمارے اعمال اور حرکات پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ کوئی انسان کسی بڑے تخلیقی تجربے سے گذرنے کے بعد وہ نہیں رہتا جو پہلے تھا۔ خواہ وہ تجربہ دُکھ کا ہو یا سکھ کا، آرٹ کا ہو یا عشق و محبت کا یا مذہب کا یا سیاست کا، اسکی سیرت کے بنیادی عناصر میں ایک نیا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ کسی بلند پایہ مصنف یا کسی اعلیٰ درجے کی کتاب کا مطالعہ اسی قسم کے تخلیقی تجربات میں سے ہے۔ اگر کوئی اچھی کتاب محض تفریح یا وقت گذارنے کے لئے نہیں پڑھی گئی ہے، اگر اس نے پڑھنے والے کے دل کے تاروں کو ہلایا ہو اور اسکے دل میں احساس، ہمدردی اور حُسن شناسی کے نئے جذبات کو اُبھارا ہے تو وہ اسکی زندگی کا جزو بنجاتی ہے اور اسکا پیغام اس کے خون کے اندر سرایت کر جاتا ہے۔ اسی وجہ سے میرے لئے فرداً فرداً کتابوں کا ذکر کرنے کے بجائے یہ بتانا زیادہ سہل ہوگا اور یہی شاید پڑھنے والوں کے لئے بھی زیادہ دلچسپی کا باعث ہو کہ کن مصنفوں نے میرے خیالات کو سب سے زیادہ متأثر کیا ہے اور کیوں!

یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مجھے سب سے زیادہ ادب عالیہ کے مستند ارکین نے متأثر کیا ہے۔ میں نے مغربی ادب بالخصوص انگریزی ادب کے بہت سے مستند مصنفین، خصوصاً ناول نویسوں کی تصانیف کو پڑھا ہو اور ان میں سے بعض مثلاً ڈکنز اور گوئٹے کا میں بہت معترف ہوں لیکن یہ زیادہ تر انکی ادبی عظمت کا

اعتراف ہو۔ انھوں نے میرے خیالات کے بنانے میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ ان کا مجھ پر بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے مجھے ایک گذرے ہوئے دور کی سماجی زندگی کی جھلک دکھائی اور عالم انسانیت کے ان جذبات اور تجربات سے روشناس کرایا جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں۔ مگر میرے خیالات کو ڈھالنے میں ان سے زیادہ بعض جدید مصنفوں کا حصہ ہے جنھوں نے گذشتہ پچاس سال میں اپنی علمی اور سیاسی تصانیف یا اپنے ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کے ذریعے اس عظیم الشان سماجی جدوجہد میں حصہ لیا ہو جس کا مقصد انسانوں کی اجتماعی زندگی اور ان کے باہمی تعلقات میں عدل اور انصاف کی حکمرانی قائم کرنا اور نسل، رنگ اور دولت کے ان امتیازات کو دور کرنا ہے جنھوں نے انسانوں کی زندگی میں سے اخوت، مساوات اور شرافت کے جذبات کو خارج کر دیا ہے۔ مجھے ان تمام لوگوں کی زندگی اور کارنامے اپیل کرتے ہیں جنھوں نے اس بلند مقصد کے لئے جدوجہد کی ہے۔ مجھے وہ تمام مصنف عزیز ہیں جنھوں نے اپنے قلم کو محض جمالی تفریح کا آلہ نہیں بنایا بلکہ اسکے ذریعے سے انسانوں کی سوئی ہوئی شرافت کو بیدار کرنیکی کوشش کی ہے اور ان کھلے اور چھپے مظالم کے خلاف آواز بلند کی ہو جو دولت مند غریبوں پر، زبردست کمزوروں پر، سرمایہ دار مزدوروں پر، سفید رنگ والے گندمی اور سیاہ رنگ والوں پر، تعصبات عقل پر، سماج افراد پر اور افراد سماج پر کرتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے ایک جگہ کسی یونانی مصنف کا قول نقل کیا ہو کہ دنیا میں جہاں کہیں کوئی حسین عورت ہو وہ میری عزیز اور رشتہ دار ہو۔ اس احساس جمال سے کہیں زیادہ میرے دل میں اس احساس انسانیت کی قدر ہو جو یہ سمجھے کہ دنیا میں جہاں کہیں کوئی دُکھی دل ہو، یا کوئی مظلوم شخص ہے جس کی حق تلفی ہوئی ہے یا کوئی ایسی جماعت ہو جسکی خداداد آزادی سلب کر لی گئی ہو وہ میری دوست اور عزیز اور رشتہ دار ہو اور اسکی حمایت کرنا، اسکی خاطر جہاد کرنا میرا مقدس فرض ہو۔ یہی احساس ہو جو ان تمام مصنفوں میں کم و بیش مشترک ہو جن کے خیالات نے مجھے متاثر کیا ہے۔

اس جماعت میں بہت سے لکھنے والے شامل ہیں جو فنی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں

اور ادبی لحاظ سے ہم پلہ نہیں لیکن انمیں انسانیت کا درد اور اسکو دور کرنے کی تڑپ مشترک ہے۔ میں انمیں سے انگلستان کے برٹرنڈ رسل، برنارڈشا اور ایچ جی ویلز، فرانس کے اناطول فرانس، اور روماں رولاں، امریکہ کے اپٹن سنکلیر کو بلند مرتبہ دیتا ہوں۔ ان سب میں قدر مشترک یہ ہو کہ انھیں اپنے ملک اور اپنے زمانے کی خرابیوں اور خامیوں کا احساس ہو۔ انکی وطن دوستی اندھی نہیں رہ ضمیر ہے۔ یہ دور حاضر کی فنی اور صنعتی ترقی اور سائنس کے کمالات سے چکا چوند ہو کر ایک سستی اور اوچھی قسم کی خود پسندی اور قومی خوش فہمی میں گرفتار نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اپنی قوت تنقید کو بیدار رکھا ہے اور ایک چابک دست سرجن کی طرح سے ان فساد کے مرکزوں کو ٹٹول کر صاف کرنے کی کوشش کی ہے جو سماج کے جسم کو بیمار اور اسکے خون کو گندا کر رہے ہیں۔

(باقی)

افلاطون کا نظریۂ تعلیم

محمد اقبال وارث صاحب انصاری ندوی

"الندوہ" کے صفحات میں وقتاً فوقتاً مختلف تعلیمی نظریے پیش ہوتے رہے ہیں ذیل کا مضمون بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے

اُمید کہ قارئینِ "الندوہ" کے حلقہ میں دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔　　(مدیر)

افلاطون نے اپنی کتاب جمہوریت (Republic) میں جو تعلیمی نظریہ پیش کیا ہے وہ بہت اہمیت رکھتا ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ وہ فن تعلیم کو خاص علمی بنیاد پر قائم کرنیکی پہلی اور کامیاب کوشش ہے اگرچہ افلاطون نے اپنی آخری تصنیف کتاب القوانین (Laws) میں بھی اس پر بحث کی ہے اور حسب ذیل خاکہ پیش کیا ہے۔

"شیرخواری اور بچپن کا زمانہ احتیاط سے گذرنیکے بعد تین برس پڑھانے لکھانے میں صرف کئے جائیں اسکے بعد تین برس تک لائر (ایک قسم کا ستار) بجانا سکھایا جائے، پھر تین برس تک حساب، ہندسہ، ہیئت اور قانون سکھایا جائے۔ پھر ناچنے، کشتی لڑنے، دوڑنے شکار کھیلنے اور سخت فوجی ورزش کرنیکی مشق کرائی جائے اور اسکی پابندی نہ صرف مردوں پر ہو بلکہ عورتیں بھی اسمیں پابندی سے حصہ لیں۔"

مگر تعلیمی نظریے کی جو تفصیل "جمہوریت" میں کیگئی ہے اسکی کسی اور تصنیف میں موجود نہیں ہے اور حقیقت یہ کہ اگر "جمہوریت" کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو روسو (Rousseau) کے اقوال "فن تعلیم پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں انمیں یہ سب سے بہتر ہے[1]" "اور اگر تعلیم عامہ کا مفہوم تم معلوم کرنا چاہتے ہو تو افلاطون کی کتاب ریپبلک کا مطالعہ کرو[2]" کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ تعلیم سے انسان میں وہ استعداد پیدا ہو سکتی ہے جو اسکی سرشت میں داخل نہ ہو

---

[1] مقدمہ ریاست صفحہ ۱ [2] تاریخ التعلیم صفحہ ۱

مگر افلاطون کو یہ مغالطہ نہ تھا، اسکے نزدیک تعلیم سے یہ مقصود ہی نہیں ہو کہ آدمی جو کچھ نہ جانتا ہو جان جائے اسکا مطمح نظر یہ ہے کہ "انسان" بجائے اور حق مطلق یا خیر مطلق کا ادراک کرنے لگے، وہ ارسطو (Aristotle) کی طرح نہ تو تعلیم کا منشا "حصول راحت" قرار دیتا ہو اور نہ سوفسطائیوں کی طرح اسے محض اجتماعی کامیابی کا ذریعہ بتلاتا ہو، وہ علم کو صرف علم کی حیثیت سے محض دماغی و ذہنی تربیت کے لئے حاصل کرنیکی دعوت دیتا ہو اسکے نزدیک "تعلیم وہ عمدہ خصلت ہو جو بچوں میں خوشی، غمی، محبت و نفرت کے خیالات کو جوان کے دلوں میں پیدا ہوں ضبط و اعتدال کے ساتھ ظاہر کرنیکی قدرت پیدا کرے"۔ اسکے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہو کہ علم کا کوئی معلمہ نہ ہونا چاہئے اور علم حاصل کرتے وقت سونا چاندی پیدا کرنیکا سوال ہی نہ ہونا چاہئے، یہی نہیں بلکہ افلاطون کو حرص دولت اکیڈمی کے لئے بھی گوارا نہ تھی، چنانچہ کتاب القوانین میں ایک جگہ یونانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"وہ (یونانی) دولت کی طمع میں ہر وقت مبتلا ہیں، ان کو اتنا وقت نہیں ملتا کہ مال و دولت کے سوا کسی اور بات کی طرف متوجہ ہوسکیں، دولت ہی میں سب کا دم اٹکا ہو ۔ کوئی علم و ہنر کوئی پیشہ اور کام جس سے روپیہ پیدا ہوسکے اسکو تیار رہیں، باقی سب چیزوں پر ہنستے ہیں ۔ ۔ ۔ سونے چاندی کی حرص و طمع میں جس سے سیر ہونا ممکن ہی نہیں، ہر شخص تیار رہے کہ کوئی فن، کوئی کام جس سے روپیہ پیدا ہو اسکو فوراً اپنا پیشہ بنالے ۔ ۔ ۔ ہوا و حرص کو بجھانے اور نفس پروری کے لئے کوئی شکل بھی پیدا ہو خواہ وہ پاک ہو یا ناپاک نیک ہو یا بد اسکو اختیار کرنے میں ذرا عار نہیں[۲]۔"

افلاطون کے نزدیک معلم کا فرض یہ ہو کہ وہ علم کی روشنی ایسی جگہ رکھدے کہ اس پر شاگرد کی نظر پڑجائے مگر اسکے ساتھ ہی وہ صحبت کو تعلیم کا ایک اہم جزو قرار دیتا ہو جس کے بغیر علم ایسا ہی ہو جیسا بغیر جلا کے آئینہ، صحبت کی اس گوناگوں اہمیت کے پیش نظر افلاطون کے نزدیک معلم کے فرائض منصبی میں یہ بھی داخل ہو کہ شاگرد کے لئے ایسا ماحول اور ایسی صحبت مہیا کردے جو اسکی ذہنی نشوونما کے مناسب ہو۔ اگر یہ امور پایۂ تکمیل کو پہونچ جائیں تو بلاشبہ تعلیم کا

---

[۱] تاریخ التعلیم ص۱ [۲] یونانی شہنشاہیت ص۹۹،۱۰۰

ں ہو جائے گا اور اگر ایک طرف معلّم اپنے فرائض کی ادائیگی سے سبکدوش ہو جائیگا تو دوسری طرف شاگرد اپنی
ی قوت کے استعمال کرنیکے قابل ہو جائے گا، جو قدرت کی جانب سے اسے ودیعت کی گئی ہے۔

تعلیم افلاطون نے تعلیم کے لئے جو نصاب مقرر کیا ہو وہ خود اسکی اپنی ایجاد نہیں ہو بلکہ اس کا بڑا حصّہ
فلف ملکوں میں جو نصاب تعلیم رائج تھے، ان سے ماخوذ ہو، جسمیں اثینہ (Athenae) اور
(Sparta) کے نصاب تعلیم کی آمیزش زیادہ ہو بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ افلاطون نے یونان کے
اہم تعلیمی مذاہب کو یکجا سمونے کی کوشش کی ہو تو بالکل صحیح ہو گا، اسلئے افلاطون کے تعلیمی نظریہ کو سمجھنے کیلئے
، ہو کہ پہلے اثینہ اور اسپارٹا کے نصاب تعلیم پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

کا نصاب تعلیم اثینہ کے نظام کا بانی یونان کا مشہور مقنن سولن (Solon) ہے
ے قبل حکومت کی جانب سے صرف جسمانی تعلیم کا انتظام تھا۔ ذہنی تعلیم ذاتی کوششوں پر منحصر تھی، سولن نے
و ذہنی تعلیم کو مساوی درجہ دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اسپارٹا کے نصاب تعلیم کو دیکھتے ہوئے اثینہ کا نصاب تعلیم ایک حد تک
تھا اور اسمیں جسم و دماغ دونوں کی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ آمیزش کی گئی تھی۔ البتہ سلطنت کو تعلیم
ذکار نہ تھا۔ اہل شہر خود اپنی تعلیم کے ذمہ دار تھے۔ یہی سبب تھا کہ اعلیٰ تعلیم صرف امراء و خوش حال لوگوں کیلئے
ں، غرباء اس سے بالکل محروم تھے۔ اثینہ کا نصاب تعلیم ورزش، ادب، اور موسیقی پر مشتمل تھا۔ سولن کے نزدیک
پڑھنے اور تیراکی سیکھنے کو اور چیزوں پر فضیلت تھی اور جاہل وہ شخص تھا جو "نہ الف بے جانے اور نہ تیراکی" اعلیٰ
ورزش اور موسیقی کی تعلیم تو شہر کے مرفہ الحال باشندوں کے لئے قرار دی اور نوشت و خواند تیراکی اور کسی
تعلیم غرباء کے لئے تجویز کی۔ چھ سات سال تک کی عمر کے بچے عموماً دایہ کی نگہداشت میں رہتے تھے، اس عمر
۔ انھیں ابتدائی تعلیم کی غرض سے ابتدائی مدرسوں میں داخل کر دیا جاتا تھا جنمیں معمولاً لکھنے پڑھنے کے
لچھ شعر و موسیقی اور ورزش جسمانی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ موسیقی کی تعلیم میں پہلے صرف گانا سکھایا جاتا تھا اسکے بعد
، اور ستار بجانا، اسقدر تعلیم ہو جانے کے بعد صرف نحو کی تعلیم عام طور سے کھلے میدانوں اور گذرگاہوں میں

دی جاتی تھی۔ جو لوگ اس سے زیادہ تعلیم دلانا چاہتے تھے وہ اپنے بچوں کو اپنے خرچ سے خطابت وسیاست کے فنون حاصل کرنے کے لئے سوفسطائی معلموں کے پاس بھیجدیتے تھے اسکے بعد اٹھارہ سے بیس سال تک کی عمر کے شہریوں کو حکومت خود فوجی تعلیم دیتی تھی۔ اکلیزیا (Ecclesiae) کے نام سے ایتھنہ والوں کی ایک مجلس قائم تھی جسمیں ماہرین فن جمع ہوکر دوسروں سے مقابلہ کرتے تھے تاکہ لوگوں کو ہرقسم کے پیشہ اور فن میں کمال حاصل کرنیکی ترغیب ہو۔ اسطرح مصوروں اور نقاشوں میں مقابلہ ہوتا تھا۔ دوڑ اور ہرقسم کی جسمانی ورزشوں میں بھی مقابلہ ہوتا تھا، تمام مقابلوں سے بڑھکر المیہ (Tragedy) اور خوش انجامیہ (Comedy)[1] نویسوں کا ہوتا تھا جسمیں المیہ نویس کو سال میں بارہ ناٹک (Drama) تصنیف کرنے پڑتے تھے اور خوش انجامیہ نویس کو سال میں چھ نئے ناٹک لکھنے پڑتے تھے۔ اسیطرح شاعروں شعر پڑھنے والوں اور خطیبوں میں بھی مقابلہ ہوتا تھا۔ مقابلہ میں اول آنے کا صلہ شہرت وانعام ہوتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہر فن کے ماہر کی طبیعت میں اس فن کے متعلق ایسا صحیح ذوق پیدا ہوجاتا تھا جسمیں کسی کو کوئی سقم نظر نہ آتا تھا۔[2]

اسپارٹا کا نصاب تعلیم اسپارٹا میں جو نصاب تعلیم رائج تھا، وہ لائی کرگس (Lycurgus) کا مقرر کردہ تھا، جسے اسنے بہت جانفشانی و جانکاہی سے مرتب کیا تھا۔ اور محض اس غرض سے اسنے دور دراز ملکوں کا سفر کرکے ان کے نصاب تعلیم کا بچشم خود معائنہ کیا تھا، اور ماہرین فن سے بھی اس بارہ میں مشورہ حاصل کیا تھا، لائی کرگس کا بڑا کارنامہ یہ ہو کہ "اسنے بچوں کی تربیت ان کے ماں باپ کی رائے پر نہ چھوڑی جو اپنے لاڈ پیار سے اپنی اولاد کو خراب کردیتے ہیں اور ان کا ظاہر و باطن ضعیف ہوجاتا ہے"[3]

اسپارٹا میں علم وادب کی تعلیم گویا برائے نام تھی، نصاب تعلیم میں ذہنی قوی کی تربیت کا کوئی لحاظ ہی نہ تھا بلکہ مدار تعلیم کے صرف ایک ہی رخ یعنی جسمانی تربیت پر تھا یوں سمجھو کہ مقصود صرف جنگی تعلیم تھی۔ اور حقیقت یہ ہو کہ اگر اسپارٹا

---

[1] اس کا ترجمہ، سرور یہ، ترحیہ اور قصہ خوش انجام بھی کیا گیا ہے، مگر میرے نزدیک یہ زیادہ موزوں ہو۔ ۱۲ اقبال

[2] یونانی شہنشاہیت صفحہ ۵۸　　[3] یونان کی قدیم تاریخ صفحہ ۳۲

کے نصاب تعلیم کا تجزیہ کیا جائے تو "فنون جنگ" اور "رسوم اطاعت" کے علاوہ کوئی دوسرا فن با ہنر نظر ہی نہ آئے گا۔ البتہ تعلیم سلطنت کے ذمہ ہونے کی وجہ سے غربا بھی امرا کے دوش بدوش اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے تھے، جب کوئی لڑکا پیدا ہوتا تھا تو ماہرین اور تجربہ کاروں کو جمع کیا جاتا جو اس "نوزائیدہ" کا معائنہ کرتے اگر وہ آٹھوں گانٹھ کا پورا ہوتا، تو زمین کے نو ہزار حصوں میں سے ایک حصہ اس کی جاگیر مقرر کر دیتے اور اگر ایسا ناتواں دیکھتے کہ اس کے قوی ہونے کی توقع نہ ہوتی تو محض اس وجہ سے کہ اس کی نسل اس سے زیادہ ناتوان ہوگی، اس کے مار ڈالنے کا فتوی صادر کرتے، تمام بچے سلطنت کی ملکیت سمجھے جاتے تھے، سات سال تک خود ان کے والدین ان کی پرورش کرتے تھے، اور انھیں سکھاتے تھے کہ کھانے پر اصرار نہ کریں، جو کچھ ملے کھائیں تنہائی اور اندھیرے میں نہ ڈریں، رونے چلانے سے واسطہ نہ رکھیں ننگے پیر پھریں، کھڑے بچھونوں پر سوئیں محنتوں کے عادی ہوں اور کام سے جی نہ چرائیں اس کے بعد وہ سلطنت کی تعلیم گاہوں میں بھیجدئے جاتے تھے جہاں انھیں علیحدہ مکانوں میں رکھا جاتا تھا اور سرکاری نگرانوں کی تربیت میں جبریہ طور سے تعلیم دی جاتی تھی، اور تمام بچوں پر ایک ہی قانون جاری کیا جاتا تھا، ان کی تربیت کا نگراں اعلیٰ ایک بلند مرتبہ شخص مقرر کیا جاتا تھا جو اپنی تجویز سے ہر ایک جماعت کے لئے ایسا معلم مقرر کرتا تھا جس کی عقل و دیانت مسلم اور چال ڈھال ٹھیک ٹھاک ہو،

چونکہ تمام بچے ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے، اس لئے معلموں کا دستور تھا کہ کھانا کھاتے وقت بھی مختلف قسم کے سوالات کے ذریعہ تعلیم دیتے رہتے تھے مثلاً ان سے پوچھا جاتا تھا کہ شہر میں کون آدمی متدین ہو اور اس کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ جس کا جواب وہ بہت سلیقہ کے ساتھ مختصر لفظوں میں دیتے تھے۔

جب ان کی عمر بارہ سال کی ہو جاتی تھی، تو انھیں سلطنت کی جانب سے صرف ایک کوٹ دیا جاتا تھا جسے سال بھر پہننا پڑتا تھا، اس کوٹ کے علاوہ خواہ گرمی ہو یا سردی انھیں کسی دوسرے کپڑے کے استعمال کی اجازت نہ تھی، ان کا بستر بھی وہ خشک چند ٹہنیاں ہوتی تھیں جنھیں وہ خود اپنے ہاتھوں سے توڑ لایا کرتے تھے، انھیں بھوک پیاس، اور گرمی سردی کا عادی بنایا جاتا تھا تاکہ ان پر خواہشات و تکلفات کا تسلط نہ ہونے پائے جسمانی تربیت کی غرض سے جمناسٹک کی ورزشیں کرائی جاتی تھیں تاکہ جسم سخت اور مضبوط ہو جائے، اور اس کی پابندی نہ صرف لڑکوں پر تھی بلکہ لڑکیوں کو بھی اس میں حصہ لینا پڑتا تھا تاکہ آئندہ

نسلیں مضبوط و توانا ہوں، ان بنگروٹی ورزشوں کے ساتھ انھیں رسوم اطاعت کی بھی تعلیم دی جاتی تھی، اور ان میں ماں باپ کے ادب، بڑوں کے احترام اور بزرگوں کے لحاظ کا بھی سلیقہ پیدا کیا جاتا تھا، انھیں سکھایا جاتا تھا کہ بزرگوں کو جھک کر سلام کریں ان کی تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہوجائیں۔ اگر کوئی بزرگ آجائے اور اس کے بیٹھنے کے لئے جگہ نہ ہو تو اپنی جگہ خالی کردیں راستہ میں ان کے سامنے نہ آئیں خندہ پیشانی کے ساتھ ان کی بری بھلی سنیں، ان کی نصیحتوں کو قبول کریں اور ان کے مشوروں پر عمل کریں۔ یہ باتیں نہ صرف ان کی روزانہ تعلیم میں داخل تھیں بلکہ عمل کرا کے انھیں ان امور کی بجا آوری کا خوگر بنا دیا جاتا تھا، اسپارٹا والے بڑی حد تک ان امور کے پابند تھے اور واقعی ان کا "کمال ادب یہ تھا کہ ان کی "بزرگوں کی بری بھلی سنتے تھے اور کھوٹی کھری اٹھاتے تھے، اور جو وہ فرماتے تھے کامل ناکام اس کو مانتے تھے، انھیں باتوں سے لیمیسٹرن (اسپارٹا) والے ممتاز تھے اور جب کسی سے بھولے چوکے کوئی امر اس کے خلاف ظہور میں آتا تو ساری بستی کی بے غیرتی اور تمام شہر کی بدنامی کا باعث وہی شخص سمجھا جاتا تھا۔[۱]

موسیقی انسان کی نظرت میں داخل ہو وہ روح کے اندر تک اپنی راہ نکال لیتی ہو اور سختی کے ساتھ اسیر تابعی ہو جاتی ہو، اسلئے اُسے بالکل فراموش تو نہ کیا جاسکتا تھا البتہ لسے نصاب تعلیم میں کوئی اہمیت نہ تھی اور جو گیت گائے جاتے تھے وہ اکثر ان محسنین قوم کی شان میں ہوتے تھے جنھوں نے قوم کی خاطر اپنا تن من دھن قربان کر ڈالا ہو، تمام نصاب تعلیم میں "رسوم اطاعت" کا بہت چرچا تھا، اور اسے یہانتک مقدم سمجھتے تھے کہ جو کچھ اُن سے کہا جاتا تھا، بے عذر و تکلف اُسپر عمل کرتے تھے۔

اسپارٹا کے نصاب تعلیم پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہو کہ وہاں کے باشندے ایک فوجی زندگی بسر کرتے تھے جسمیں کسی شخص کو بھی یہ اختیار نہ تھا کہ جس طرح چاہے اپنی زندگی گزارے۔ پیدائش سے لیکر موت تک بسر اوقات کے قوانین نہایت وضاحت کے ساتھ حکومت کی جانب سے مقرر کر دیے گئے تھے اور پیدا ہونے سے قبل ہی ہر آدمی کی زندگی کا مکمل نقشہ تیار کر دیا گیا تھا، درحقیقت یہ قوانین ایک فوجی اسکول کے تھے، جسمیں فنون جنگ کی

---

[۱] یونان کی قدیم تاریخ صفحہ ۹

تعلیم دیجاتی ہوتا کہ اعلان جنگ ہوتے ہی تمام سپاہی میدان جنگ میں کود پڑیں۔ سات برس سے لیکر ساٹھ برس تک مردوں کی آبادی کے نصف حصہ کو محض میدان جنگ کے لئے تیار کیا جاتا تھا جن کا جسمانی ورزش اور سیر شکار کے علاوہ کوئی دوسرا کام ہی نہ تھا، بقیہ باشندوں کو بھی دنیا کے اور دھندوں سے کچھ سروکار نہ تھا بلکہ تجارت صنعت اور حرفت جو کام حکومت چاہتی انپر لازم کردیتی اور وہ اسکی بجاآوری پر مجبور رکھے۔ یہ حالات کچھ ایسے تھے جنکی باعث اسپارٹا والے زندگی کی لذتوں کو فراموش کرچکے تھے، علوم و فنون کی ترقی تو درکنار ان کے دماغوں میں نئے قسم کے خیالات بھی نہ آتے تھے۔

افلاطون کا کارنامہ افلاطون نے ایتھنز اور اسپارٹا کے نصاب تعلیم کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اُن نتائج سے بھی آگاہ تھا، ایتھنز کے نصاب تعلیم کا خود اُسے ذاتی تجربہ حاصل تھا، اسلئے کہ یہ اس کے اپنے شہر کا مذہب تھا، اسکے نزدیک یہ دونوں طریقے کچھ افراط و تفریط کے تھے اسلئے اسنے دونوں میں تھوڑی بہت ترمیم کرکے اُنکی خوبیاں یکجا کرنیکی کوشش کی اگر ایک طرف اسنے اسپارٹا کی طرح تعلیم کا بوجھ حکومت پر ڈالا اور ہر فرد بشر کو جماعت کا خادم قرار دیا تو دوسری طرف اسپارٹا کی طرح محض اکھڑ سپاہی نہیں بنایا، بلکہ ایتھنز کی طرح انھیں ادب و موسیقی کی تعلیم بھی دی جو سیرت انسانی کے تمام عناصر کی ترتیب و تہذیب کے لئے ضروری ہی، البتہ اسنے ادب و موسیقی کو یکجا کرکے ورزش اور موسیقی، صرف دو فن رکھے۔ اسی طرح اس نے تعلیم کے دو درجے رکھے ہیں۔ درجۂ ابتدائی اور درجۂ تکمیل۔ پہلے درجہ کی تعلیم ہر شخص پر لازم ہوگی اور اس کا زمانہ بچپن سے شروع ہوکر جوانی پر ختم ہوگا یعنی چھ سال کی عمر سے لیکر اٹھارہ سال کی عمر تک، اس درجہ میں جنگ آزمائی کی تعلیم دیجائیگی اور یہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ "محافظ" کہلائے گا جس سے مراد افلاطون کے نزدیک وہ اعلیٰ طبقہ ہے جو ملک کو دشمنوں سے بچائے اور شہر میں امن داخلی برقرار رکھنے کا کوشاں رہے۔

دوسرے درجہ میں حکمرانی کی تعلیم دی جائیگی اور اس کا زمانہ بیس سال سے شروع ہوکر بڑھاپے تک رہے گا، اور اس درجہ سے مقصود ملک میں "حکمران" پیدا کرنے ہوں گے۔

ابتدائی درجہ ابتدائی درجہ کے نصاب تعلیم کا خاکہ یہ ہوگا کہ پیدا ہوتے ہی بچوں کو دایوں کے سپرد

کر دیا جائے گا اور اسمیں اسقدر احتیاط برتی جائے گی کہ والدین اپنے بچوں کو پہچان سکیں اور نہ بچے اپنے والدین کو، جب انکی عمر چھ سال کی ہوجائے گی تو انھیں ابتدائی تعلیم کے سرکاری مدارس میں داخل کیا جائیگا جہاں موسیقی، اور ورزش کی تعلیم دی جائے گی مگر اس تعلیم کو محض ایک قسم کی تفریح کا ذریعہ بنایا جائے گا. اور اس کا خیال رکھا جائے گا کہ بچے کے ذہن میں یہ بات آنے ہی نہ پائے کہ اس نصاب تعلیم کو اسپر جبراً عائد کیا جا رہا ہو اسی لئے افلاطون جبریہ تعلیم کا سخت مخالف ہے، وہ کہتا ہے کہ "ایک حُر کو کسی علم کی تحصیل میں غلام نہ ہونا چاہئے ورزش جسمانی اگر لازمی بھی ہو تو جسم کو نقصان نہیں پہونچاتی لیکن جو علم بجبر حاصل کیا گیا ہو وہ دماغ پر تسلط حاصل نہیں کرتا"[1]. البتہ افلاطون کے نزدیک ورزش و موسیقی کا وہ مفہوم نہ تھا، جو آج ہم سمجھ رہے ہیں. اس نے ان دونوں لفظوں کو زیادہ وسیع معنی میں استعمال کیا تھا، ورزش سے مراد جسمانی نگہداشت و نشو و نما ہو مگر افلاطون نے اسکے ساتھ حفظانِ صحت کے اصولوں کو بھی یعنی علاج اور صحیح غذا کو بھی شامل ہو، ورزش کے مفہوم میں شامل کر لیا تھا، موسیقی سے مطلوب ذہن و جذبات کی تربیت ہو اور اسمیں رقص و سرود کے ساتھ مصوری، نقاشی اور نظم و نثر کے اعلیٰ نمونوں کا مطالعہ بھی شامل ہو، اس لئے کہ یہ علوم ذہنی و جسمانی تربیت کے درمیان واسطہ ہیں، افلاطون نے ان سب چیزوں کو موسیقی میں اسلئے شمار کیا ہو کہ مصور اپنے خیالات کو رنگ میں، نقاش پتھر میں اور شاعر یا نثار الفاظ میں مرتسم کرتا ہو ان خیالات کے اجزا پر اگر جدا جدا غور کیا جائے تو بظاہر مختلف معلوم ہوتے ہیں مگر بحیثیت مجموعی انمیں کوئی فرق نہیں اور درحقیقت موسیقی کے جزو نصاب بنانے کی غرض یہی ہو کہ اسکی جاذبیت و دلکشی نوجوان کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرے، اور ان کی روح بے جانے بوجھے اسکی تعلیم کو قبول کرلے.

موسیقی کی اس گوناگوں اہمیت کے باوجود افلاطون ایسی موسیقی کی جس سے مراد ساز کے ساتھ گانا ہو سخت مخالفت کرتا ہو اسلئے کہ اس سے بے غیرتی پیدا ہوتی ہے. اسی موسیقی نے اتھنیہ والوں میں ہمہ دانی کا زعم پیدا کر دیا تھا! ورنہ انھیں اسقدر غلو تھا کہ اس غلط فہمی میں پڑ گئے تھے کہ وہ سب جانتے ہیں، اس خیال نے ان کے دل سے خوف نکال دیا اور اس کا انجام وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی بے غیرتی پیدا ہو گئی.

---

[1] ریاست ص ۳۶۴

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ورزش سے جسم اور موسیقی سے ذہن کی تربیت مقصود ہوگی مگر افلاطون اس تقسیم کو رسمی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے "میرے نزدیک تو رسًا جو تقسیم کی جاتی ہے وہ بالکل ٹھیک ہے یعنی جسم کے لئے ورزش اور دماغ کے لئے موسیقی[1] اسی بنا پر وہ موسیقی و ورزش کی غایت جدا جدا تہذیب روح اور ترقی جسم نہیں قرار دیتا بلکہ صرف تربیت روح قرار دیتا ہے، اسی لئے وہ صرف کسی ایک کے سیکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ محض ورزش جسمانی سے طبیعت میں سختی و درشتی پیدا ہوتی ہے اور صرف موسیقی پر توجہ کرنے سے طبیعت میں رقت و نرمی، اور افلاطون ان دونوں حالتوں میں توازن پیدا کرنا چاہتا ہے وہ خود کہتا ہے کہ "جب انسان اپنے کو موسیقی سے متاثر ہونے اور کانوں کے ذریعہ اپنی روح میں شیریں و نرم یا المناک ترانوں کو داخل ہونے دے، اور جب اسکی ساری زندگی نغمہ سرائی اور انبساط موسیقی میں صرف ہو تو اسکی طبیعت میں لوہے کا سا لوچ پیدا ہو جائے گا اور بجائے زود شکن اور بیکار ہونے کے وہ اس عمل کے ابتدائی مدارج میں نہایت مفید و کارآمد بن جائے گا۔ لیکن اگر نرم کرنے کا یہ عمل ذرا زیادہ جاری رہا تو دوسری منزل پھر گلنے اور ضائع ہونے کی ہے حتیٰ کہ یہ سارا جذبہ فنا اور روح کی ساری قوت زائل ہو کر وہ جنگ آزمائی کے معیار کے مطابق نہایت کمزور انسان رہ جائے گا"[2]

افلاطون کے نزدیک موسیقی و ورزش دونوں سے اصل مقصود انسانی سیرت و اخلاق کا سنوارنا ہے وہ جسم کی تربیت بھی محض ذہن کی خاطر ضروری قرار دیتا ہے، اور ورزش سے جرأت و پامردی کے وہ صفات پیدا کرنا چاہتا ہے جن سے نفس پر اتنا قابو حاصل ہو جائے کہ وہ روح کے لئے ایک بہترین مسکن بن سکے موسیقی کو وہ عقل کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے اور جذبات میں توازن، عادات میں میانہ روی اور مزاج میں اعتدال پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ جذبات و خواہشات کا عقل پر غلبہ اور دل و دماغ پر تسلط نہ ہونے پائے۔

محض موسیقی کی تعلیم میں جو نقائص ہیں وہ ابھی بیان کئے جا چکے ہیں، انھیں نقائص کی بنا پر افلاطون موسیقی کی تعلیم کے بعد ہی "ورزش" شروع کرا دیتا ہے مگر اس کا بھی یہی حال ہے، اگر کوئی شخص سخت ورزش

---

[1] ریاست ص۱۰۹ [2] ریاست ص۱۹۱

کرے اور موسیقی سے کنارہ کش رہے تو اس کے جسم کی خوبی اسمیں خود اعتمادی اور غرور پیدا کر دیتی ہے اور اگر وہ ایسا ہی کرتا رہے تو اسمیں جو تھوڑی بہت ذہانت و ذکاوت ہوتی ہو وہ بھی رخصت ہو جاتی ہے ایسا شخص بالکل اَن پڑھ ہو جاتا ہو، اسمیں علمی مباحثوں سے نفور پیدا ہو جاتا ہو اور اسکی حالت ایک وحشی درندے کی سی ہوتی ہے ہمہ تن تشدد و خونخواری کہ اسے معاملہ کا کوئی دوسرا طریقہ آتا ہی نہیں سلیقہ مندی حسن عمل سے یک قلم نابلد، کامل جہالت میں اپنی زندگی گزارتا ہے[1]۔"

افلاطون اگرچہ ابتدائی تعلیم کو محض ایک قسم کی تفریح قرار دیتا ہے، لیکن اس کا سخت انتظام کرتا ہو بچوں کی تفریح بھی جائز حدود سے باہر نہ ہونے پائے اس لئے کہ یہاں اس کا ایک بار بھی چسکا پڑتا ہے عمر بھر نہیں جاتا، اور پھر اسمیں وفاداری پیدا ہی نہیں ہو سکتی، افلاطون اس کا علاج بھی موسیقی ہی تجویز کرتا ہے، وہ کہتا ہو کہ موسیقی کے ذریعہ ان کے دل و دماغ میں وفاداری کے خیالات سرایت کر جائیں گے، تو پھر آداب و اخلاق کے قاعدوں پر بھی ان کی نظر رہے گی" مثلاً "بزرگوں کی موجودگی میں خوردوں کا متانت اور خاموشی سے بیٹھنا، جب وہ آئیں تو اٹھکر ان کی تعظیم کرنا، جھک کر آداب بجالانا، والدین کا ہر طرح خیال رکھنا، یا مثلاً سر کے بال ٹھیک بنانا، جوتے کپڑے اور ذاتی آرائش کا مناسب خیال کرنا وغیرہ[2]"

بقول افلاطون "سولن مبتلائے توہم تھا، جب اس نے کہا کہ آدمی بڈھا ہو کر بہت سی چیزیں سیکھ سکتا ہو، حالانکہ جس طرح وہ بڈھا ہو کر دوڑ نہیں سکتا ویسے ہی زیادہ سیکھ بھی نہیں سکتا، ہر غیر معمولی محنت کا وقت شباب ہی ہو[3]" اسی بنا پر افلاطون نے تعلیم کے دو خاص درجے رکھے ہیں۔ جن امور کا تعلق بڑی حد تک تفریح سے ہو انھیں ابتدائی تعلیم میں شامل کر کے بچوں کی بنیاد کو مستحکم اور انھیں آیندہ آنیوالی محنتوں کیلئے تیار کیا گیا ہو اسلئے کہ جو باتیں بچپن میں سکھلادی جاتی ہیں وہ دلنشیں بلکہ نقش کالحجر ہو جاتی ہیں اور آیندہ کام آتی ہیں۔ غیر معمولی محنت والے امور کو آخری درجہ میں رکھا گیا ہو جس کا زمانہ جوانی سے شروع ہوتا ہو اسلئے کہ اب انمیں اس کام کی صلاحیت و اہلیت پیدا ہو جاتی ہو۔ (باقی)

---

[1] ریاست ص۱۹۲ [2] ایضاً ص۲۲۰ [3] ایضاً ص۳۱۲

نقد و نظر

میری دُنیا از جناب عقیل احمد صاحب جعفری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، صفحات ۲... قیمت ۱۲؍ جناب مصنف سے خیرآباد ضلع سیتاپور کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

عقیل صاحب ایک خوش فکر اور خوشگو شاعر ہیں، خیرآباد کی سرزمین، پھر حضرت ریاض کا گھرانہ آنکھ کھولی تو فضا شاعرانہ نغموں سے گونج رہی تھی، ہوش سنبھالا تو گرد وپیش شعر وسخن کی محفلیں آراستہ نظر آئیں زبان وادب کے چرچے رات دن کے مشغلے تھے، صحبت ملی تو ایسے بزرگ کی کہ جس کی زباندانی کا سکہ ملک میں رائج تھا۔ ؎

ہندوستاں میں دھوم ہو کس کی زبان کی　　وہ کون ہو ریاض کو جو جانتا نہیں

اس فضا میں مذاق شعر وسخن کا جو حال ہوگا ظاہر ہو۔ یوں تو عقیل صاحب کی نظمیں اور غزلیں وقتاً فوقتاً ملک کے مشہور رسائل واخبارات میں شائع ہوتی رہی ہیں لیکن زیر نظر کتاب میں انھوں نے شعر وسخن کا ایسا گلدستہ پیش کیا ہو جس کے پھول شاید سدا بہار رہیں۔ شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ عقیل صاحب نے اسمیں سیاست کی آمیزش بھی کر دی ہو جو شاید بہتوں کے لئے خوشگوار ہو لیکن ایک خاص خیال کی ترجمانی بلکہ شاید وکالت نے اسکی عمومیت میں پارٹی کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔

داستان نند کمار مترجمۂ مولوی محمد حمید صاحب مرحوم و مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی و مولوی محمد عبدالستار صاحب ایم۔ اے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۶۰

برطانوی ہند کی تاریخ میں وہ مناقشات بہت مشہور رہیں جو وارن ہسٹنگز اور اس کے ارکان کونسل فلپ فرانسس وغیرہ کے درمیان پیش آئے اور جو اس مشہور مقدمہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئے جو انگلستان میں وارن ہسٹنگز کے خلاف سات برس تک چلتا رہا۔ ان واقعات میں نند کمار کی شخصیت بہت نمایاں ہو

پہلے وہ ہگلی کا عامل تھا، جنگ پلاسی کے بعد ۱۷۶۵ء میں میر قاسم کے بعد نواب نجم الدولہ کے ماتحت نائب صوبہ دار بنگال مقرر ہوا۔ بعد کو کمپنی اسکی جانب سے غیر مطمئن ہوگئی اور اسے عہدہ سے برطرف کر کے محمد رضا خاں کا تقرر عمل میں آیا، چند برس کے بعد محمد رضا کی برطرفی کی ضرورت محسوس ہوئی تو نند کمار کی خدمات سے فائدہ اُٹھایا گیا۔ نند کمار سمجھا تھا کہ اُسے پھر نائب صوبہ داری کا منصب مل جائیگا، لیکن کمپنی اسے کوئی بااقتدار عہدہ دینا نہیں چاہتی تھی اسلئے اس کے لڑکے گرداس کو صرف صوبہ دار کے خانگی دیوانی میں اس کے مصارف کی دیکھ بھال تفویض ہوئی، یہ طرزِ عمل نند کمار کو سخت ناگوار ہوا اور اسنے مخالفت کے منصوبے قائم کرنے شروع کئے۔ اتفاق سے اس زمانے میں کونسل کے ارکان خلپ فرانس وغیرہ وارن ہسٹنگز کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے اسلئے نند کمار بھی اسمیں شریک ہوگیا اور کلکتہ کی عدالت میں ہسٹنگز کے خلاف خیانت ورشوت ستانی کا مقدمہ دائر کر دیا گیا، لیکن اسی درمیان نند کمار پر ایک جعلسازی کا مقدمہ قائم ہوگیا اور اسے پھانسی کی سزا دیدی گئی۔ زیرِ نظر کتاب میں انھیں واقعات کی تفصیل ہو مصنف وارن ہسٹنگز کا بے انتہا حامی ہے۔

ہندوستان کی حالت برطانوی تسلط کے قریب سڈنی کی مشہور کتاب کا اُردو ترجمہ ہو جو مولوی ہاشمی صاحب فریدآبادی کے قلم سے ہوا ہے اور سررشتہ تالیف و ترجمہ حیدرآباد کی طرف سے شائع کیا گیا ہو اس کتاب میں برطانوی حکومت سے پہلے کی ہندوستان کی حالت دکھائی گئی ہو۔ شروع میں پس منظر کے طور پر مغلیہ حکومت کے متعلق مختصر واقعات ہیں، پھر مرہٹوں کی جنگوں اور حیدرعلی اور نظام الملک کے واقعات ہیں اور آخر میں پانی پت کی آخری جنگ کا ذکر ہے جس پر بقول مصنف "تاریخ ہند کا دلسپی دور ختم ہوگیا سلطنت مغلیہ کا وجود محسوس ناپدید ہوگیا، البتہ صاحبان فرنگی کا ستارہ عروج پر ہوا اور مصادف نظر آتا ہو کہ آفاق پر اسی کی بادشاہی تحریر ہے۔"

ہندوستان میں انگریزوں کی کامیابی کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اس پس منظر کا مطالعہ مفید ہوگا۔

تاریخ طبری ترجمہ مولانا عبداللہ العمادی، صفحات ۲۲ء

دار الترجمہ کی جانب سے طبری کی مشہور تاریخ کا ترجمہ عرصہ سے شائع ہو رہا ہو، زیر نظر کتاب حصۂ سوم و چہارم کی تیسری جلد ہو، ترجمہ صاف ہے۔

علوم الحدیث مصنفہ مولانا شاہ عز الدین صاحب ندوی ادیب دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کاغذ اچھا، کتابت واضح، طباعت صاف صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

اس کتاب میں حدیث کی دینی اہمیت، سنت کی تعریف، تدوین حدیث کے اسباب، اسکے مختلف ادوار، مشہور محدثین اور ان کی تصنیفات اصول حدیث کے اہم مباحث، علم رجال کی تشریح، اور اسکی مختصر تاریخی سرگذشت بیان کی گئی ہے۔ مصنف کی یہ کوشش اہل علم کے حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی ہو۔ کتاب کی اشاعت کو سات برس ہو گئے، اس اثنا میں معلومات میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا ہے۔ اُمید ہو کہ نقش ثانی نقش اول سے بہت بہتر ہوگا۔

اصول نفسیات مشہور ماہر نفسیات سر ولیم جیمس کی کتاب کا ترجمہ ہو جسے مولوی احسان احمدؐ صاحب بی۔ اے۔ نے کیا اور سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوا ہو۔ یہ کتاب کی تیسری جلد ہو جو ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہو۔ اس جلد میں جبلت جذبات اور ارادہ وغیرہ سے متعلق مختلف مسائل پر بحث کی گئی ہو، کتاب کے مباحث کے متعلق کوئی صاحب فن ہی صحیح رائے دیسکتا ہو البتہ زبان کے متعلق جی چاہتا ہو کہ کچھ اور صاف ہوتی ہرچند کہ فنی کتابوں کا ترجمہ دشوار ہوتا ہو لیکن تاہم اسے کچھ نہ کچھ شگفتہ اور رواں بنایا جا سکتا ہے۔ مولوی محمدؐ الیاس صاحب برنی کے معاشی کتابوں کے ترجمے اسکی نمایاں مثال ہیں۔

الحجاب فی الاسلام مصنفہ مولانا حید رحسن خاں ٹونکی سابق شیخ الحدیث و مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء کاغذ، طباعت ٹائپ بہت بہتر، قیمت ۴ر

پردہ کا مسئلہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام میں بہت عرصہ سے زیر بحث ہو اس

سلسلہ میں مختلف کتابیں اور رسالے شائع ہو چکے ہیں، لیکن خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے اس موضوع پر ایک محققانہ کتاب کی ضرورت بہت عرصہ سے محسوس کیجا رہی تھی، خدا کا شکر ہو کہ حضرت مولانا حید زحسن خاں صاحب مدظلہ العالی کی اس تصنیف نے اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ زیر نظر کتاب میں قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر بڑی تحقیق اور نکتہ سنجی سے بحث کی گئی ہو۔ اس سلسلہ میں اصول حدیث پر بھی بعض عالمانہ اور نادر بحثیں ہیں امید کہ اہل علم کے حلقوں میں یہ کتاب خاص اہمیت اور قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ کتاب عربی زبان میں لکھی گئی ہو اور خوبصورت ٹائپ میں طبع کرائی گئی ہو تاکہ ہندوستان سے باہر کے اہل علم کے حلقوں میں بھی اسکی اشاعت ہوسکے۔

جواہرت حفیظ تقطیع خورد صفحات ۳۲، قیمت ۳ر ملنے کا پتہ:۔ دفتر مستقبل قضیانہ جونپور

صوبجات متحدہ کے اضلاع مشرقی میں حفیظ جونپوری خاصے متعارف ہیں، امیر مینائی کے شاگرد تھے کلام پختہ اور رواں تھا، ان کے عقیدتمندوں نے ان کے کلام کا ایک انتخاب شائع کیا ہو، سوا سو شعر اس مجموعہ میں درج کئے گئے ہیں، کلام کا اندازہ ذیل کے ان چند اشعار سے ہوسکتا ہے۔

آغاز محبت میں برسوں یوں ضبط سے ہم نے کام لیا ... جب ہوک کلیجہ میں اُٹھی تو ہاتھوں سے دل تھام لیا

تسلی سے بڑھتی رہی بے قراری ... بھر آیا ہے جی وہ جو سمجھا رہے ہیں

دنیا مری نگاہ میں صحرائے یاس ہے ... جس دن سے جی اُداس ہو عالم اُداس ہے

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہو ... ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

آدمی کیا ایک مشت خاک ہو ... جان نکلی اور قصہ پاک ہے

ح ق

حالات ندوہ

انجمن الاصلاح کے انتخابات کا ذکر پچھلے حالات میں ہو چکا ہو، اس مہینہ حسب دستور مسند نشینی کی رسم انجام پائی۔ اس موقع پر انجمن کے ارکان اور عام طلبا کے علاوہ اساتذۂ دارالعلوم اور انجمن کے ارکان دوامی بھی موجود تھے۔ سابق ناظم نے گذشتہ سال کی کارگزاریوں کی رپورٹ سنائی، پھر نئے صدر نے اپنا خطبۂ صدارت سنایا، پرانے عہدہ داروں اور نئے کارکنوں کے گلوں میں ہار ڈالے گئے، مہتمم صاحب دارالعلوم کی جانب سے نئے ارکان کو مبارکباد دی گئی۔ نئے صدر، و ناظم کو زرّیں ہار پیش کئے گئے اور پرانے ناظم کو حسن خدمات کا تمغہ مرحمت ہوا۔

عیدالاضحیٰ سے کچھ پہلے مولانا عمران خاں صاحب ندوی، مہتمم دارالعلوم دفعۃً علیل ہو گئے پہلے سردی کا خفیف اثر محسوس ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے لقوہ کی شکل اختیار کی۔ فوراً علاج کی طرف توجہ ہوئی، شفاءالملک حکیم عبدالحسیب صاحب کے علاج سے کافی فائدہ ہوا، دوا اور پرہیز کا سلسلہ ابھی تک جاری ہی ہے، اُمید ہے کہ چند دن میں انشاءاللہ مرض کے اثرات بالکل دور ہو جائیں گے۔

مجلس الالباب الریاضیہ (گیمس کمیٹی) کا وقت نومبر میں پورا ہو گیا تھا، دسمبر میں نیا انتخاب عمل میں آیا اور حسب ذیل طلبا منتخب ہوئے۔

جنرل کیپٹن ۔ عبدالحفیظ قدوائی   نائب کیپٹن ۔ عبدالجلیل مجددی

ہاکی کیپٹن ۔ نظام الدین حیدرآبادی   فٹبال کیپٹن ۔ علی احمد بنیادی

والی بال کیپٹن ۔ محمد صابر جاوی

نئے انتخاب کے بعد کھیل میں بھی پھر تازگی آگئی ہو. مقامی میچوں کے علاوہ اس درمیان کانپور سے حلیم مسلم کالج سے پروفیسر سید ابو بکر صاحب حسینی ایم، اے کی قیادت میں ایک ٹیم آگئی تھی۔ اس ٹیم سے بھی ایک ہاکی میچ رہا۔ ٹیم کے ممبروں کا تین دن دارالعلوم میں قیام رہا۔ ندوہ ٹیم کی جانب سے کھیل کے بعد تفکہات کے علاوہ ایک دعوت بھی دی گئی۔

مجلس نقبا کا ایک دور ختم ہوگیا۔ ۱۲ر جنوری کو دوسری مجلس منتخب ہوئی عہدہ داروں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

نقیب عام۔ عبدالحفیظ قدوائی　　نقیب شرقی۔ محمد مشیر

نقیب غربی۔ محمد یوسف میسوری　　نقیب تعلیم۔ احمد خالد۔ عبدالحلیم

نقیب صلوٰۃ۔ محمد مصطفٰے نظام الدین۔　　نقیب صحت۔ منظور خالد۔ احتشام علی

مجلس طعام کے انتخابات بھی ہوگئے ہیں اور اس خدمت کے لئے حسب ذیل طلبہ منتخب ہوئے ہیں۔

ناظم۔ وحید الرحمٰن　　نائب ناظم۔ محمد یوسف الہ آبادی

ارکان۔ محمد یوسف میسوری۔ عبدالجلیل مجددی۔ اسمٰعیل پٹیل۔ عبداللہ بلواڑی

وحید احمد، غلام محمد، عبدالغفار

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابوالحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبدالسلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر "منیجر الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ" کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

جنگ بلقان کے زمانہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں جس سیاسی بیداری کا آغاز ہوا تھا ۱۹۱۹ء میں اسکی تکمیل ہوگئی۔ ممالک اسلامی کے دردناک مصائب اور خلافت اسلامیہ کی افسوسناک تباہی سے سارا ملک تڑپ اُٹھا، اور ہر جگہ اضطراب و بے چینی اور غم واندوہ کی ایک لہر دوڑ گئی، اس عالم وارفتگی میں علما بھی درس کی مسندیں چھوڑ کر میدان میں آگئے۔

خلافت کی تحریک نے علماء کو بھی اپنی تنظیم کا خیال دلایا اور ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد پڑی۔ ندوۃ العلماء کے بعد یہ علماء کے اجتماع کی دوسری کوشش تھی، خیال تھا کہ جمعیۃ کے قیام سے علماء کا بکھرا ہوا شیرازہ پھر مجتمع ہو جائے گا اور اُمت کا بڑھتا ہوا انتشار ختم ہو جائے گا لیکن بیس بائیس سال کی جد و جہد کے بعد بھی حالات بدستور بلکہ شاید پہلے سے بھی بدتر ہیں، آج بھی زمانہ کے حالات سے بیخبری وقت کی ضرورتوں سے ناآشنائی، اصول وکلیات سے اعراض، اور جزئیات و فروعات میں انہماک کا وہی عالم ہے، تکفیر وتفسیق کا بازار اسی طرح گرم ہے اور "گنبد و دستار کی عمارت گری" "ہنوز خانۂ شرع کی خرابی کا باعث ہو رہی ہے۔

یہ صورت حال دین کے خادموں کے لئے حد درجہ افسوسناک ہے، جمعیۃ کے محترم ارکان کا فرض ہے کہ وہ سنجیدگی سے ان واقعات پر غور کریں ماضی کے تجربوں سے فائدہ اٹھائیں اور حال کے تقاضوں کی روشنی میں مستقبل کا ایسا لائحہ عمل اختیار کریں جو ایک عصر نو کی تمہید ہو خوش قسمتی سے اس وقت سالانہ اجلاس کا زمانہ قریب ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا جائے گا اور لاہور کا آیندہ

اجتماع جمعیۃ ہی کی تاریخ میں نہیں بلکہ ہندوستان کی اسلامی زندگی کی تاریخ میں اک نئے دور کا آغاز ہوگا

ادارۂ معارف اسلامیہ کا ذکر "الندوہ" میں ہو چکا ہے۔ کئی برس ہوئے اسلامی علوم وفنون کی تحقیق وتفتیش اور نشر واشاعت کی غرض سے اس ادارہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اسوقت سے کئی اجتماع ہو چکے ہیں پچھلا جلسہ عربک کالج دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اب دو برس بعد لکھنؤ میں پھر اجتماع ہو رہا ہے ۱۷، ۱۸، ۱۹ مارچ جلسہ کی تاریخیں قرار پائی ہیں مجلس استقبالیہ کی جانب سے ملک کے تمام ذی علم اصحاب کو دعوت دیجا رہی ہے کہ وہ اس اجتماع میں شریک ہوں اور اپنے محققانہ مقالات سے اہل مجلس کو مستفید فرمائیں۔
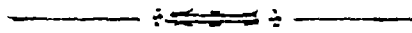
اسی زمانہ میں انجمن طلبائے قدیم کا سالانہ جلسہ بھی ہو رہا ہے مجلس منتظمہ نے پندرہ سولہ مارچ تاریخیں مقرر کی ہیں۔ جلسہ کے انتظامات تیزی سے ہو رہے ہیں۔ اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر یہ جلسہ بہت اہم ہوگا۔ مرکزی انجمن کے ساتھ صوبجات متحدہ کی شاخ کا جلسہ بھی اسی زمانہ میں ہوگا ہمیں امید ہے کہ ندوی احباب اور دارالعلوم کے قدیم طالب علم پوری تعداد میں شریک ہو کر اپنی انجمن کے جلسوں کو کامیاب کریں گے۔

اسی سلسلہ میں ۱۸ مارچ کو النادی العربی کا کل ہند مباحثہ بھی ہو رہا ہے ناظم انجمن کی طرف سے تمام عربی اور اسلامی اداروں کو دعوت دی جا رہی ہے ہمیں امید ہے کہ عربی زبان کے قدرداں اپنی عملی اعانت سے انجمن کے کارکنوں کی ہمت افزائی فرمائیں گے۔

میری محسن کتابیں

از جناب خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر تعلیمات ریاست کشمیر

(۲)

برنارڈشا نے انگریزی سماج، مغربی تہذیب اور اسکی سرمایہ دارانہ ذہنیت کے ناپاک مظاہر کو تلاش کیا اور ایک ایک کو اپنی بے پناہ صاف گوئی اور ظرافت کے ساتھ بے نقاب کیا اور انگریزوں کی مخصوص خود پسندی اور جمود کو زبردست ٹھیس لگائی۔ ابتدا میں قدامت پسندوں نے اسکو ایک عجیب اور بے ضرر مجنون سمجھا، پھر اس کے بڑھتے ہوئے اثر سے ناراض ہو کر اسکو باغی اور مخرب اخلاق ٹھیرایا۔ اور جب اسکی بہت سی "بغاوتیں" نئی نسل کے نظامِ خیال کا جزو بن کر معزز بن گئیں تو انھوں نے اپنی خاص قومی ادا کے بموجب اسکو قصرِ ادب میں جگہ دیدی اور اسکی تصانیف کو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے درس میں شامل کرکے انھیں ایک حد تک بے ضرر بنادیا! اسکی تصانیف نے مجھے اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ سماجی نظام کو بے چون وچرا تسلیم کرلینا اور اسکی خامیوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈالنا نہ صرف عقل کے ساتھ بے انصافی ہو بلکہ اخلاق کا بھی خون کرنا ہو۔ برنارڈشا کے ڈراموں میں سے چند نے خاص طور پر مجھے دعوتِ فکر دی ہے اور زندگی کے بعض تاریک لیکن اہم پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے مثلاً Parents and Children (والدین اور بچے) جسمیں مصنف نے تعلیم و تربیت کے مسائل اور بچوں اور ان کے والدین کی نفسیات سے اپنے خاص انداز میں بحث کی ہو۔ "قوموں کی زندگی کے لئے آزادی دمِ عیسیٰ کا مرتبہ رکھتی ہو اور والدین، استاد، حکام سب اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ کس طرح آزادی کو ملیا میٹ کردیں تاکہ اس وقت بچوں کی زندگی خاموشی اور سکون کے ساتھ گذرے خواہ آئندہ چلکر وہ بالکل ہی تباہ ہو جائے!" یا The Adventure of the Black

search for god in girl (سیاہ فام لڑکی کی تلاش حق) جسمیں اس نے مذہب کے ارتقائی تصور سے بحث کی ہے۔ یا (Back to mathoselah) (رجوع بہ میتھوسلا) جسمیں انسانی تاریخ کا ارتقا دکھایا ہے۔ اسنے سوئے ہوئے دماغوں کو جھنجھوڑنے کا کام بہت کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔

برٹرنڈ رسل کو قدرت نے ایک غیر معمولی دماغ دیا ہو کبھی وہ روشنی کا ایک فوارہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ جس طرف مڑجاتا ہو انفرادی اور سماجی زندگی کے تاریک گوشوں کو روشن کر دیتا ہو۔ کبھی وہ ایک تیز دھار والی تلوار ہو جو ان تنگ نظر تعصبات کو کاٹتی ہوئی چلی جاتی ہو جن کے سائے میں عام طور پر لوگوں کی بزدل عقلیں پناہ لیتی ہیں۔ وہ بھی برنارڈ شا کی طرح بت شکن ہو نسل، قومیت، کلیسا، رنگ، وطن غرض وہ تمام مسکرات جو دولت اور قوت کے پجاریوں نے عوام کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے بنائے ہیں اسکی تنقید کی زد میں آتے ہیں۔ اس نے مختلف علوم اور مضامین پر قابل قدر کتابیں لکھی ہیں اور ہر میدان میں عقل اور آزادی کی حمایت کی ہو اپنی تعلیمی تصنیف (Education and the Social order) (تعلیم اور نظام معاشرت) میں اسنے اس بات کو واضح کرکے دکھایا ہو کہ تعلیم کے نظام اور نصب العین پر موجودہ سرمایہ داری، قومیت اور مذہب کی بندشوں کا کیا اثر پڑا ہو اور وہ کس طرح ان بندھنوں میں گرفتار ہوکر بجائے انسانی دماغ اور ضمیر کو آزاد کرنیکے ان کو اسیر اور محدود کرنے کا آلہ بن گئی ہو۔ اس کتاب میں اسنے یہ بھی بتایا ہو کہ تعلیم کو کس طرح ان زنجیروں سے آزاد کرکے ایک بہتر اور زیادہ انصاف پرور سماج کو قائم کرنے کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہو لیکن ان ذرائع کی بحث سے زیادہ اہم اس کا یہ بنیادی اصول ہو کہ تعلیمی مسائل کو زندگی اور سماجی ماحول اور اثرات سے بے تعلق سمجھنا اور معلموں کا سیاست اور اقتصادیات کی تلخ اور ناگوار حقائق سے بیخبر یا بے پروا ہونا ایک شدید جرم ہو تعلیم خلا میں نہیں دی جاتی بلکہ ان تمام طاقتوں اور سماجی مسائل کے ماحول میں دی جاتی ہو جو سوسائٹی کے نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔ لہذا اس کے ہر مسئلہ کو زندگی کی کسوٹی پر کس کر دیکھنا چاہئے۔ ورنہ مدرسہ ادب، دانش اور

ذوق کی شراب سے بیگانہ ہوگا اور اسکی حقیقت" کارگہ شیشہ گراں" سے بڑھکر نہ ہوگی۔ رسل نے اپنی ایک اور کتاب (Conquest of happiness) (تسخیر مسرت) میں اس نکتہ کو حل کیا ہے کہ افراد کی زندگی میں سچی اور پائدار خوشی کن حالات میں راہ پاسکتی ہے۔ اس نے دو قسم کی خوشی میں امتیاز کیا ہے ایک وہ خوشی جسے وہ (Possessive happiness) کہتا ہو۔ یہ وہ خوشی ہے جو عام طور پر گھٹیا دل ودماغ کے لوگوں کو مال ودولت، اسباب وسامان، قوت، حکومت غرض مختلف قسم کی چیزوں کو جمع کرنے اور ان پر تصرف پانے سے حاصل ہوتی ہو، زندگی کی جانب وہ اس نیت سے بڑھتے ہیں کہ اسکی فراوانیوں بالخصوص مادی فراوانیوں میں سے وہ اپنی ذات کے لئے زیادہ سے زیادہ کس قدر بٹور سکتے ہیں دوسری خوشی کو وہ (Creative happiness) یعنی تخلیقی مسرت کا نام دیتا ہے۔ یہ وہ خوشی ہو جو انسان کو ایسے مفید اور جدت آفریں کام کرنے سے حاصل ہوتی ہو جنمیں اسے اظہار خودی کا موقع ملے۔ جو شخص اس مسرت کی بے پایاں لذت سے بہرہ مند ہوتا ہے اسے یہ فکر نہیں ہوتی کہ وہ دنیا کی پونجی میں سے اپنی ذات کے لئے کتنا کچھ لے سکتا ہے بلکہ وہ یہ سوچتا ہے کہ دنیا کو اپنی ذات کی اتھاہ دولت اور ممکنات سے کیا کچھ دے سکتا ہے۔ یہ وہ مسرت ہو جو مصور کو اپنی تصویر کشی میں شاعر کو اپنی شاعری میں، ڈاکٹر کو مرض کے خلاف کامیابی کے ساتھ جنگ کرنے میں، سماج کی سیوا کرنے والے کو ایثار کی آزمائشوں میں، سائنس داں کو نئے حقائق کا انکشاف کرنے میں، سیاح کو نئی دنیا دریافت کرنے میں حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ اپنی زندگی کی کشتی محض (Possessive happiness) کے سمندر میں کھیتے ہیں وہ لازمی طور پر رقابت اور خودغرضی اور بیجا تصرف کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں کیونکہ ان کی خوشی محض بیرونی اشیاء کی غلام ہوتی ہو اور جب ان چیزوں کے لئے چھین جھپٹ کی جاتی ہے (جو موجودہ اقتصادی نظام کی نامبارک بنیاد ہو) تو اس کا نتیجہ ہر لحاظ سے خراب ہوتا ہو۔ جیتنے والوں کے ضمیر پر چوروں کی طرح خوف کا تسلط رہتا ہو اور ہارنیوالے اپنے نزدیک زندگی کا بہترین انعام کھو بیٹھتے ہیں۔ اسلئے ان کے واسطے

زندگی بے معنی ہو کر رہجاتی ہو۔ برخلاف اس کے تخلیقی مسرت خودی کی لہر کو سمندر کی وسعت سے ہمکنار کردیتی ہو وہ انسان کو اسکی ذات کے تنگ اور محدود بندھنوں سے آزاد کر کے یہ احساس دلاتی ہو کہ دنیا میں بہت سے بڑے بڑے مقاصد ایسے ہیں جن کے لئے جدوجہد کرنا شخصی دکھ سکھ اور خوف ورجا سے کہیں بڑھ کر ہے۔ مثلاً ادب، آرٹ، مذہب، سائنس، سماجی خدمت، انمیں اپنی خودی کو گم کرنا، دراصل خودی کو پالینا ہو۔ کیونکہ ان اہم قدروں میں جذب ہو کر خودی شکست وریخت اور زوال اور موت کی دسترس سے بھی آزاد ہوجاتی ہو۔ یا سادہ الفاظ میں یہ سمجھ لیجئے کہ آدمی مرجاتا ہو لیکن اس کا کام زندہ رہتا ہو۔ اس نے جو شمع روشن کی ہے، خواہ وہ خدمت خلق کی ہو یا ادب کی، یا آرٹ کی، یا سائنس کی، وہ جلتی رہتی ہو اور روشنی پہونچاتی رہتی ہو، اسے اجل کی پھونک بھی نہیں بجھا سکتی۔ اسطرح اسکی خودی بھی ہمیشہ زندہ اور پائندہ رہتی ہو۔ خیال بہت پرانا ہو لیکن رسل نے اسکو بڑی وضاحت اور قوت کے ساتھ بیان کیا ہو اور یہ نقطۂ نظر زندگی کے سفر کے لئے یقیناً ایک بے بہا شمع ہدایت ہے۔

ایچ۔ جی۔ ویلز کا علمی مرتبہ ان دونوں کے برابر نہیں۔ اسمیں نہ اتنی قوت فکر ہو نہ اجتہاد، وہ پروپیگنڈا زیادہ کرتا ہو۔ اسکی رائے اکثر بیجا حد تک اس کے خاص مرکزی خیال کی تابع ہوتی ہو۔ مگر باوجود اس کے اس نے علمی مفکرین اور تعلیم یافتہ عوام کے درمیان ایک نہایت ضروری اور قابل قدر واسطے کا کام دیا ہو اور اپنے ناولوں اور دیگر علمی تصانیف کے ذریعے جدید معاشرتی علوم اور سائنس کے نظریوں کو مقبول کرایا ہو۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خدمت یہ ہو کہ اس نے ہر ہر طریقہ پر قومیت کے تنگ تصور کے خلاف جہاد کیا ہے اور انسانیت کے وسیع اور مقدس رشتہ کی وکالت کی ہے۔ وہ اس اصول کا پرچار کرتا ہو کہ عقل اور سائنس کو سماجی اور سیاسی مسائل میں بھی اسی طرح راہبر بنانا چاہئے جس طرح ان سے نظری علوم میں کام لیا جاتا ہے۔ اسوقت سیاسی اور اقتصادی تعلقات اور مسائل پر جذبات کا غلبہ ہو۔ ان کے حل کرنے میں عقل کی کارفرمائی کو بہت کم دخل ہو۔ ویلز کا عقیدہ یہ ہو کہ اگر سائنس کو محض چند اصولوں، نظریوں

اور علمی ایجادوں کا مجموعہ نہ سمجھا جائے بلکہ اس کو ایک طریقۂ فکر، ایک تفتیش و اجتہاد کا ذریعہ قرار دیا جائے تو ہمارے بہت سے سماجی اور سیاسی جھگڑے جو اسوقت انسانیت کے لئے سوہانِ روح بنے ہوئے ہیں معقولیت کیساتھ طے ہو سکتے ہیں۔ ویلز نے اپنے ناولوں اور کہانیوں میں سائنس کے کمالات اور آیندہ امکانات کو دکھایا ہے، انسانی سیرت اور انسانی سماج کی ارتقا سے بحث کی ہے، ان خارجی نفسیاتی گتھیوں کو پیش کیا ہو جو اس کی آزادانہ نشوونما میں حائج ہوتی ہیں لیکن اس کا مرکزی موضوع یہی رہا ہو کہ ایک بہتر معاشرے اور اس کے لئے شایان شان افراد کی تربیت کیسے کی جا سکتی ہو۔ وہ دل اور دماغ کو وہ گرمی اور روشنی تو نہیں بخشتا جو بصیرت اور گداز پیدا کرتی ہیں لیکن نظر کے سامنے نئی نئی لامحدود فضائیں اور امکانات ضرور پیش کر دیتا ہے۔

اناطول فرانس جو بعض اعتبار سے گذشتہ صدی کا سب سے بلند پایہ فرانسیسی مصنف ہو ان مصنفوں سے مختلف ہو۔ اسمیں آرٹ زیادہ اور پروپگنڈا کم ہو اس کے مطالعے اور تفسیر کا خاص موضوع سوسائٹی اور اس کی تشکیل نہیں بلکہ نفس انسانی کی گہرائیاں اور پیچ ہیں جن کو وہ اپنے مخصوص طنز اور ظرافت کے ساتھ کھول کر رکھدیتا ہو لیکن اس کا یہ طنز احساس اور ہمدردی سے خالی نہیں بلکہ ایک نقاب ہو جسمیں وہ اپنی ہمدردی اور رحم کے جذبے کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہو۔ کبھی اس کا موضوع تاریخی کردار اور تاریخی واقعات ہوتے ہیں، جیسے gods are thirst (دیوتا پیاسے ہیں) میں جہاں وہ انقلاب فرانس کی تصویر کھینچتا ہو، کبھی وہ انسانی جذبات اور آئیڈیل کی کشمکش دکھاتا ہو جیسے Red Lily یا Thais (تائیس) میں۔ جہاں اس کو یہ دکھانا مقصود ہو کہ

زاہد غرور کرد و سلامت نبرد راہ — رندانہ رہ نیاز بہ دار السلام رفت

کبھی وہ ایک ایسی سیدھی سادھی شریف انسانی سیرت کے خد و خال نمایاں کر کے دکھاتا ہے

جس کی طرف خود بخود دل کھنچتا ہو جیسے Crime of Sylvestre Bonnard) میں.
لیکن اس کا کام وکیل عدالت کی طرح انسانی کمزوریوں کی نمائش سے لطف اُٹھانا نہیں ہو۔ وہ ایک جج
کی طرح ان کے خلاف سزا کا حکم بھی نہیں سناتا۔ وہ تو محض بڑی گہری ہمدردی، بڑی گہری سمجھداری کے ساتھ
یہ دیکھتا اور سمجھاتا ہو کہ اکثر اوقات انسان مختلف داخلی اور خارجی قوتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن جاتا ہو اور
دراصل اپنے اعمال کے لئے جواب دہ نہیں ہوتا۔ اس لئے جرم اور مجرم میں تمیز کرنا انسان کا نہایت ضروری
فرض ہو۔ ایک نیک اور با اخلاق اور با اصول آدمی جرم سے نفرت کرسکتا ہو، لیکن اس کو مجرم سے نفرت
کرنے کا کوئی حق نہیں ہو کیونکہ بہت ممکن ہو کہ اگر حالات ذرا سے مختلف ہوتے تو وہ خود اسی طرح ارتکاب جرم
کرتا۔ لہٰذا شیشے کے گھروں میں رہنے والوں کے لئے یہ زیبا نہیں ہو کہ وہ دوسروں پر پتھر پھینکیں!
اناتول فرانس کے فلسفۂ زندگی نے مجھے یہ انمول سبق سکھایا کہ بقول فرانسیسیوں کے۔ Tout com-
prendre est tout pardonner۔ (جو آدمی سب کچھ سمجھ سکتا ہو وہ سب کچھ معاف
بھی کرسکتا ہو) شاید اسی وجہ سے میرے لئے ممکن نہیں کہ میں کسی شخص سے جو کسی گناہ یا جرم کا مرتکب ہوا ہو
اسقدر شدت اور ذاتی کد کے ساتھ اظہار نفرت یا مخالفت کرسکوں جیسے بعض مدعیان مذہب و عصمت
کیا کرتے ہیں۔ جن کی رائے شاید سطح سے نیچے اُتر کر نفس انسانی کی گہرائیوں تک نہیں پہونچتی۔

فرانس کا ایک اور مایۂ ناز مصنف جو آزادی اور انسانیت کی جنگ میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہو
اور جس کی تصانیف نے مجھے بہت متأثر کیا ہو، رومان رولاں ہو۔ اس کا قلم ایک تلوار ہو جس نے
ہمیشہ ان حقوق کی خاطر جنگ کی ہو جو ہر انسان کو بحیثیت انسان کے، ہر قوم کو بحیثیت ایک قوم کے حاصل
ہونے چاہئیں، لیکن دوسروں کے ظلم اور تصرت نے انھیں اپنے ان پیدائشی حقوق سے محروم کردیا ہے
رومان رولاں ایک بلندپایہ آرٹسٹ بھی ہو جس کی تحریر میں موسیقی کا رقص اور توازن ہو اور ایک پرجوش
مبلغ بھی، جس کے الفاظ میں طوفان کی شوکت اور انسانیت کے دھڑکتے ہوئے دل کا ولولہ ہے۔

اپنے معرکۃ الآرا ناول (Jean Christophe) (جین کرسٹوف) میں وہ ایک نوجوان کی سیرت کا ارتقاء دکھاتا ہے جو قدرت کی طرف سے موسیقی کی غیر معمولی صلاحیت لیکر آیا ہو، لیکن باوجود آرٹ کا پُجاری ہونے کے اپنے ماحول کے مقناطیسی اثرات سے متاثر ہوکر وہ خود کو اس سیاسی کشمکش میں جھونک دیتا ہو جو اس کے گرد وپیش جاری ہو۔ اس ناول میں رولاں نے یورپ کی اس تہذیب اور تمدن کا جیتا جاگتا نقشہ کھینچا ہو جو گذشتہ جنگ عظیم سے پیشتر اہل یورپ بلکہ تمام دنیا کو مسحور کئے ہوئے تھی لیکن بعض صاحبانِ بصیرت کو اس ظاہری شان وشوکت کے اندر تباہی اور فساد کے جراثیم بھی کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ انھیں میں رولاں کا شمار ہو۔ اسے یقین تھا کہ مغرب کی اندھی مادیت، سرمایہ داری، قوت کا نشہ، قومیت کا غرور، سامان جنگ کے بارے میں قوموں کی رقابت اور رنگ اور نسل کا تعصب اسے تباہ کرکے رہے گا۔ اور ایسا ہی ہوتا نظر آرہا ہے۔ اپنے ایک اور ناول (The Soul enchanted) (روح مسحور) میں اس نے جنگ کے بعد کے یورپ کا نقشہ کھینچا ہو اور ان قوتوں کا ابھار دکھایا ہو جن کا مقصد سماجی انصاف کا قیام ہو لیکن قوت اور سرمایہ کے ٹھیکہ داروں نے اپنے اغراض اور مفاد کی حفاظت کے لئے ہر ذلیل اور ظالمانہ طریقے سے ان شریفانہ جذبات کو اور آزادی کی تمام تحریکوں کو کچلنے کی کوشش کی۔ رولاں کے قلم سے اس کشمکش کا بیان پڑھ کر خون کھولنے لگتا ہو۔ اگر ایک "ترقی پسند" ادیب کا کام یہی ہو کہ وہ لوگوں میں صحیح جذبات کو بیدار کرے اور انھیں حق کی حمایت اور ظلم کی مخالفت پر آمادہ کرے تو رولاں بدرجۂ اتم ایک ترقی پسند ادیب ہو۔ اس نے اپنی سیاسی تحریروں اور تقریروں اور ہر قسم کی تصانیف میں اسی مقصد کو پیش نظر رکھا ہو کیونکہ وہ "ادب برائے ادب" کا قائل نہیں ہو۔ وہ تو ادب کو زندگی کی بھٹی میں جھونک کر اسے کندن بنانا چاہتا ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے مضامین کا ایک مجموعہ جو چند سال ہوئے شائع ہوا تھا (I will not rest) (میں آرام نہ لوں گا) کے نام سے موسوم ہو۔ کوئی حساس اور انسان دوست ادیب بھی اس جدوجہد کے زمانے میں آرام نہیں لے سکتا

ادب کی پرسکون سرزمین میں کبھی آرام نہیں لے سکتا!

امریکہ کے مصنفوں میں سے میری نظر میں اپٹن سنکلر (Upton Sinclair) کی خاص قدر ہو۔ اس نے گذشتہ چالیس پچاس سال میں بہت سے ناول، کہانیاں اور سیاسی اور سماجی مضامین لکھے ہیں جنمیں سے ہر ایک میں اس نے امریکہ کی تہذیب اور معاشرت کے تاریک پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے اور غیر معمولی جرأت سے کام لیکر سرمایہ داری اور ظلم کے ان زبردست قلعوں پر ضرب لگائی ہو جو مہذب اور متمدن امریکہ کی زندگی پر ایک خون آشام دیو کی طرح مسلط ہیں۔ اسکی کتابوں کے متعلق کہا گیا ہو کہ انمیں سے ہر ایک میں اسکے خلاف بیسیوں مقدمے چلانے کے لئے مواد موجود ہو، لیکن چونکہ ان کی بنیاد صداقت پر رکھی گئی ہے اس لئے کبھی کسی کو عدالت میں چارہ جوئی کرنے کی ہمت نہیں ہوئی! البتہ اسکی مخالفت میں اور اسکو مالی اعتبار سے تباہ کرنے کے لئے وہ تمام حربے ضرور استعمال کئے گئے جو آزاد امریکہ کی سیاسی زندگی کا مخصوص امتیاز ہیں! لیکن اس نے بدنامی، افلاس، حق تلفی، غرض ہر قسم کی مصیبتوں کو برداشت کیا لیکن حق گوئی اور حق دوستی کے کٹھن راستے کو نہیں چھوڑا۔ اس نے امریکہ کی تہذیب کی تنقید اسوقت شروع کی تھی جب وہاں کے تقریبًا تمام ممتاز ادیب اور مفکر جدید مادی اور صنعتی ترقی کے نشے میں سرشار تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ علوم و فنون کی ترقی اور سرمایہ داری نظام کی دولت آفرینی نے انسانی زندگی کے تمام اخلاقی اور سماجی مسائل بھی حل کر دیے ہیں اور انھیں اس بات کا احساس ہی نہ تھا کہ غازۂ تہذیب کے نیچے انسان کی فطرت کی سیاہی اور حرص اور تصرف کی قوتیں بدستور موجود ہیں۔ اس عالمگیر خوش فہمی کو چیلنج کرنا اور خود فریبی کے اس طلسم کو حقیقت نگاری کی ضرب سے توڑنا بڑے دل گردے کا کام تھا، لیکن سنکلر نے اس خدمت کو اپنے ذمہ لیا اور اس شان کے ساتھ انجام دیا کہ اس کا نام ادب کی تاریخ میں ہمیشہ احترام کے ساتھ لیا جائیگا اس نے اپنی مختلف کتابوں میں امریکن زندگی کے مختلف بدنما پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہو، مثلاً "جنگل" میں امریکہ کے صنعتی اور سرمایہ دارانہ نظام کی اس رقابت اور کشمکش کو دکھایا ہے جس کی بے رحمی اور بے حوصلگی

سامنے جنگلوں میں حیوانوں کی زندگی غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ (Oil) (تیل) میں ان زیادتیوں اور مردم آزاریوں کو طشت از بام کیا گیا ہو جو تہذیب حاضرہ کے محرک اعظم یعنی پٹرول کے بڑے بڑے کارخانہ داروں نے مزدوروں کے ساتھ روا رکھی ہیں۔ "فلور کنگ" میں اس نے موٹر کاروں کی صنعت کے تاجدار ہنری فورڈ کی سیرت کے ارتقا کا عبرت خیز نقشہ کھینچا ہو جس سے معلوم ہوتا ہو کہ کس طرح ایک شریف اور نیک نیت آدمی دولت اور سرمایہ داری کی دلدل میں پھنس کر اپنی فطری انسانیت کھو بیٹھتا ہے اور بجائے دولت کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے کے اکی بیشمار ظاہر اور پنہاں زنجیروں میں اسیر ہو جاتا ہو ایک اور کتاب میں جس کا نام ہے (Money writes) (روپیہ لکھتا ہو) اس نے یہ راز فاش کیا ہو کہ اخباروں کی رائے اور بیشتر کتابوں کی اشاعت بھی دولت کی غلام ہو اور اس جمہوری حکومت میں آزادی رائے کا دعویٰ محض دھوکہ یا خام خیالی ہے۔ چند بڑے سرمایہ داروں نے بیشتر اخباروں اور اشاعت خانوں پر قبضہ کر لیا ہو اور ان کے ذریعہ سے یہ رائے عامہ کو جس سانچے میں چاہتے ہیں ڈھال لیتے ہیں اور پروپیگنڈا کے ذریعے ہر قسم کے پبلک اداروں کو اپنے قبضے کے اندر رکھتے ہیں۔ اس خوفناک حربے کی مدد سے وہ نہایت آسانی اور کامیابی کے ساتھ ہر ایسے جدید اور انقلاب آفریں خیال کا سر کچل دیتے ہیں جن سے ان کے مفاد کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو چنانچہ خود سنکلر کے خلاف یہ زبردست قوت نہایت بیباکی اور بدباطنی کے ساتھ برابر استعمال کی گئی خیالات کو اپنے مجوزہ سانچوں کے اندر رکھنے کے لئے یہ لوگ محض پریس کی قوت ہی استعمال نہیں کرتے بلکہ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب، طریقۂ تعلیم، نظم و نسق اور استادوں کے تقرر پر بھی اپنا قابو رکھتے ہیں۔ تعلیم کے اس پہلو کی تفسیر اس نے (The goose step) میں کی ہے جس کا ترجمہ "قدم ملا کر چلنا" کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہی "ہم قدمی" ہے جس کا انتہائی مظاہرہ موجودہ جرمن قوم کی ذہنیت میں نظر آتا ہے جہاں قوت فکر و تنقید پر "اندھیریاں" لگا دی گئی ہیں، یعنی ایک فرض شناس شہری کا یہ

کام نہیں کہ وہ دائیں بائیں دیکھے یا حکومت کی پالیسی پر تنقید و احتساب کرے۔ اس کا کام محض یہ ہے کہ جس طرف اسکی نکیل موڑ دی جائے اسی طرف قدم بڑھائے جائے۔ لیکن یہ "ہم قدمی" صرف نازی جرمنی کیلئے مخصوص نہیں بلکہ اس کا منظاہرہ کم و بیش ان تمام ملکوں میں بھی موجود ہے جہاں بظاہر جمہوریت کا نظام قائم ہے سنکلیر نے یہ راز فاش کیا ہے کہ جمہوری امریکہ میں بھی فکر کی اسیری کے لئے ایک پیچیدہ اور گراں نظام تعلیم قائم کیا گیا ہے۔ ایک تازہ تصنیف (World's End) (دنیا کا انجام) میں اسنے گذشتہ جنگ عظیم کے پوست کندہ حالات بیان کئے ہیں اور دکھایا ہے کہ کس طرح درپردہ بین الاقوامی سیاست کی مہاران چند بڑے کارخانے والوں کے ہاتھ میں تھی جو سامان جنگ بناتے تھے اور منافع کمانے کی ناپاک کوشش میں دیانت اور حب وطن کا خون کرنے میں مطلق تأمل نہ کرتے تھے۔ علاوہ اس قسم کے بامقصد ناولوں کے اس نے اور بھی بہت سی کتابیں لکھی جنمیں سے ہر ایک میں اس کی شریف آزاد، انصاف پسند اور قابل محبت شخصیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ہر ایک میں اس کے ذہنی آئیڈیل اور ماحول کی تلخ حقیقتوں کا تقابل نظر آتا ہے۔ اس نے ایک کہانی کی شکل میں حضرت عیسیٰؑ کی ایک سوانحعمری لکھی ہے جس کا نام ہے (They call me carpenter) (انھوں نے میرا نام بخار رکھا ہے) اسمیں اس عبرت انگیز حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے کہ اگر کہیں (خدانخواستہ) حضرت عیسیٰؑ کا ظہور اس زمانے میں ہو جائے اور وہ امریکہ کی تہذیب و تمدن کا جائزہ لیں جس کی بنیاد بظاہر مسیحیت پر رکھی گئی ہے تو امراء اور ارباب سیاست اور کلیساؤں کے پیشواؤں میں ہلچل بپا ہو جائے اور حکومت مذہبی لیڈروں کی رضامندی سے ان کی انقلابی تعلیم کو خطرناک اور مفاد عامہ کے مخالف قرار دیکر یا تو انھیں قیدخانے میں بند کر دے یا مجنون قرار دیکر ان کی آزادی سلب کر لے یا ان کے ساتھ وہی سلوک روا رکھے جو دو ہزار سال قبل رومیوں نے کیا تھا!

دنیا میں ہر قسم کی ترقی انھیں لوگوں کے طفیل ہوئی ہے جنھوں نے اپنے زمانے کے ناقص نظام کو

بے چون وچرا تسلیم نہیں کیا اور اس کے رنگ میں رنگ کر اس کی کمزوریوں اور خرابیوں سے فائدہ اٹھاکر اپنے لئے آرام اور عیش وعشرت کی زندگی اختیار نہیں کی۔ بلکہ اپنی روشن ضمیری کی بدولت ایک بہتر دنیا کا تصور قائم کیا، یا اپنے وجدانی تخیل کی روشنی میں ایک بہتر دنیا کی تصویر دیکھی اور پھر جرأت کے ساتھ مخالفت کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلتے ہوئے بے حس اور تنگ نظر لوگوں کے سامنے اپنے تصور کی دنیا کی تصویر کھینچی۔ اور ان کو موجودہ حالات سے بیزار کر کے ایک بہتر مستقبل کی طرف مائل کیا۔ یہی کام ہے جسے غیر معمولی قابلیت اور جرأت کے ساتھ سنکلر نے تمام عمر انجام دیا ہے۔ شاید اس کا اپنا فلسفۂ زندگی ان الفاظ سے واضح ہو جائے جو اس نے اپنی ایک غیر معروف کتاب (Jimmie Higgins) (جمی ہگنز) میں لکھے ہیں۔ اس کا ہیرو ایک غریب اور کم رو اور معمولی درجے کا سوشلسٹ تھا لیکن اس کے دل میں دیانت اور وفاشعاری اور دوستداری کا ایک ایسا شعلہ روشن تھا کہ باوجود ہر قسم کی ایذا رسانی اور ناقابل برداشت جسمانی کرب جھیلنے کے اس نے اپنی جان دینا گوارا کیا۔ لیکن اپنے ساتھیوں اور سیاسی رفیقوں کا بھید نہیں دیا! جس وقت اس کی بہادر روح اس کے دکھی اور کمزور جسم سے رخصت ہو رہی تھی اس کے کانوں میں یہ آواز آتی ہے۔

"میں انسان ہوں اور آخری فتح میری ہوگی۔ میں جسم کی کمزوری کو کچل ڈالتا ہوں اور اس پر قابو پالیتا ہوں۔ اگر میرے جسم کو قید کر لیا جائے تو مجھے اس کی پروا نہیں۔ اگر مجھ پر خوف طاری ہوگا یا مصلحت اندیشی زنجیر پا ہوگی تو اس کو ٹھکرا دوں گا۔ میں صداقت ہوں اور دنیا کو میری آواز سننی ہوگی میں انصاف ہوں اور دنیا پر میری حکومت قائم ہو کر رہے گی۔ میں آزادی ہوں اور تمام قوانین کو توڑ ڈالتا ہوں میں ظلم کو خاطر میں نہیں لاتا، میری ہمت بلند ہے، میں رہائی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔"

اور چونکہ ہر ملک اور ہر زمانے میں انسان کی روح میں اس مبارک قوت کا جلوہ رہا ہے اور یہ غیبی آواز اپنا پیغام سناتی رہی ہے اس لئے انسانیت تاریکی اور درندگی سے نکل کر کم از کم اس مقام تک

پہونچ گئی ہو جہاں اس کو ایک زیادہ بہتر اور شاد کام مستقبل کا خواب نظر آتا ہے اور اگر دنیا اُس خوف اور بربریت کے تسلط سے نکل سکتی ہو جیسیں آجکل ظالموں کے لالچ اور ظلم نے اسے پھنسا دیا ہو تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہو اور وہ یہ کہ جن خیالات کا پرچار انھوں نے اور ان جیسے دوسرے بلند خیال اور انسان دوست مصنفوں نے کیا ہو وہ دنیا میں عام ہو جائیں اور لوگ اپنی بنائی ہوئی قید خانے کی کوٹھریوں سے نکل کر خدا کی کھلی ہوا اور روشنی میں سانس لینا سیکھیں۔ ادب کا کام اور کتابوں کا احسان یہی ہے کہ وہ لوگوں کی انسانیت اور ہمدردی اور محبت کو وسیع کریں اور ان کے دل و دماغ کو تنگ نظری تعصب اور بے انصافی کی یورش سے بچائیں۔ اگر کتابیں ایسا کریں تو وہ "محسن" ہیں ورنہ محض وقت گزارنے اور تفریح کا ذریعہ ہیں یا چارپائے پر معلومات کا بوجھ ہیں یا عالم کی بے فیض دولت ہیں اور انہیں سے کوئی چیز بھی بہت قدر کے قابل نہیں!

چند شبہات

از مولوی عبد الکریم صاحب قدوائی

الندوہ ماہ نومبر کے صفحہ پر مولوی عبد العزیز میمن صدر شعبۂ ادبیات مسلم یونیورسٹی کا مضمون "میری محسن کتابیں" کے عنوان پر نظر سے گذرا۔ اس مضمون میں چند امور دریافت طلب ہیں منجملہ اُن کے اسوقت دو سوال ایسے کئے جاتے ہیں جنکا تعلق ابتدائی حصہ سو ہے اور مولوی صاحب سو اُمید کیجاتی ہو کہ ان سوالات کو اپنے جوابات کا ممنون کرم کریں گے۔

(۱) جو عبارت کافیہ سے نقل کی گئی ہو وہ کافیہ کے اُن نسخوں میں نہیں ہو جو اسوقت میرے پیش نظر ہیں براہ کرم مطلع فرمائیے کہ یہ عبارت آپنے کس نسخہ سے نقل کی ہو۔ عبارت منقولہ۔ لایضاف موصوف الی صفتہ ولاصفۃ الی موصوفہا وجامع الغربی ونحوہ شاذ۔

موجودہ نسخوں کی عبارت۔ "ولایضاف موصوف الی صفتہ ولاصفۃ الی موصوفہا ومثل مسجد الجامع وجانب الغربی وصلوٰۃ الاولیٰ وبقلۃ الحمقاء متاول"

عبارت منقولہ اور موجودہ نسخوں کی عبارت کے معنی اور مقصد میں جو فرق ہو وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔

(۲) موصوف صفت کی اضافت میں اہل کوفہ اور اہل بصرہ کا اختلاف ہو۔ فریق اول کے نزدیک جائز اور ثانی کے نزدیک ناجائز ہو جیساکہ رضی شرح کافیہ وغیرہ میں ہو اسوقت یہاں اس مسئلہ پر بحث مقصود نہیں ہے اور نہ یہ بتلانا مقصود ہو کہ دلیل اور روایت کس کی مؤید ہو۔ صرف یہ کہنا ہو کہ مولوی صاحب نے جن کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہو یعنی الفیہ اور اسکی شروح اور مفصل یہ تمام کتابیں بھی تو اس مسئلہ میں کافیہ کے ہمنوا ہیں ملاحظہ ہو

الفیہ ابن مالک میں ہے۔ "ولایضاف اسم لما بہ اتحد۔ معنی واول موہما اذا ورد"

اُسکی شرح ابن عقیل میں ہو۔ "المضاف تخصص بالمضاف الیہ او یتعرف بہ فلا بد من کونہ غیرہ اذ لا تخصص الشئی او یتعرف بنفسہ ولایضاف اسم لما بہ اتحد فی المعنی کالمترادفین وکالموصوف وصفتہ فلایقال قمح بر ولا رجل

قالم وا اورد موہما لذالک مؤول کقولہم سعید کرز واما ظاہرہ اضافۃ الموصوف الی صفۃ فمؤول علی حذف المضاف الیہ الموصوف بتلک الصفۃ کقولہم حبۃ الحمقاء وصلاۃ الاولیٰ۔

اوضح المسالک الی الیفۃ ابن مالک میں ہو۔ مسئلہ۔ لایضاف اسم لمرادفہ کلیث واسد ولا موصوف الی صفۃ کرجل فاضل ولا صفۃ الی موصوفہا کفاضل رجل فان سمع ایوہم شیأ من ذالک یوول فمن الاول قولہم جاء نی سعید کرز۔ ومن الثانی قولہم حبۃ الحمقاء وصلاۃ الاولی ومسجد الجامع۔

مفصل زمخشری میں ہو۔ ولا یجوز اضافۃ الموصوف الی صفۃ ولا الصفۃ الی موصوفہا وقالوا دار الآخرۃ وصلاۃ الاولیٰ ومسجد الجامع وجانب الغربی وبقلۃ الحمقاء علیٰ تاویل دار الحیوٰۃ الآخرۃ ومسجد الوقت الجامع وجانب المکان الغربی وبقلۃ الحبۃ الحمقاء۔

اطلاع

چونکہ متعدد حضرات نے وی۔ پی نہ بھیجنے کی تاکید اور رقم چندہ ذریعہ منی آرڈر بھیجدینے کا وعدہ فرمایا ہے اس لئے ماہ فروری کا پرچہ ذریعہ وی۔ پی نہیں بھیجا جارہا ہے جملہ حضرات سے التماس ہے کہ وہ ۱۵ مارچ ۱۹۴۲ء تک اپنا واجب الادا چندہ۔ مرحمت فرمائیں۔ تاکہ وی۔ پی کے مزید اخراجات نہ برداشت کرنا پڑیں۔

"منیجر"

فقر کی شان استغناء

اخبار الاخیار پڑھ رہا تھا بزرگوں کی شان استغنار کے واقعات پڑھ کر دل پر خاص اثر ہوا جی چاہا کہ قارئین الندوہ کو بھی اس اثر میں شریک کروں اس خیال سے چند واقعات سپرد قلم ہو رہے ہیں۔ "سلام"

سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں ایک بزرگ مولانا کمال الدین زاہد تھے ورع و تقوی اور دیانت و امانت میں درجہ کمال حاصل تھا علم و فضل میں یہ مرتبہ تھا کہ حضرت نظام الدین اولیا کو ان سے تلمذ کی نسبت تھی مشارق انہیں سنائی اور اجازت حاصل کی تھی سلطان غیاث الدین بلبن مولانا کا بہت معتقد تھا اسے آرزو تھی کہ آپ کی امامت میں نماز ادا کیا کرے ایک دن مولانا سے عرض کیا کہ مجھے آپ کے علم و دیانت پر پورا بھروسہ ہے اگر آپ امامت قبول فرمائیں تو بڑی عنایت ہو اور مجھے اپنی نمازوں کی قبولیت کا وثوق ہو جائے لیکن مولانا کی شان استغناء اس ملازمت کو کب گوارا کر سکتی تھی فرمایا کہ ہمارے پاس نماز کے سوا اور کیا رہ گیا ہے کیا بادشاہ چاہتا ہے کہ اسے بھی ہم سے لے لے مولانا نے جواب کچھ اس آن بان سے دیا کہ سناٹا چھا گیا [1]

سلطان علاء الدین خلجی کے جلال و جبروت کا حال کسے نہیں معلوم ایک بار سلطان نے حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں اپنے بیٹے خضر خان کو بھیجا اور بعض امور سلطنت میں ان کی رائے چاہی خضر خان نے حاضر ہو کر تحریر شاہی دست مبارک میں دی لیکن شیخ نے اسے مطالعہ نہیں کیا اور فرمایا کہ فقیروں کو بادشاہوں کے معاملات سے کیا سروکار میں فقیر آدمی شہر کے کنارہ گوشہ گیر ہوں اور مسلمانوں اور بادشاہوں کی دعاگوئی میں مصروف ہوں اگر بادشاہ نے اس کے بعد مجھے کچھ اس قسم کی تکلیف دی تو میں یہاں سے بھی چلا جاؤں گا خدا کی زمین

---

[1] اخبار الاخیار ص۲۷

وسیع ہے۔ علاءالدین کو یہ خبر پہونچی تو بہت اعتقاد پیدا ہوا اور ملاقات کی خواہش کی لیکن شیخ نے پسند نہ کیا سلطان نے پھر اصرار کیا تو فرمایا کہ اس ضعیف کے گھر مین دو دروازے ہین اگر بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہوگا تو مین دوسرے سے باہر نکل جاؤن گا۔

انھین شیخ نظام الدین اولیا کا یہ ایک واقعہ اور سنئے۔ سلطان علاءالدین خلجی کے بعد اس کا بیٹا قطب الدین تخت نشین ہوا اس نے قلعہ سیپری مین جامع مسجد بنوائی اور پہلے جمعہ مین تمام علماء و مشائخ کو دعوت دی کہ یہین آکر نماز پڑھین اس دعوت پر اور سب لوگ جمع ہوے لیکن حضرت نظام الدین شاہی مسجد نہین گئے بلکہ کہلا بھیجا کہ ہمارے قریب مسجد ہے ہم وہین نماز پڑھین گے۔

ایک اور واقعہ سنئے۔ سلطان قطب الدین نے اپنے زمانہ مین یہ رسم ایجاد کی کہ چاندرات کو تمام ایمہ و مشائخ اور اکابر و اعیان بادشاہ کی خدمت مین حاضر ہون اور ماہ نو کی مبارکباد پیش کرین سب مرضی شاہ کے مطابق حاضر ہوے لیکن شیخ نہین گئے سلطان کو سخت ناگوار ہوا غصہ مین کہا کہ اگر آیندہ ماہ نہ آئے تو زبردستی لائے جائین گے لیکن دوسری چاندرات ابھی آنے بھی نہ پائی تھی کہ خسرو خان نے سلطان قطب الدین کو قتل کر دیا (۲۸۲)

ایک اور بزرگ کا قصہ سنئے شیخ عبدالقادر ثانی کو بادشاہ وقت نے بلا بھیجا لیکن شیخ کی شان استغناء ملاحظہ ہو جواب لکھ بھیجا

بہ ہیچ باب ازین باب روئے گشتن نیست	ہر آنچہ بر سر ما میرود مبارک باد
کسیکہ خلعت سلطان عشق پوشیدہ است	بہ حلہاے بہشتی کجا شود دلشاد

افلاطون کا نظریہ تعلیم

محمد اقبال وارث صاحب انصاری ندوی متعلم تکمیل

(۲)

تعلیم نسوان افلاطون نے اپنی ریاست میں عورتوں کی تعلیم و تربیت پر بھی بحث کی ہے وہ عورتوں کی تعلیم و تربیت محض مردوں کی ضروریات کے مطابق ضروری نہیں قرار دیتا بلکہ انھیں مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دینا چاہتا ہے مردوں کی پوزیشن زیادہ سے زیادہ گلہ کے نگہبان کی سمجھتا ہے افلاطون کے یہ خیالات اس زمانہ کے یونانی رسم و رواج کا ردعمل ہیں یہی وجہ ہے کہ اس بحث میں اس کا قدم جادۂ اعتدال سے ہٹ گیا ہے

نصاب تعلیم درجۂ ابتدائی جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہو اس درجہ میں ورزش و ترنم کی تعلیم دیجائیگی تعلیم کی ابتدا ترنم سے ہوگی جسمیں علم ادب بھی شامل ہے، افلاطون علم ادب کی دو قسمیں قرار دیتا ہو، جھوٹا ادب اور سچا ادب، ان دونوں قسموں کی تعلیم ضروری ہوگی، مگر ابتدا جھوٹے ادب سے کی جائے گی یعنی قصہ کہانیوں اور افسانوں سے۔ مگر بچوں کو ہر کس و ناکس کے تصنیف کردہ قصوں کے سننے کی اجازت نہ ہوگی۔ بلکہ صرف ان قصوں کے سننے کی اجازت ہوگی، جن سے دماغ میں ایسے خیالات ہی پیدا نہ ہوں جو مستقبل کے خیالات کے مخالف ہوں۔ اسی غرض سے وہ دائیوں کو تاکید کرتا ہو کہ وہ بچوں کو یہ کہکر نہ ڈرائیں کہ رات کے وقت دیوتا مختلف شکلوں میں گھومتے پھرتے ہیں، کیونکہ اس قسم کی باتوں سے ایک تو بچوں کے دل میں خوف بیٹھ جاتا ہو اور ان کے دل چھوٹے اور وہ خود بزدل ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسا آدمی "محافظ" کے معیار پر پورا نہیں اُتر سکتا، دوسرے اس سے ان کی تحقیر ہوتی ہے ان کے متعلق بچوں

---

[1] ریاست ص۲۰۶، ۲۴۳

کے دلوں میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو عقائد کے لئے سدراہ ثابت ہوتی ہیں اور بجائے اسکے کہ بچوں کے دلوں میں ان کے تقدس کا اعتقاد پیدا ہوتا، ان کے دل دہشت سے بھر جاتے ہیں، ان کے نام وذکر سے کانپنے لگتے ہیں بجائے محبت کے اُن سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور پھر ظاہر ہے کہ

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

اسی غرض سے افلاطون نے بچوں کے لئے کہانیاں تک مقرر کر دی تھیں جنہیں کوئی تغیر و تبدل نہ ہو سکتا تھا. وہ کہتا ہے کہ

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے شاگرد بزرگوں اور والدین کی عظمت اور عزت کریں اور آپس میں صلح و آشتی اور محبت و دوستی کی قدر کریں تو اس کے لئے لازم ہے کہ بچپن ہی سے انھیں ایک خاص قسم کے قصے کہانیاں سنائی جائیں اور ان کے علاوہ دوسری قسم کے قصوں کی بھنک بھی ان کے کان تک نہ پہونچے"[1]

اسی طرح وہ ان قصوں کو بھی ممنوع قرار دیتا ہے جن میں عالم زیریں کی محض برائی ہی بیان کی گئی ہو یا بھوتوں پریتوں کا تذکرہ ہو جن کے نام ہی سے بچے تو درکنار اچھے بھلے آدمی کے دل دہل جاتے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اسلئے کہ ایک تو یہ قصے سرتاپا جھوٹے ہوتے ہیں، دوسرے ان سے خوف بزدلی اور ناامیدی پیدا ہوتی ہے اور یہ باتیں ایک "محافظ" تو درکنار ایک "انسان" کے شایان شان نہیں ہیں؛

اسی لئے افلاطون محض قصہ نویسوں کی نگرانی کے لئے "محکمۂ نظارت" قائم کرتا ہے جو اچھے قصوں کی منظوری اور برے قصوں کے اخراج کے احکامات نافذ کیا کرے گا، دائیوں کو حکم ہوگا کہ وہ بچوں کو صرف "محکمۂ نظارت" کے منظور شدہ قصے سنائیں، ان قصوں کے علاوہ دوسرے قصے نہ صرف نصاب تعلیم سے خارج قرار دیے جائیں گے بلکہ ان کا کہنے والا اور سننے والا دونوں مجرم اور محکمۂ نظارت کے روبرو جوابدہ ہونگے.

---

[1] ریاست ص۱۲۹

اسی مقصد کے ماتحت افلاطون ہومر (Homer) ہیاڈ ( ) ایکلس (Achilles) اور دوسرے مشہور شاعروں اور افسانہ نگاروں کے تصنیف کردہ ان قصوں کو جو اسوقت رائج تھے نصاب میں جگہ نہیں دیتا، اسلئے کہ ان سے صحیح معنی میں روح کی اخلاقی تربیت نہیں ہو سکتی اور نہ وہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں جو افلاطون پیدا کرنا چاہتا ہو۔

اسی طرح وہ افسانوں اور تمثیلوں کے نفس مضمون اور طرز ادا پر بھی پابندی عائد کرتا ہے اور اور اس بارے میں ریاست کو اختیار کلی دیتا ہو کہ جس اسلوب کو نوجوانوں کے لئے مفید خیال کرے اس کے استعمال اور جس کو مضر خیال کرے اس کے امتناع کا حکم صادر کرے۔

اسی طرح وہ نقالی (روپ بھرنے) کی بھی مخالفت کرتا ہے کیونکہ "ایک آدمی صرف ایک ہی کام کر سکتا ہے اور اگر کوئی شخص بہت سے کام کرنا چاہے گا تو وہ کسی میں بھی شہرت و امتیاز حاصل نہیں کر سکتا۔"[1] افلاطون اپنے اس اُصول کو تسلیم کرانیکے بعد کہتا ہو کہ جس طرح ایک ہی شخص اچھا رجز خواں اور اچھا مسخرا دونوں نہیں ہو سکتا اسی طرح مختلف چیزوں کی نقل بھی نہیں کر سکتا اور چونکہ محافظین کا فرض منصبی یہ ہو کہ وہ ریاست کی فلاح وبہبود کو ہر دم پیش نظر رکھیں اسلئے انھیں ایسے شغل میں پڑنا ہی نہ چاہئے جو اُن کے پیش نظر مقصد میں مفید نہ ہو۔ اگر انھیں نقالی کرنی ہی ہو تو صرف ایسے لوگوں کی کرنی چاہئے جن کے اخلاق و اطوار انکے مقصد زندگی کے لئے شمع راہ ثابت ہوں۔ انھیں کبھی ایسے لوگوں کی نقل ہی نہ کرنی چاہئے جن میں کسی اخلاقی کمزوری کا پہلو نمایاں ہو اس لئے کہ اسمیں اندیشہ ہو کہ کہیں نقل اصل کی شکل اختیار نہ کرلے، اسی طرح وہ ستاروں لوہاروں اور دیگر اہل حرفہ کی نقل کرنے کے بھی مخالفت کرتا ہے، کیونکہ ان فنون کو نصاب تعلیم میں جگہ ہی نہیں دی گئی تھی۔ افلاطون نہ صرف نقالی کو ممنوع قرار دیتا ہو بلکہ کہتا ہے کہ " اگر کبھی ان حضرات میں سے جو ہر چیز کی نقالی کمال ہنرمندی کے ساتھ کرتے ہیں کوئی صاحب ہماری ریاست میں آجائیں گے اور اپنی شاعری اور

---

[1] ریاست ص۱۵۱

ہنرمندی کی نمائش کرنا چاہیں گے تو ہم بیشک اُن کی بڑی تعظیم کریں گے اور بحیثیت ایک دلکش مقدس اور حیرت انگیز ہستی کے ان کی پرستش تک کریں گے لیکن ساتھ ہی انھیں مطلع بھی کردیں گے کہ ہماری ریاست میں ان جیسے اشخاص کا وجود ممنوع ہے اور قانون ان کے قیام کی اجازت نہیں دے سکتا، ان کے جسم پر خوشبودار ابٹن مل کر اور ان کے سر پر اون کا ہار پہنا کر ہم ان بزرگ کو کسی دوسرے شہر کو چلتا کردیں گے، کیونکہ اپنی روح کی صحت کے لئے ہم زیادہ سخت اور ناتراشیدہ شعرا اور افسانہ گو چاہتے ہیں جو صرف نیک لوگوں کی نقل کریں[1]۔

قصّہ اور افسانہ کی تعیین ہوجانے کے بعد نغمہ کا نمبر آتا ہے، افلاطون گیت یا ترنم کے تین حصے قرار دیتا ہے۔ الفاظ، اسلوب اور اوزان، جہاں تک نفس مضمون شاعری کا تعلق ہے اس پر افلاطون وہی پابندی عائد کرتا ہے جو قصّوں اور افسانوں کے مضامین پر عائد کرچکا ہے وہ کبھی ایسے مضامین نظم کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا جس میں شکوہ و شکایت، نوحہ و ماتم، رنج و الم، نشہ و مخموری اور نرمی و سستی وغیرہ ایسے مضامین کا تذکرہ ہو جو محافظین کے لئے مفید نہیں بلکہ مضر ثابت ہوسکتے ہیں، ایسے شعرا کے کلام میں اگر کوئی ایسی چیز ملتی جس سے سننے والے کے دل میں کوئی ایسا تصور پیدا ہوتا ہو جو صحیح اخلاقی نشو و نما کے لئے مضر ہو تو وہ بلا تامل اسے خارج کردیتا یا بدل دیتا وہ کہتا ہے کہ

"بزرگوں کے متعلق ہم جب کبھی اس قسم کی باتیں سُنیں (مثلاً وہ جادوگر یا بہروپئے ہیں تغیر پذیر ہیں اور انسانوں کو دھوکہ دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ) تو ہمیں اپنے غصہ اور ناراضی کا اظہار کرنا چاہئے، یہ اہتمام کرنا چاہئے کہ ایسے اشعار کبھی عام شاہراہوں پر نہ پڑھے جائیں اساتذہ کو منع کرنا چاہئے کہ ایسے قصّوں کو بچوں کی تعلیم میں استعمال نہ کریں اور یہ سب اس لئے کہ ہمارا مقصد اصلی یہ ہے کہ ہمارے محافظ جہاں تک ممکن ہو بزرگوں کے سچے عقیدت مند اور ان کے مشابہ و مماثل ہوں[2]۔"

---

[1] ریاست ص۱۵۹ [2] ریاست ص۱۲۰

الفاظ کا مدار بھی نفس مضمون پر ہے جس کی تشریح اوپر کی جاچکی ہے البتہ وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ "ان الفاظ میں جو نغمہ میں استعمال کئے جائیں اور ان میں جو مستعمل نہ ہوں یقیناً کوئی فرق نہ ہونا چاہئے۔ دونوں ایک ہی قانون کے تابع ہوں گے"[1] اسلوب بیان کے متعلق وہ خود اپنی ناواقفیت کا اظہار کرتا اور کسی ایک اسلوب کو متعین نہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"میں تو ان اسالیب وغیرہ سے بالکل واقف نہیں لیکن ہاں میں ایک جنگی اسلوب ضرور چاہتا ہوں جو اس انداز و لہجہ کی ترجمانی کرسکے جو ایک بہادر انسان سے خطرے میں عزم کرتے وقت ظاہر ہوتا ہو یا اسوقت جب اس کا مقصد فوت ہورہا ہو اور ناکامی کے آثار نمایاں ہوں، اس کے جسم پر پے بہ پے کاری زخم لگ رہے ہوں، موت کا سامنا ہو یا کوئی اور سخت مصیبت درپیش ہو اور وہ اس طوفان حوادث کے ہر ایک موج کو پامردی اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنا چاہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی اسلوب مجھے درکار ہے جو آزادی اور امن کے وقت آدمی کے کام آسکے جب ضرورت یا احتیاج کا دباؤ نہ ہو اور وہ اپنے خدا کو دعا سے راضی کررہا ہو یا انسانوں کو ترغیب و ترہیب یا اس کے برعکس جب ترغیب و ترہیب کے باعث وہ کسی بات کے ماننے پر آمادگی ظاہر کرتا ہو یا ایسا اسلوب جو اس حالت کی ترجمانی کرسکے جب ایک شخص دانشمندی سے اپنا مقصد حاصل کرلیتا ہو اور اپنی کامیابی سے از خود رفتہ نہیں ہوجاتا بلکہ اسے برداشت کرکے اعتدال و دانشمندی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا"[2]

الفاظ و اسلوب کے بعد اوزان کا درجہ ہے مگر اس کے متعلق بھی افلاطون کا علم ویسا ہی ہے جیسا اسلوب کے متعلق، اسی لئے وہ کسی خاص وزن کو مقرر نہیں کرتا، البتہ جب وہ الفاظ و اسلوب متعین

---

[1] ریاست ص۱۶۰ [2] ریاست ص۱۶۲

کر دیتا ہو تو اوزان آپ ہی آپ متعین ہو جاتے ہیں اسلئے کہ " وہ تو الفاظ کے مطابق کئے جائیں گے نہ کہ الفاظ اُن کے"۔ نیز اچھے اوزان اچھے انداز بیان کے ساتھ کھپتے ہیں اور بُرے بُرے انداز کے ساتھ"۔

درحقیقت وہ عمدہ زبان، اچھے اسلوب، مناسب اوزان ان سب باتوں سے سادگی پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے اس کی مراد وہ سادہ لوحی نہیں جو بیوقوفی کا دوسرا نام ہے بلکہ ایسا ذہن ودماغ ہو جس کی ساخت میں نیکی وشرافت داخل ہو۔

الفاظ، اوزان، اور اسالیب متعین ہو جانے کے بعد آلات زیر بحث آتے ہیں اسالیب محدود ہو جانے کے بعد آلات بھی بہت سے بیکار ہو جاتے ہیں، اسی لئے وہ مزار، ہارپ (ایک تکونا باجہ) وغیرہ کو سرے سے ممنوع قرار دیتا ہے اور بڑی مشکل سے گاؤں کے چرواہوں کو بانسری بجانے کی اجازت دیتا ہے۔

موسیقی سے افلاطون کی کیا مراد ہو؟ اس کی تشریح گذشتہ صفحات میں کی جا چکی ہو، اسی بنا پر وہ صرف شعراء اور نثر نگاروں ہی کو اس کا پابند نہیں کرتا کہ وہ اپنی تصنیفات میں عمدہ اخلاق کی سیرت کشی کیا کریں اور اپنے کلام میں صرف نیکی اور خیر ہی کے جلوؤں کی جھلک دکھلایا کریں بلکہ وہ تمام ماہرین فن پر اس کی پابندی عائد کرتا ہے کہ وہ " بدطینتی و آوارگی اور فرومائگی اور بدامنی خواہ تصویر پر حیوانات کی، یا عمارات پر یا اپنی کسی دستکاری پر بالکلیہ روک دیں"۔

افلاطون بے اعتدالی، بے حیائی اور بدقماشی کے ان نمونوں کو محض اسلئے ممنوع قرار دیتا ہو کہ اس سے شہریوں کا مذاق نہ آلودہ ہونے پائے تاکہ "محافظین" کو "صحبت صالح" نصیب ہو اور ان کی نشوونما معائب اخلاقی کی فضا میں نہ ہو اسی لئے وہ کہتا ہے۔

" ہم ہرگز معائب اخلاقی کی فضا میں اپنے محافظین کی نشوونما کے روادار نہیں ہو سکتے کہ

ؔ ریاست ص۱۶۳ ؔ ریاست ص۱۶۶ ؔ جمہوریہ افلاطون ص۱۳۲

اسکی مثال تو ایسی ہوگی کہ ہم نے ان جانداروں کو ایسی زہریلی چراگاہ میں چھوڑ دیا ہے جہاں وہ روزانہ کچھ نہ کچھ مضر اور سمی بوٹیاں کھاتے رہیں اور رفتہ رفتہ اپنی روح کی آلودگی کے لئے گندگی کا کافی مؤثر ذخیرہ فراہم کرلیں، ہمارے ماہرین فن تو وہ لوگ ہونے چاہئیں جو حسن وجمال کی اصلی حقیقت کو دیکھ سکیں اور یہ صورت اسی وقت ممکن ہوگی کہ ہمارے نوجوان صحت وتندرستی کی زمین پر آباد ہوں۔ دیکھیں تو جمال کا نظارہ کریں اور سنیں تو کان تک حسن ہی کا ترانہ آئے[1]"

موسیقی کے بعد "ورزش" کا نمبر آتا ہو جو سادہ موسیقی کی جڑواں بہن ہو اسی لئے افلاطون موسیقی کی طرح ورزش کو بھی بچپن ہی سے شروع کراتا ہو مگر اس کے ساتھ ہی اُسے عمر بھر جاری رکھنے کا مشورہ دیتا ہے، اس کا خیال یہ بھی ہے کہ "اچھا بدن اپنی خوبی سے نفس کو عمدہ نہیں کرسکتا ہے بلکہ بخلاف اس کے عمدہ مہذب نفس اپنی خوبی سے بدن کو کامل بنا سکتا ہے[2]"

ورزش سے افلاطون کیا مراد لیتا ہو، اسکی تشریح کی جا چکی ہے، اس موقع پر اتنا یاد رکھنا چاہئے کہ افلاطون پہلوانوں کی طرح ورزش اور غذا کو صرف عضلاتی قوت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں قرار دیتا بلکہ وہ اس سے صرف طبیعت کے روحانی عنصر میں حرکت پیدا کرانا چاہتا ہے، اب ذیل میں وہ تین اہم اُصول پیش کئے جاتے ہیں جو اس نے ورزش کے طالب علم کے لئے مقرر کئے ہیں۔

(۱) نشی اشیاء سے اجتناب۔ ورنہ اندیشہ ہو کہ خود محافظ نشہ میں چور ہو جائیں اور خود ان کیلئے محافظ نگراں کی ضرورت پڑے۔

(۲) غذا کے متعلق جملہ تکلفات وبدعنوانیوں سے احتراز، مثلاً میٹھی چٹنیاں نفیس مٹھائیاں اور عمدہ قسم کے پُر تکلف کھانے نہ کھائے جائیں اسلئے کہ اس سے عادت وتندرستی پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

---

[1] ریاست ص۱۰۱ [2] جمہوریہ افلاطون ص۱۱۱

(۳) عورتوں کے اختلاط سے پرہیز، اسلئے کہ یہ اچھی جسمانی صحت قائم رکھنے والوں کیلئے مضر ثابت ہو
ورزش کے مذکورہ بالا اُصولوں کے متعلق افلاطون کا خیال ہو کہ اگر انمیں بے اعتدالی
بے راہروی اور بدمذاقی پیدا ہوگی تو نت نئے روگ بھی پیدا ہوں گے، جس طرح اگر ان میں اعتدال برتا جائے
تو ورزش صحت جسمانی کے لئے کیمیا ثابت ہوگی اور ان اصولوں پر عمل کرنے والے کو بیماری ہی نہ ہوگی اور
اگر ہوگی تو پھوڑے پھنسی اور زخم کی ہوگی یا پھر وہ فصلی بیماریوں کا شکار ہوگا، انھیں اُصولوں پر اعتماد کامل
کی وجہ سے افلاطون، زخم اور فصلی بیماری کے علاوہ ہر بیماری کا سبب تعلیمی حالت کی خامی اور صحیح تربیت کا
فقدان قرار دیتا ہے، ملک و قوم کے لئے اسے نہایت شرمناک خیال کرتا ہو کہ تعلیم یافتہ
ہونے کے دعویدار طبیبوں کے دست نگر ہیں، اس کے نزدیک ہر بیماری کا سبب کاہلی، سستی اور ناقص
طرز رہائش ہے، اسلئے کہ اسطرح جسم میں رطوبات و ریاح بھر جاتے ہیں، جو نفخ، نزلہ، اور زکام وغیرہ کی
شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ وہ طبی امداد، اُس کے چونچلوں اور طبیبوں کے ڈھکوسلوں کی سخت مخالفت کرتا ہو، وہ
"ہر کارے ہر مردے" کا پابند ہو اور کہتا ہے کہ ہر شخص کا ایک جدا کام ہو جو اسے انجام دینا چاہئے، اُسے
اتنی فرصت کب ہو کہ وہ بیمار رہکر طبیبوں کے ناز نخروں کی بجا آوری کا اہل ہو سکے وہ اپنے اس بیان
کی وضاحت ایک مثال سے کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

"میرا مطلب یہ ہو کہ جب ایک بڑھئی بیمار پڑ جاتا ہو تو وہ طبیب سے کوئی تیز اور زود اثر
دوا مانگتا ہے اس کا علاج تو بس یہی ہو کہ جُلاب لے لیا، یا فصد کھلوائی، بدن پر داغ
دلوا دیا یا عمل جراحی کرا لیا، اور کوئی صاحب اس کے لئے غذا کا ایک پورا نظام تجویز
کردیں اور ہدایت کردیں کہ اپنے سر کو یوں پٹا باندھا کرو یا اسی قسم کی اور باتیں بتائیں
تو وہ صاف کہدیتا ہو کہ مجھے بیمار پڑے رہنے کی مہلت نہیں اور ایسی زندگی سے کیا

حاصل جو اپنے معمولی کام پر صرف ہونے کے بجائے اپنے مرض کے پالنے میں گذرتی ہو
وہ ایسے طبیب کو خیرباد کہتا ہے اور اپنے معمول پر کاربند ہوتا ہوا دریا تو جھٹ پٹ اچھا
ہو کر کام کرنے لگتا ہو یا اگر اس کا جسم جواب دیچکا ہو تو مر کر اپنی تمام مصیبتوں کو ختم کر دیتا ہو"[1]

یہی سبب ہو کہ افلاطون ان لوگوں کو" زندہ رہنے کی اجازت ہی نہیں دیتا جن کی زندگیاں نہ خود
اُن کے لئے مفید ہوں اور نہ دوسروں کے لئے، ناکارہ اور بے سود زندگیوں کو طول دینا، کمزور والدین کو اسکا
موقع دینا ہو کہ وہ اپنے سے کمزور و ناکارہ اولاد پیدا کریں، سارے ملک کو رفتہ رفتہ اپاہجوں کی بستی بنا دیں
اور سارا نظام درہم و برہم کر دیں اسلئے" اگر ایک شخص معمولی زندہ نہیں رہ سکتا تو اس کا تندرست کرنالاحاصل ہو کہ
یہ شفا نہ اُس کے لئے مفید ہو سکتی ہے نہ ریاست کے لئے"[2]

ترنم اور ورزش کی اسقدر تعلیم حاصل ہو جانے کے بعد درجہ ابتدائی کا نصاب ختم ہو جائے گا اور
یہ نصاب ختم کرنے والے سند محافظت کے مستحق ہوں گے، اب آپ افلاطون ہی کی زبان سے وہ الفاظ سنئے
جو اسقدر تعلیم ہو جانے پر یا یوں سمجھئے کہ تقسیم اسناد (conversation) کے موقع پر
اُن سے کہے جائیں گے۔

"ان سے کہا جائے گا کہ ان کا زمانۂ شباب ایک خواب تھا، اور جو تعلیم و تربیت انھوں نے
ہم سے حاصل کی محض ایک ظاہری شکل و نمود تھی، در اصل اس زمانہ میں مادرِ ارض کے
رحم کے اندر اُن کی تشکیل اور ان کا تغذیہ ہو رہا تھا، وہیں یہ خود بھی بنائے گئے اور
اُن کے آلات و اسلحہ بھی، جب ان سب کی تکمیل ہو چکی، تو ان کی ماں زمین نے انھیں
اوپر بھیجا، چنانچہ ان کا ملک، ان کی ماں اور نیز اُن کی دائی ہو، اس کی فلاح چاہنا
اُن کا فرض اور اسے حملوں سے بچانا ان پر لازم ہو انھیں چاہئے کہ اس کے شہریوں کو

[1] ریاست ۴۰۸–۴۰۶۔ [2] ریاست ص ۴۰۷

اسی زمین کے نیچے اور اپنا بھائی جانیں[1] "

اے شہریو! تم آپس میں بھائی بھائی ہو، لیکن خدا نے تمھیں مختلف طریقہ پر بنایا ہے، تم میں سے بعض میں حکمرانی کی قوت ہو اور ان کے اجزائے ترکیبی میں خدا نے سونے کی آمیزش کی ہو اسی وجہ سے ان کی عزت بھی سب سے زیادہ ہو بعض دوسرے چاندی سے بنے ہیں اور یہ مددگار رہیں جنھیں کسان اور کاریگر بنا ہو ان کی ترکیب میں پیتل اور لوہا شامل کیا ہے اور یہ خصائص نوعی عموماً ان کی اولاد میں بھی قائم رہیں گے مگر چونکہ اصل سب کی ایک ہو اسلیے کبھی کبھی ایسا بھی ہوگا سونیوالے والدین کے "سیمیں" بچہ ہو یا سیمین والدین کے زرّیں اولاد ہو خدا تمام حکام کے سامنے بحیثیت اُصول اول اس کا اعلان کرتا ہے کہ اور تمام چیزوں کے مقابلے میں انھیں نجابت نسل کی سب سے زیادہ حفاظت کرنی چاہئے، ہمیشہ انھیں اس بات پر نظر رکھنی چاہئے کہ اولاد میں کن اجزا کی آمیزش ہوتی ہے کیونکہ اگر زرّیں یا سیمیں طبقہ کی اولاد میں پیتل یا لوہے کا میل ہو تو قانون قدرت تبدیل مراتب کا طالب ہوتا ہے، حاکم کو اس بات پر ذرا ترس نہ آنا چاہئے کہ اس کا بچہ تنزل کرکے کسان یا دستکار ہو رہا ہے، اسی طرح اگر دستکاروں کی اولاد میں سونے چاندی کی آمیزش ہو تو ان کا اعزاز بڑھتا ہو اور وہ محافظ شہر یا مددگاروں کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں کیونکہ کاہن کا قول ہے کہ جس ریاست کا محافظ پیتل یا لوہے والا آدمی ہو وہ تباہ ہو جائے گی[2] "

---

[1] ریاست صفحہ ۱۰۰ [2] ریاست صفحہ ۱۰۰ و ۱۰۱

نقد و نظر

نصرۃ الحدیث از جناب ابو المآثر مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی صفحات ۲۱۴، کاغذ عمدہ، کتابت واضح، طباعت بہتر، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے، ملنے کا پتہ کتبخانہ دینیہ مدرسہ مفتاح العلوم مئو اعظم گڈھ

اس کتاب کا مقصود حدیث کی تائید اور فتنۂ انکار حدیث کی تردید ہے، قرآن مجید کے نام سے دھوکا کھاکر بعض اوقات ناواقف لوگ اس فتنہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، حالانکہ خود قرآن کی "رو" سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اُمت کے لئے "اُسوۂ حسنہ" ہے اور اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت بھی فرض ہے، زیر نظر کتاب میں جناب مصنف نے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے جن کی بنا پر لوگ اس فتنہ میں مبتلا ہو جایا کرتے ہیں، اس سلسلہ میں عبداللہ چکڑالوی اور ان کے خلیفہ عنایت اللہ کے غلط خیالات کی بھی تردید کی گئی ہے، مگر اصلی مخاطب جناب "حق گو" ہیں۔ (ا۔ ش)

الترجمۃ العربیہ صفحات ۱۶۰ قیمت ایک روپیہ، مرتبہ مولانا مسعود عالم صاحب ندوی و مولانا محمد ناظم ندوی ملنے کا پتہ:۔ محمد ناظم ندوی، محلہ مکارم نگر لکھنؤ یا جمعیۃ التعاون دار العلوم ندوہ لکھنؤ

عربی مدارس اور اسکول کے وہ طلبہ جو عربی لکھنا چاہتے ہیں مگر ان کے پاس ایسی کوئی معقول کتاب نہیں جو انھیں تدریجی طور پر سکھائے "الترجمۃ العربیہ" انکی اس کمی کو پورا کرتی ہے آج سے تقریباً دس سال قبل یہ کتاب لکھی گئی تھی مگر دس سال تک تجربہ کے بعد طلبہ کی مشکلات کو پیش نظر رکھکر نئے ایڈیشن میں مزید اضافے کئے گئے ہیں نیا ایڈیشن گویا عربی میں ترجمہ کرنے پر پہلی کتاب ہے جو مدرسین و طلبہ کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔

الترجمۃ العربیہ میں ترجمہ کرنیکے مختصر قواعد اور ہدایات ہیں۔ نحو صرف کے مختصر اصول بھی لکھدیے گئے ہیں تاکہ وہ انگریزی داں حضرات جو عربی لکھنے اور بولنے کی تمنا رکھتے ہیں مگر ان کے پاس عربی زبان کے قواعد سیکھنے کے لئے کافی وقت نہیں ہو وہ بھی اس کتاب سے بیش از بیش فائدہ حاصل کرسکیں، اس کتاب میں تقریباً ڈیڑھ سو مشقیں ہیں۔

حالات ندوہ

جنوری کے آخر میں سال رواں کی پہلی سہ ماہی ختم ہوگئی، اس موقع پر تمام پچھلے کاموں پر نظر ڈالی گئی اور ماضی کے تجربوں کی روشنی میں مستقبل کے لئے نئے خاکے بنائے گئے۔ جنوری کے آخری ہفتہ میں امتحان سہ ماہی ہوا، نتائج اوائل فروری میں شائع ہوئے، کامیابی کا اوسط ابکی پچھلے سال کے مقابلہ میں بہتر رہا۔

اس اثنا میں الاصلاح کے حلقوں میں بڑی چہل پہل رہی، اس درمیان شعبۂ خطابت کی جانب سے ایک ایسا دلچسپ عنوان تجویز ہوا جس نے جلسوں میں بڑی رونق پیدا کر دی "ندوہ کا تخیل میرے تصور میں" ایسا کشش انگیز موضوع تھا جس نے سب کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی، طلبہ کے علاوہ اساتذہ اور طلبا قدیم کے حلقوں میں بھی اس عنوان سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے، اس سلسلہ میں بعض اہم اور پُر مغز تقریروں کی توقع ہے۔

اس مہینے متعدد اصحاب نے اپنی پذیرائی کا شرف بخشا جنمیں مولانا حسین احمد صاحب صدر المدرسین دار العلوم دیوبند، مولانا عبد الغفور صاحب سابق نائب مہتمم دار العلوم ندوۃ العلما، اور نواب محی الدین خاں صاحب (ناگپور) خاص طور سے قابل ذکر ہیں، جناب مولانا حسین احمد صاحب نے مدرسہ کے عام معائنہ کے علاوہ انجمن الاصلاح کے جلسہ میں ایک بڑی مؤثر اور ایمان آفریں تقریر فرمائی جسکا خلاصہ درج ذیل ہے آپ نے فرمایا کہ ۔ انسان جسم و روح کا مجموعہ ہے جسم کی طرح روح بھی بیمار ہوتی ہے، اس کا علاج صرف انبیا علیہم السلام کے یہاں ہے، اس کے بعد دنیا کے موجودہ حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اب یہ بات آشکارا ہو چکی ہے کہ انسان کے خود ساختہ نظام خواہ وہ کسی ازم کی شکل میں ہوں انسانیت کیلئے سخت مضرت رساں ہیں

آج دنیا ان کی ہولناکیوں سے لرزہ براندام اور زمین ان کی خونریزیوں سے لالہ زار ہے۔ انسان کی نجات اسی نظام الٰہی سے ممکن ہے۔ جو اسلام کے نام سے دنیا کو بخشا گیا ہے۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ اسلامی نظام نے گنتی کے چند برسوں میں دنیا کی کایا پلٹ دی، عرب کے بدو جن کے ہاتھوں میں کبھی اونٹ کی مہار رہا کرتی تھی اب سیاست وجہاں بانی کا علم لیکر آگے بڑھے اور دفعۃً سارے عالم پر چھا گئے، بنی اسرائیل نے بہیم معجزوں کے بعد بھی اذہب انت وربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون (جاؤ تم اور تمہارا رب لڑے ہم یہاں بیٹھے ہیں) کی آواز بلند کی تھی لیکن یہاں چشم وابرو کے اشارے پر سمندر میں کود پڑنے کا عزم تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ ماضی کے یہ ولولہ انگیز اور ہمت آفریں واقعات مسلمانوں کے لئے پیغام عمل ہیں، عصر حاضر کی ضرورتوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے طلباء دار العلوم کو ان کے فرائض وواجبات یاد دلائے اور فرمایا کہ "ہندوستان میں جتنی قومیں آئیں وہ یہاں کے اصلی باشندوں میں گم ہوگئیں، صرف مسلمان ہی ایسی قوم ہیں جنھوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی اور صرف قائم ہی نہیں رکھی بلکہ اپنی جدوجہد سے اسے اسقدر وسعت بخشی کہ چند لاکھ آج بڑھ کر نو کروڑ ہوگئے ہیں، آپ بھی اپنے امتیازات قائم رکھئے، دوسروں کی نقل نہ کیجئے بلکہ انھیں خود اپنے عمل سے متاثر کیجئے اور اپنے سینوں میں خدمت دین و مذہب کی وہی تڑپ پیدا کیجئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اتباع کرنیوالوں کے دلوں میں موجزن تھی یہ سونے کا وقت نہیں خود بیدار ہوجیئے اور دوسروں کو بیدار کیجئے۔

پہلی فروری کو طلباء قدیم کی مجلس منتظمہ کا جلسہ ہوا جسمیں مجلس ندوۃ العلماء میں نمایندگی کے لئے طلباء قدیم کی جانب سے مولانا اکرام اللہ خاں ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبد الرحمٰن کاشغری ندوی، مولانا محب اللہ ندوی اور مولانا ضیاء اللہ ندوی کا انتخاب عمل میں آیا۔

ہم ان اصحاب کو اس انتخاب پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ انجمن طلباء قدیم نے ان سے جو توقعات قائم کی ہیں یہ انھیں پورا کریں گے۔

Regd. No. A-596.

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

النّدوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابو الحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبد السلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

۱

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ

جلد ۳ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ مطابق مارچ ۱۹۴۲ء نمبر ۳

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر بنام منیجر الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونا چاہئے

شذرات

تقریباً تین برس ہوئے کہ یورپ میں جنگ کی آگ بھڑکی، دیکھتے دیکھتے اسمیں شدت پیدا ہوئی اور سارا یورپ آتشکدہ بن گیا، سال بھر کے اندر اندر اس کے شعلے افریقہ کے میدانوں تک پہونچے اور رفتہ رفتہ مغربی ایشیا، ان کی لپیٹ میں آگیا۔ پھر مشرق قصیٰ کی باری آئی اور اب تو نوبت یہاں تک پہونچی کہ ہندوستان میں بھی اسکی لپٹ محسوس ہونے لگی ہو نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ کیا ہوگا، مستقبل کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہو لیکن اس صورت حال کی نزاکت کا احساس ہر شخص کو مضطرب کر رہا ہے۔

اس نازک موقع پر جبکہ ہلاکت و بربادی اور تباہی و ویرانی کے بادل سر پر منڈلا رہے ہیں، ہوا انکی شدت آئندہ موسم کی تیزی کی خبر دے رہی ہو، اور طوفان کی موجیں گھر کے در و دیوار سے ٹکرا رہی ہیں۔ ملک کی بدقسمتی یہ ہو کہ یہاں ہنوز اتفاق و اتحاد کی فضا ناپید ہو، ہر طرف مخالفتوں اور عداوتوں کا بازار گرم ہو، ہر جماعت دوسروں کی نقصان رسانی کی فکروں میں غرق اور ہر فرقہ دوسرے کی تباہی کی تدبیروں میں مصروف ہو، اس صورت حال نے مستقبل کے مطلع کو ایسا تیرہ و تار کر دیا ہو کہ مشکل ہی کہیں اُمید کی کرنیں نظر آتی ہیں۔

ضرورت ہو کہ اسوقت ملک کے ہمدرد کسی ایک مرکز پر جمع ہوں، حالات کی نزاکت کو محسوس کریں اور جُزئی و فروعی اختلافات کو نظر انداز کرکے بنیادی مسائل کی طرف توجہ کریں صرف اپنے فرقہ اور اپنی جماعت کے مفاد ہی کو اصل مقصود نہ سمجھیں بلکہ ملک کی عام ضروریات کی اہمیت محسوس کریں اور آنیوالے حضرات کے پیش نظر ایک نئے اتحاد کی طرح ڈالیں تاکہ ملک کی حفاظت کے لئے متحدہ محاذ قائم ہو اور انسانیت کی خدمت کے لئے تمام فرقے اور قومیں متحد ہو کر آگے بڑھیں۔ یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہی جس سے غفلت وبلے تو جہی

سخت مضرت کا باعث ہوگی۔

ان حالات پر ملکی مفاد کے علاوہ علماء اسلام کو ایک اور پہلو سے بھی غور کرنا ہے، جنگ کی اس کشاکش میں مادی قوتوں کے درمیان جو مقابلہ ہو رہا ہے اس کے پس پشت ذہنی کشمکش بھی کام کر رہی ہے بلکہ سچ پوچھئے تو جنگ کی یہ ساری ہنگامہ آرائیاں فکر و خیال ہی کی کشاکش کا نتیجہ ہیں، جنگ کے بعد ملکوں کی نئی حدبندی کے ساتھ ذہنیتوں کی بھی نئی تعمیر ہوگی۔ پچھلی جنگ عظیم کی طرح اس مرتبہ بھی نئے نئے خیالات سامنے آئیں گے اور نئے نئے نظریے پیش ہوں گے جن پر آئندہ عقائد و اعمال کی بنیادیں قائم ہوں گی۔ علماء کو ابھی سے اس صورت حال پر غور کرنا چاہئے تاکہ افکار و خیالات کے آئندہ معرکوں میں اسلام کی حفاظت کے فرائض انجام دے سکیں۔

اس مقصد کے حصول کے لئے علماء کو اپنے حالات میں غیر معمولی انقلاب پیدا کرنا پڑے گا۔ سب سے پہلے عقائد و اعمال کے غیر اہم اختلافات کو نظر انداز کر کے وسیع بنیادوں پر اپنی جماعت کی از سر نو تنظیم کرنی پڑے گی پھر زمانہ کے حالات کو سمجھ کر ابناء عصر کو ان کی زبان میں اسلام کا پیغام پہونچانا پڑے گا۔ ان فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے فکر و خیال کے دائروں میں غیر معمولی وسعت مطالعہ کے انداز میں خاص تغیر اور تعبیر کے طریقوں میں کافی تبدیلی کی ضرورت ہے ساتھ ہی نظر میں بلندی، طبیعت میں استغناء، سیرت میں پختگی اور مزاج میں شگفتگی بھی ضروری ہے تاکہ تبلیغ حق کا فریضہ خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پاسکے اور اسلام کا نظام صالح ایک بار پھر دنیا کے لئے مرکز جذب و کشش بن جائے۔

یاد ایام

مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی ڈپٹی انسپکٹر مدارس عربیہ رجسٹرار امتحانات شرقیہ الہ آباد

یاد ایام مولانا کی مصروفیت کی بنا پر درمیان میں کچھ عرصہ کے لئے رک گیا تھا، قارئین کو بڑا انتظار تھا اس نمبر میں بعض باتیں تحقیق وتفصیل طلب ہیں غالباً آئندہ مولانا اسکے متعلق خود ہی لکھیں۔ مدیر

"آئے جو یاد یار وہ آتے چلے گئے"

اب ہمارے مطالعہ کا پرواز بدل گیا تھا۔ علامہ کی صحبت اور مولانا کی تعلیم نے دو باتیں مجھ میں پیدا کر دی تھیں۔ ایک تو اُپج اور دوسری نقد اور دقت نظر، سپاٹ مطالعہ اور کتابوں کے صفحات پر رواں نظری مجھپر گراں گزرتی تھی۔ مگر یہ ایک عجیب بات تھی کہ بڑی سی بڑی فن کی کتاب کو جلد سے جلد دیکھکر ختم کر دیتا تھا ایک مرتبہ اس زمانے کے ایک بڑے عالم نے مجھ سے کہا کہ حضرت استاذ الاساتذہ مولانا عبدالحیؒ کتاب کا جلد سے جلد مطالعہ کرکے ختم کر دیا کرتے، میں نے کہا کہ اسمیں استعجاب کی کیا بات ہے، فن کے مسائل تو ان کو سب مستحضر تھے ہی مطالعہ میں نظر وہیں رکتی ہوگی جہاں کوئی نئی یا زائد بات مصنف نے کہی ہوگی جب وہ ذہن نشین ہوگئی تو کتاب کے مطالعہ کا مقصد حاصل ہوگیا اسلئے ہر فن کی کتابوں کی ایک فہرست جسمیں ادب اور فلسفہ کا پلہ بھاری تھا ذہن میں رکھکر اس کی جستجو کرتا اور اس کا مطالعہ کرتا اس جستجو میں کھجوہ بھی جانا ہوتا تھا جہاں مولوی ناصر حسین صاحب قبلہ تشریف رکھتے تھے اور ایک بہترین کتبخانہ جمع کیا تھا۔ مولوی صاحب بہت شفقت فرماتے اور جس کتاب کو دیکھنا ہوتا مطالعہ کیلئے منگا دیتے، لیکن گھر کتاب لانے کا مجاز نہ تھا، جو کھجوے کے فاصلے کو دیکھتے ہوئے میرے لئے زحمت تھی آخر یہ مشکل میرے استاد مرزا صاحب مرحوم کی بدولت دور ہوگئی اور وقت پر ضروری کتاب مخصوص مخطوطات کو چھوڑ کر وہ منگا دیتے سب سے پہلے امام رازی کی مباحث مشرقیہ کی زیارت وہیں ہوئی تھی اب تو دائرۃ المعارف حیدرآباد نے اسکو دو جلدوں میں شائع کر دیا ہے، علی گڑھ کی مرز بوم سے نکلے علامہ شبلی اور المعتزلہ والاعتزال پر ذوق سے مضمون لکھنے والے پر

حکمائے اسلام کا اثر اتنا تھا کہ بیچارے امام رازی کی وقعت ان کے دل میں کم ہو گئی تھی اشعریت سے تبری شعار ہو گیا تھا مگر مجھ پر یہ اثر ہمیشہ رہا کہ حق اشاعرہ کے ساتھ ہے۔ ہمارے مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں "فخر رازی راز دار دیں بُدے" کا طعن کر کے ان کو حکما اور صوفیا دونوں کی نظر میں گرا دیا، حالانکہ حکمائے اسلام یونانی فلسفہ کے خاکے کو ابھارا گو ان کے بعض اجتہادات بھی اسمیں شامل ہیں مگر امام ہی ایک ایسے فلسفی ہیں (غزالی کی طرح صوفی نہیں) جنھوں نے نہایت زور کے الزامی جواب اور تردید کے علاوہ اپنا مذہب اور نظریات فلسفہ قائم کئے۔ جب میں نے مغربی فلسفہ کا مطالعہ کیا تو امام کی وقعت میرے دل میں اور بڑھ گئی چنانچہ امام کا یہ فلسفہ ان کی کتاب مباحث مشرقیہ میں زیادہ کھل کر بیان کیا گیا ہے منطق میں تصدیق کی تعریف اور امور عامہ میں وجود کے بدیہی نظری ہونے کے متعلق امام کا مذہب سب کو معلوم ہے مگر آج اس کو اگر تحلیل نفسیات کی نظر سے دیکھو تو امام حق بجانب نظر آتے ہیں۔ اور یہ کھجوے کے کتبخانہ کا ذکر آ گیا دل میں آتا ہے کہ اس وقت اس کا بھی کچھ حال لکھدوں کہ طلبا کو بصیرت ہو۔

مولوی ناصر حسین صاحب کے والد مولوی حامد حسین صاحب مرحوم ایک جید مجتہد تھے اور غفران مآب مولوی دلدار علی صاحب جنھوں نے شیعہ علم الکلام پر بہت کچھ کام کیا ہے اور شیعیت کی استقامت کی داغ بیل لکھنؤ میں ڈالی ہے وہ ان کے اپنے والد مولوی محمد قلی صاحب مرحوم کنتوری ثم لکھنوی کے سلسلۂ تلمذ میں شاگرد در شاگرد تھے حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ جن کا ننہال خود شیعوں میں تھا ایک ایسی زبردست کتاب حضرات اہل تشیع کی رد میں نکلی جس نے الصواعق المحرقہ کو ٹھنڈا کر دیا اور خود روغن قاز بن گئی۔ اس کتاب کے جوابات کی فکر کے لئے علمائے اہل تشیع میں ایک بےچینی کی رَو دوڑ گئی اور بہت سے جوابات معرض ظہور میں آئے ؎

دلم بہ پاکیِ دامانِ غنچہ می لرزد		کہ بلبلاں ہمہ مستاند و باغباں تنہا

مگر وہ باغبان خانوادۂ عبد الرحیمؒ کا ہوشیار فرزند اور اپنے فن کا ماہر تھا کسی نے لارڈ میکالے کے

متعلق لکھا ہو کہ سو میل چلکر اور ہزاروں کتابیں پڑھکر وہ ایک جملہ لکھتا اسلئے اُس کا ہر جملہ وسیع معلومات پر مبنی ہوتا ہو
یہی حال تحفہ کا ہو. مولوی محمد قلی صاحب نے اس کتاب کی صحیح قدر و منزلت کو سمجھکر اس کے جواب کا احرام باندھا
مولوی صاحب نے یہ کام خود بڑے اہتمام سے شروع کردیا اور چند باتوں کے جوابات نہایت عالمانہ مؤرخانہ اور
ادیبانہ تحریر کئے، مگر اس کام کا اتمام انکے صاحبزادے مولوی حامد حسین صاحب مرحوم کے لئے مقدر تھا ممکن ہو کہ مولوی صاحب
نے یہ کام اپنے والد معظم کی ہدایت کے مطابق "یا اگر مدینتوانند بسر تمام کند" کی فرض شناسی کی بنا پر شروع کیا ہو گو جواب باصواب کننا اچھا تھا لیکن
لیکن اگر ترک کلمۃ تخرج من افواہہم کی وعید میں داخل ہونیکا احتمال رکھتا ہو مگر جواب نہ لکھا رہتا اور اسکا ردکار اتنا بڑا ہو کہ تحفہ کا
حجم کتاب کی فہرست مضامین کی برابر ہو تو ہو. کتاب کیا ہو معلومات کا بحر زخار ہو، ادب حدیث رجال تاریخ کلام
کی ایک قاموس خود ہو اور یہی نہیں سیکڑوں قلمی کتابوں کے حوالے اگر جناب امیرؑ کے مناقب اسمیں ہیں تو قدح علیؑ
جاحظ کی لکھی ہوئی بھی اسمیں نظر آتی ہے. اس ایک کتاب کی تصنیف کے لئے مصنف نے عرب و عجم و ترکستان کے
کتبخانوں کے کھنگالنے میں صعوبتیں اُٹھائیں اور سزائیں بھگتیں. لکھنؤ کے ایک بڑے دریادل رئیس ناظم صاحب جنھوں
نے اسکے لئے اپنی دولت بہادی بڑے قابل ستائش ہیں. آخر میں مولوی حامد حسن صاحب کا یہ حال ہو گیا تھا کہ
سینہ پر رکھکر بھاری بھاری کتابیں دیکھتے دیکھتے سینہ پر قرحہ پڑ گیا تھا. اب دو شخص داہنے بائیں بیٹھ جاتے
کتاب کا شیرازہ توڑ دیا جاتا چند اوراق ایک شخص دیتا وہ پڑھتے اور دوسری طرف ایک شخص کتاب کی ترتیب درست
کرتا جاتا. انگلیاں اتنی کمزور پڑ گئی تھیں کہ نرم پنسل کے لیڈ نکالے جاتے اور ان سے وہ اقتباسی نشانات بناتے
دماغ اتنا ماؤف ہو گیا تھا کہ مکان کے نیچے ایک نانبائی کی دوکان تھی اس کے بل بٹے کی آواز برداشت نہوتی
تھی، اسلئے اسکو ایک معقول تنخواہ دی جاتی تھی کہ وہ سالن کہیں اور سے بیس لایا کرے یہ تھی شان علم، یہ تھا شغف اور یہ تھی
نیت کی قوت، جب جاکر ایسی کتاب تیار ہوئی. جناب ناصر الملۃ الولد سر لابیہ کی تصدیق فرما رہے ہیں اور اسی
کتاب کی ترتیب اور اشاعت میں ساری عمر صرف کردی. تین پشت کی کمائی یہ ایک تصنیف ہو. ناظم صاحب نے
اپنا ایک باغ اور بارہ دری واقع کھجوہ اسکے لئے وقف کردی جہاں مولوی محمد قلی صاحب نے کتبخانہ کی داغ بیل

ڈالی اور وہاں کا دار التصنیف بنا جس طرح سیرت النبیؐ کے بانی نے اعظم گڑھ میں خود یہ کام کیا۔ یہ کتبخانہ اس صوبے میں اپنی آپ مثال ہے اور رجال میں یہ رتبہ رکھتا ہو کہ طبقات ابن سعد کے کئی قلمی ٹکڑے یہاں محفوظ ہیں۔

علامہ بمبئی سے واپس ہوئے تو الندوہ کے کام کے متعلق مشورت ہوئی کہ بغیر کسی مددگار رکھے یہ کام اب دشوار ہو گیا ہے، کمیٹی انتظامی نے مددگار منظور کیا۔ مجھکو اور ہمارے دوست کو اب اتنی فرصت کہاں تھی گو مولوی عبد السلام صاحب مولانا خانہ ہوں اب الزنے لگے تھے کہ اس کام کو اٹھا لیتے اور خود علامہ کو پسند نہ تھا کہ ہم تعلیم کی راہ سے کھٹکیں اور ابھی سے زیادہ تصنیف تالیف میں مصروف ہو جائیں۔ جو بات علامہ نے فرمائی وہ میرے دل کی نکلی یعنی ہمارے دوست مولانا ابو الکلام محی الدین آزاد دہلوی ثم لکھنوی ثم لاہوری ثم کلکتوی والحال لاتعلیم اخذ بای ارض یموت (ابقاہ اللہ) کا تقرر اس جگہ پر ہو گیا۔ اس میرے یار کو روپیہ کی طلب اور طمع تو تھی نہیں گھر بیٹھتا تو کھانے کو بہت تھا اور باپ کی طرح خاندانی مسند ارشاد و تعلیم پر بیٹھ کر دست غیب سنبھالتا تو پیر مغاں تو بن ہی جاتا مگر اس کو مولانا کے پاس رکھا انھوں نے ایک وظیفہ اپنی تعلیمی ترقی کے لئے سمجھا اور علمی عیاشی اور یارباشی میں وقت کٹنے لگا۔

عہد پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں -

مولانا تو اب سن سفید ہو گئے ہیں مجھ میں ابھی خزاں کے کچھ پھول باقی ہیں۔ ملاقات عنقا، وہ آزاد ٹھہرے میں قید، اگرچہ زمینی کی قید سے وہ ابھی چھوٹے ہیں مگر میری انکی ملاقات وہاں بھی حرام تھی، میں تو اب انیس ہوں، بقول آتش ؎

پھولوں کا ڈھیر روز لگاتے ہیں گلفروش
رہتا ہے پھول والوں کا میلا قفس کے گرد

آزاد لکھنؤ کیا آئے میں نے آزادی اختیار کر لی، مزے میں وقت کٹتا کبھی علامہ کی صحبت اور کبھی شرر صاحب کی اور کبھی خود ہماری اوّل الذکر دو صحبتیں علمی ہوتیں مگر اس بنج کی صحبت میں دنیا ومافیہا کی باتوں پر خیال آرائیاں، خوش گپی اور چاء کا دور رہتا، آزاد کو کون مگر عنفوان شباب کے آزاد کا مزاحیہ پہلو ابتک دل میں گدگدی پیدا کرتا رہا۔ ذہن کیا تھا ایک ہمہ گیر ریسیور، زبان کیا تھی دنیا بھر کا ریڈیو، قلم ایک ہوا باز بداہت فکر چہ گنتی است کہ بیش مرداں آید کتاب پر نظر ایک مرتبہ ڈال لی اور وہ اپنی ہوگئی جس طرح چاہا جس مضمون کو ادا کر دیا۔ استعارے تشبیہیں اور اس کے ساتھ جدت طرازی کے پھول برساتا تھا کسی نے کہا ہے کہ کشمیر کے پھولوں کو روندتے ہوئے جی ملتا ہے مگر کس کا جس کو کبھی یہ منظر نصیب ہو نہ کہ اہل کشمیر کا یہ چیزیں آزاد کی تحریر یہ تقریر میں خود اس کے کشمیری پھول تھے۔ آپ کہیں گے تم آزاد کی تعریف کرنے میں مبالغہ میں پڑ گئے۔ میری معذرت قبول ہو، جوانی دیوانی کی یاد بڑھاپے میں رعنائی خیال کا سرچشمہ ہے میں اپنے لطف کی یاد میں مست ہوگیا، آپ اس کو مبالغہ سمجھیں تو یہ آپکی قدردانی ہے، اگر باور نہ ہو تو المرأة المسلمہ کا اقتباس پرانے الندوہ کے صفحات میں پڑھ لیجئے، آزاد نے اصل مضمون کو چار چاند لگا دیے ہیں، میں نے کھل کر ایک مرتبہ انکی تعریف کر دی اس کو انکی تیج نہ سمجھئے، اب کچھ نہ کہوں گا، ان کو قدردانوں کی کیا کمی ان کے مداحوں کی ہبات ہے مگر مجنوں نہ خواہر شد بھی سچ مان لیجئے۔

(باقی دارد)

اسلام کے لال قلعے

جناب حکیم سید ابو النظر صاحب امروہوی

عربی مدارس کی اصلاح و تنظیم سے متعلق ان صفحات میں ایک طویل مضمون شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً نوٹس بھی نکلتے رہتے ہیں حکیم سید ابو النظر صاحب عربی مدارس سے قریبی تعلق رکھتے ہیں انھیں اس بارے میں ذاتی واقفیت اور تجربہ ہے ذیل کا مضمون موصوف نے بڑے اخلاص سے لکھا ہے عربی مدارس سے محبت و تعلق نے الفاظ میں شدت ضرور پیدا کر دی ہے لیکن یہ دل کا درد ہے جس نے تلخ نوائی پر مجبور کر دیا ہے۔ (مدیر)

آپ نے دہلی میں لال قلعہ کی عمارت دیکھی ہو گی جس کی چہار دیواری سے تو شاہانِ مغلیہ کی عظمت ٹپک رہی ہے، لیکن جس کے اندر چند مخصوص عمارات کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہا۔ یہی حال آج ہمارے اسلامی قلعوں یا عربی مدارس کا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ حلقہ بگوشانِ اسلام کا دین و آئین بڑی حد تک عربیت سے وابستہ ہے، اور اس لئے اگر مسلمانوں کی سیاسی شکست خوردگی عربی تمدن، عربی زبان، عربی ذہنیت یعنی اسلام کے پائدار انقلاب سے ناآشنا رہنے کو گوارا کر لیتی تو آج ہندوستان اسلامی تحریکات اور اسلامی علوم کا مرکز ہونے سے محروم ہو جاتا۔ علماء کی اُمید پرستی، مذہبی خلوص اور علمی قوت ہی نے آج ہمیں مفتوح، مغلوب اور شکست خوردہ ہونے کے باوجود اس قابل بنایا کہ اسلام کے اجتماعی نظام کو ہندوستان کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کر سکیں۔ اگر علماء اپنی اسلامی فکر سے اسلامی ہند کو ایک مخصوص دائرۂ تخیل کی عظمت نہ سپرد کرتے تو کیا مغربی تعلیم یافتہ حضرات کی زبانوں پر اسلامی کلچر، اسلامی تخیل اور اسلامی مرکز کا ذکر آسکتا تھا۔ علماء ہی کی مسلسل جد و جہد نے ولی اللّٰہی اسکول اور ولی اللّٰہی فلسفہ کی بنیاد رکھی۔ جو ہندوستان میں تبلیغ اسلام کا بہترین طریقہ اور ارتقاء پذیر یافتہ ذہنیت کے لئے اسلام کی بہترین تعبیر تھی اور علماء ہی نے اندرونی و بیرونی ذرائع سے انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ اسلام کے بہترین مفکر مولانا عبید اللہ سندھی کا پروگرام سننے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں کوئی ایسا انقلاب آسکتا ہے جس کا نتیجہ باوجود جمہوری نظام کے اسلامی ذہنیت کا غلبہ ہو تو وہ علماء ہی کے

دل و دماغ کا معجزہ ہوگا۔

مگر اس خوشگوار ماضی اور خواب آور مستقبل کے باوجود ہماری آنکھوں کے سامنے جو کچھ موجود ہے وہ ہرگز قابل فخر نہیں، ہم سب کچھ تھے اور سب کچھ ہو سکتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ آج ہم کہاں کھڑے ہیں جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اُس کے لحاظ سے مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ عربی مدارس کا مدعا قرآن فہمی، نکات حدیث تک رسائی، قوانین فقہی کی تدوین، ہر ماحول کی زائیدہ ذہنیت اور ہر دماغی ارتقاء کے پیش نظر شرعی تعبیرات کا اختراع، اسلام کے بنیادی اصول اور اُس کے اجتماعی، اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی نظامات کی اہمیت کا احساس اور غیر اسلامی نظریات سے سائنٹفک جنگ یا عملی جہاد تھا۔ مگر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی عربی مدارس کے طلباء کی طرف منسوب کی جا سکتی ہے۔ قرآن جسے اسلام کا مکمل قانون کہا جاتا ہے اور جس کے رموز و اسرار کی کوئی حد مقرر نہیں، یہاں تک نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ ہر دوسرے علم کا درس دیا جاتا ہے حتیٰ کہ صرف و نحو جیسے ثانوی اور فلسفۂ قدیم جیسے تشنۂ تکمیل علوم کا ایک ذخیرۂ بے معنی درس نظامی کا ایک اہم جزو قرار دیا گیا ہے، لیکن اگر کوئی کتاب مسلمانوں کے غور و فکر سے محروم کر دی گئی ہے تو وہ قرآن کے سوا دوسری کتاب نہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ قرآن کے وہ حقائق و معانی جو آج تک تفاسیر نے پیش کئے تھے اُنمیں ہنوز اضافہ کیا جا سکتا ہے اور ہمیشہ اضافہ کا امکان رہے گا۔ حقائق و معانی تک پہونچنا شعوری ارتقاء پر موقوف ہے اور چونکہ شعوری ارتقاء کسی ایک انسان اور کسی ایک زمانہ میں مکمل نہیں ہو سکتا اسلئے ہمیشہ تو لئے فکریہ صرف کرتے رہنے کی ضرورت محسوس ہوتی رہے گی۔ انسانی دماغ انفرادی اور اجتماعی ماحول سے اثر پذیر ہو کر ہمیشہ ایک مخصوص لائن اختیار کر رہا ہے اور یہی وابستگی اُس کے ہر گونہ دماغی ارتقاء کو محدود کرتی رہی ہے بنا بریں یہ تصور کرنا ہی بنیادی غلطی ہوگی کہ سب کچھ تفاسیر میں جذب کر دیا گیا۔ اگر مجھے فرصت نصیب ہوئی تو بتاؤں گا کہ میرے پاس وہ کون سے علمی دلائل ہیں جن کے بھروسہ پر میں نے وہ نکتہ عرض کرنے کی جرأت کی جس سے علماء کا ایک طبقہ "آتش زیر پا" ہو سکتا ہے کہیں غلط فہمی نہ پیدا ہو اس بنا پر اتنا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے ذہن میں وہ

غلط اجتہادات نہیں ہیں جن کا دعویٰ علمی کم مائیگی کے باوجود آج "ہر رند سبو بر دوش" کر رہا ہو بلکہ میں اُن پہلوؤں سے بحث کر رہا ہوں جو قرآن و حدیث کے بنیادی تصورات سے کوئی اختلاف نہ رکھتے ہوں، زمانہ کا انقلاب دیکھئے وہی قرآن جو اسلام کے زرّیں دور میں کتابت حدیث سے کبھی ہم آغوش نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ الہامی کتابوں کو ہمیشہ انسانی اقوال کے تخلیطی عمل ہی نے غیر معتبر بنایا اور نہ صرف غیر معتبر بنایا بلکہ الہامی تعبیرات کو فہم انسانی سے بالاتر قرار دیکر تمام توجہات کو انسانی تفاسیر ہی کے لئے وقف کر دیا تھا آج یکسر اُسی لغزش کی تصویر بنا ہوا ہو۔ خدا نے قرآن کو محفوظ رکھنے کا وعدہ پورا کر دیا۔ مگر انسانی فطرت بھی کچھ نہیں بیٹھی رہی ہم نے بھی اُس کے ساتھ وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو پچھلی تاریخ میں ہماری محرومیوں، ناکامیوں اور خدا سے ناآشنا ہو جانے کا باعث ہو رہا ہے، کیا یہ بات تعجب انگیز نہیں کہ ہندوستان کے مرکزی دار العلوم دیوبند میں آج نصف صدی سے کہیں زیادہ مدت گذرنے کے بعد بھی دار القرآن کا تصور دھندلی شکل میں کچھ کچھ سامنے آ رہا ہے۔ دنیا کی دوسری قوموں کے سیاسی اور اقتصادی نظریات کے مقابلہ میں ہمیں امتیاز سپرد کرنیوالی چیز صرف ایک قرآن ہی تھا جو ادبی معجزہ ہی نہیں بلکہ علمی معجزہ بھی ہو۔ اور اُسی سے ہماری بے اعتنائی اس درجہ تک پہونچ گئی کہ قرآن کو علمی دنیا کے سامنے پیش کرنے کی جرأت رکھنے والے علما ہی نظر نہیں آتے نہ معلوم کتنے سیاسی اور اقتصادی نظریات جمہوریت، آمریت، اشتراکیت اور اشتمالیت کے نام سے ہر طلوع صبح پر پیش کئے جا رہے ہیں مگر ایک اسلام ہی کا وہ مکمل ترین نظریہ ہے جس کے تمام پہلوؤں سے کوئی واقف نہیں کیا کوئی عالم جانتا ہو کہ اسلام کا کوئی نظریۂ حکومت ہو یا نہیں، سطحی معلومات کے تحت کچھ کہہ دینا قابل فخر نہیں ہو سکتا۔ جمہوریت کا غلبہ ہوا تو اسلام کو جمہوریت کا اجارہ دار بنا دیا گیا، آمریت کا سیاہ بادل فضا پر چھانے لگا تو اسلام کے ہر تارِ رباب سے آمریت کا نغمہ نکلنے لگا اور اشتراکیت کا سیلاب خون و آتش سے کھیلتے ہوئے اگر دنیا کے کسی خطہ پر با اقتدار ہو گیا تو اسلام کو "سرمایہ پرستی" نہیں بلکہ "سرمایہ داری" کا پیدائشی دشمن بتایا جانے لگا، حالانکہ آج تک اس بنیادی نکتہ پر بھی غور نہیں کیا گیا تھا کہ اسلام سوسائٹی نظام اجتماعی

اور حیاتِ مجلسی کو بنیادی اہمیت سپرد کرتا ہے، یا نظامِ حکومت کو۔ بدبختی کی یہیں پر انتہا نہیں ہو جاتی بلکہ اگر حضرت مولانا عبید اللہ سندھی جیسا مفکرِ اسلام ان نازک حقائق پر کوئی روشنی ڈالے تو ہر مغربی تعلیم یافتہ اُسے سمجھ سکتا ہے اور نہیں سمجھ سکتا تو درس نظامی کا زائیدہ عالم، آج جبکہ ہمارے برادران وطن تک انقلابی ماحول کے زیر اثر اپنا "تمدنی نظام" ہندوستان کے سامنے پیش کر سکنے کے لئے شب و روز کوشش کر رہے ہیں. علماء کو اس کا بھی احساس نہیں کہ یہ کوئی اہم اور ضروری چیز ہے. میں جانتا ہوں کہ اسلامی تاریخ کے اوراق، اسلام کا فلسفۂ اخلاق، اسلام کا فوجداری قانون اور اسلام کا نظامِ مدنیت، ندوۃ المصنفین پیش کرتے جا رہے ہیں مگر اس سے درسِ نظامی کے فضلاء پر کیا اثر اور انھیں کیا فائدہ۔ وہ عربی مدارس جو ہندوستان کے وسیع برّاعظم میں مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں کیا انھوں نے کچھ کیا اور کیا وہ آج بھی ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے کسی اصلاح کے لئے تیار ہو سکتے ہیں. اگر کوئی اس غلطی میں مبتلا ہو تو اُسے اپنی خوش فہمی پر پشیمانی کا اظہار کرنا چاہیئے۔

کوہ ہمالیہ اپنی جگہ سے جنبش کر سکتا ہو، سمندر کی روانی اپنا رُخ تبدیل کر سکتی ہو، مگر عربی مدارس کا "بابا آدم" جو قدم پیچھے ہٹا چکا ہو وہ آگے نہیں بڑھا سکتا۔ قرآن ہی پر کیا موقوف ہو، کیا احادیث پر کوئی ریسرچ کی جا رہی ہو۔ کیا فلسفۂ قدیم و جدید کے اخلاقی نظریات اور اسلام کے اخلاقی نظریات کا عملی امتیاز ہمارے علماء کی آنکھوں کے سامنے ہو۔ ندوۃ المصنفین کے بعض نوجوان علماء نے "اسلام کا اقتصادی نظام" خواہ کسی قدر مختصر کیوں نہ ہو اور "غلامی" کے نظریہ پر پہلی تصنیف ضرور شائع کی ہو، مگر کیا اس سے بھی عربی مدارس کی چہار دیواری میں کوئی روزن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ کیا آج کے پیچیدہ اقتصادی مسائل کو حل کرنے کے لئے فقہاء کی کوئی جماعت نئے انداز سے مجلسی زندگی کو بہتر بنانے کی جدوجہد کر رہی ہو، کیا مغربی اقوام نہیں بلکہ ہندوستانی اقوام کے اُن شعوری اور تمدنی رُجحانات کا لحاظ کرتے ہوئے جو اُن کی فطرت کا جز ہو گئے ہیں ہمارے عربی مدارس کے تعلیم یافتہ تبلیغ کی جُرأت کر سکتے ہیں اور جمہوری نظام کے دلدادگان میں ہونیکے باوجود

اُنھیں بہترین جمہوری ذہنیت سے آشنا کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ اگر ان پہلوؤں میں سے کوئی بھی عربی مدارس سے پورا نہیں ہو رہا تو اسلام کے ان "لال قلعوں" کو سوائے محکمۂ آثار قدیمہ کے سپرد کر دینے کے اور کیا چارۂ کار باقی رہ گیا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ ایسے تغیرات کے لئے نہ سرمایہ ہے نہ ماہرین۔ مگر میرے نزدیک اس اعتراض کی اہمیت حیلہ سازی سے زیادہ کچھ نہیں۔ کیا علماء کی قدامت پرستی وہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہے جو موجودہ حالات میں ہو سکتا ہے۔ جہاں تک میرا عملی تجربہ ہے میرا جواب نفی میں ہوگا۔ میرے وطن امروہہ میں بھی ایک قدیم عربی درسگاہ ہے جسے میرے بزرگ محترم حضرت مولانا سید احمد حسن رضوی محدث امروہوی نے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے شاگرد اور حضرت شیخ الہند کے ہم سبق تھے، جاری کیا تھا۔ آج اُس کے پاس کافی عمارت ہے، اوقاف ہیں اور چندہ سے بھی تقریباً پانچ سو روپیہ ماہوار ملتا رہتا ہے۔ میں نے بحیثیت ممبر مجلس انتظامیہ کوشش کی کہ اساتذہ محنت سے پڑھائیں، امتحان باضابطہ لیا جائے۔ درس نظامی کی غیر ضروری کتابیں خارج کر دی جائیں اور اسی نوع کی دوسری چیزوں پر توجہ دلائی، مگر ان اصلاحات کو حسب ذیل وجوہ کی بنا پر ہمارے علماء نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

(۱) طلباء باقاعدہ درس و تدریس سے گھبرا کر واپس ہو جائیں گے۔ گویا کہ وہ تعلیم کو صرف معمولی رزق کا آسان ذریعہ سمجھتے ہیں۔ (۲) تحریری امتحان سے طلباء کی توہین ہوتی ہے، اور طلباء کی توہین حرام ہے (۳) موجودہ درس نظامی ہی نے بہت سے قابل علماء پیدا کئے تھے، لہٰذا اسمیں تبدیلی کرنا مدوّنین جیسے ناقابل لوگ پیدا کرنے کی طرف قدم اُٹھانا ہے۔

یہ دیکھکر مجھے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی، حالانکہ میں عربی مدارس کی اصلاح کرکے مسلمانوں کی ایک خدمت انجام دینا چاہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر مدرسہ پر علماء کے ایک گروہ کا قبضہ ہے۔ جیسے کہ اوقاف پر سجادہ نشینوں کا۔ داخل درس کتابوں میں ترمیم اور طرز تعلیم کی اصلاح سے چونکہ یہ اندیشہ ہے کہ شاید ہماری بنی

اسمیں کامیاب نہ ہوا اور دوسرے اساتذہ کو ان کی جگہ رکھنا پڑے۔ اس بنا پر وہ کسی معمولی تغیر کو جو آئندہ چلکر
رزق کا دروازہ بند کرسکتا ہو، گوارا نہیں کرتے اور اُن کے خلاف نکتہ چینی کرنا گویا دوزخ کا پروانہ راہداری
حاصل کرلینا ہے۔ اس لئے کوئی شخص اس "گناہ بے لذت" کو خریدنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور مایوس ہوکر اپنی جگہ
واپس ہوجاتا ہو۔ میں تو اب اس عقیدہ پر آگیا ہوں کہ اگر علما اپنے جمود سے نہ ہٹ سکے تو یقیناً جمہوری ہندوستان
میں اُن کو کوئی جگہ نہ مل سکے گی۔ علماء کو غلط فہمی ہے کہ چونکہ ہمارے چند افراد سیاست کا شغل بھی اختیار کئے ہوئے
ہیں اس لئے ہماری پیشانی کا ہر داغ دُھل جائے گا، مگر میرے نزدیک یہ مغالطہ جس قدر جلد دُور ہوجائے اتنا ہی
اچھا ہوگا۔ جمہوری ہندوستان میں جبتک آپ اپنے ووٹروں کے قلوب پر کوئی گہرا نقش نہ چھوڑیں گے۔
ممبران کو اسمبلی ہال میں آپ کا نام بھی یاد نہ آئے گا۔ آپ ملک کو عمومی طور پر جبتک اپنی ضرورت کا احساس
نہیں کرادیتے۔ آپ کا عزت کی زندگی بسر کرنا ناممکن ہو۔ چنانچہ میرے علم و اطلاع کے بموجب علماء کو بھی اس کا
کچھ نہ کچھ احساس ہو چلا ہے۔ انھیں اسکی تو امید ہو کہ ہندوستان کے اُس جمہوری نظام میں نظام شرعی کا
اقتدار ہوسکتا ہے جس کا مرکز ہندو اکثریت کے سایے میں ہو، لیکن وہ پاکستان جس کا مرکز مسلمان اکثریت کے
رجحانات کا تابع ہو، اُن کے نزدیک نظام شرعی کا کوئی امکان نہیں رکھتا۔ یہ کیا چیز ہے، یہ کیا جذبہ ہو، کیا اس کا
یہ مطلب نہیں کہ آپ بعض سیاسی خدمات کی بنا پر یہ تصور تو قائم کرسکتے ہیں کہ اُن کا اعتراف کرتے ہوئے آپکو کچھ نہ کچھ
صلہ دیا جاسکتا ہو لیکن خود مسلم جمہوریت سے آپ توقع قائم نہیں کرسکتے۔ کیونکہ آپ کا اُن کے دل و دماغ پر کوئی اثر
مرتب نہیں ہورہا۔ یہ شب و روز، یہ صبح و شام اور یہ ماہ و سال کبتک ابھلتی ہوئی بگڑی کو سنبھال سکتے ہیں۔ ضرورت
ہے کہ علماء کتابی قابلیت کے ساتھ تمام پہلوؤں پر نظر ڈالیں تاکہ وہ سب کچھ کیا جاسکے جو امکان سے باہر نہیں۔ کیا علماء
یہ نہیں کرسکتے کہ عربی بولنے، لکھنے کی مشق کرسکیں، کیا اُردو زبان کا درس نہیں دیا جاسکتا تاکہ علماء کی تحریر و
تقریر درست ہوسکے۔ شاید علماء کو اندازہ نہیں کہ غیر ادبی انداز میں بہتر سے بہتر نکات حل کرنا بھی دل و دماغ پر
کوئی اثر نہیں رکھتا اور ادبی انداز سے زندگی کے عام مشاہدات کو پیش کرنا بھی ایسے حقائق تک نگاہ توجہ کو

پہونچا دیتا ہے جن کو مشکل سمجھا جا سکتا تھا۔ علمار کی یہ وہ سب سے بڑی کمزوری ہو جس کی بنا پر اُنکا وعظ وپند کارگر نہیں ہوتا۔ پاکیزہ ترین خلوص کی کہرائی شعاعوں کے بعد اگر کوئی نشتر دل وجگر میں پیوست ہو سکتا ہو تو وہ خطابت اور ادیبانہ طرزادا کے سوا کوئی نہیں۔ دوسرے اردو زبان سے دلچسپی لینے پر ایک دوسرا فائدہ بھی اسلامی ہند کو پہونچ سکتا ہے اور وہ اردو کا دیگر صوبہ جات ہی نہیں بلکہ بیرونی اسلامی ممالک میں بھی عربی مدارس ہی کے ذریعے اشاعت پذیر ہوتا ہو۔ زبان کی اہمیت اور اُس کے نتائج سے انکار کرنا شعور وتجربہ پر ظلم ہوگا۔ بقول حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے "وحدت ادیان کے باوجود جس چیز نے تعبیرات میں زمین وآسمان کا فرق پیدا کردیا وہ زبانوں کا اختلاف ہی تھا۔" اُردو عربی سے قریبی نسبت رکھتی ہو اور یوں ہمارے تخیل، انفرادی اور اجتماعی نفسیات پر اُسی نوع سے اثر انداز ہوگی جس طرح کہ عربی ادب ہوتا۔ ہمارے علما ان نازک علمی نکات پہ قوائے فکر یہ صرف نہیں کرتے اور اسطرح اسلامی ہند اُس علویت وارتقا سے دُور تر ہوتا جا رہا ہو جو اُس کے لئے ضروری تھا۔ اردو زبان پر ہی موقوف نہیں فارسی زبان سیکھنا بلکہ مغرب زدگی کے جراثیم کو بے اثر کرنے کے لئے انگریزی زبان اور جدید تحقیقات کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہو تاکہ علما کو وہ تمام پیچیدہ راستے معلوم ہو جائیں جن سے گذر کر شیطان مسلمانوں کی زندگی پر چھاتا چلا جا رہا ہو۔ آپ غور کیجئے کہ اگر کوئی عالم سوسائٹی کو اپنے سانچہ میں ڈھالنے والے یورپین نظریات نہ جانتا ہو تو وہ ہمارے نوجوانوں کو کیونکر بتا سکتا ہے کہ نازی ازم، فاسزم اور اشتراکیت وشمالیت میں وہ کون سے محاسن ہیں جنھیں قبول کیا جا سکتا ہے اور کون سے نقائص ایسے ہیں جنھیں انسانی فطرت، قرآن کا دستور حیات اور اخلاقی قوانین گوارا نہیں کر سکتے اور نہ بتا سکنے پر ظاہر ہو کہ علمار کی طرف سوءظن پیدا ہوگا اور یقین کرلیا جائے گا کہ عملی زندگی کے بارے میں علما ہماری رہبری کرنے سے قاصر ہیں۔ کیا یہ سوءظن رفتہ رفتہ بڑھ کر الہامی تعلیمات کے وقار کو صدمہ نہیں پہونچا سکتا۔ علما کا مذہبی فرض ہے کہ وہ ان پہلوؤں پر غور کریں کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ علوم جدیدہ سے آشنا ہو کر مغربی ذہنیت کے غلبہ کو شکست کرنا تو ایک طرف رہا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی ہمارے علما خطبات

مدراس جیسے لکچر تک مرتب نہیں کرسکتے۔ کیا قیامت ہو کہ ڈاکٹر اقبال "وطنیت اور اسلام" پر جس قدر تحقیقی مضمون سپرد قلم کرسکتا تھا۔ عام طور پر ہمارے علماء کے لئے ممکن نہیں رہا۔ یہ کہدینا بہت آسان ہو کہ مغربی تعلیم مسلمان نوجوانوں کو تباہ کر رہی ہو مگر اس کا تدارک کرسکنے والے علماء پیدا کرنا خود ہمارے علماء ہی کے لئے قطعاً ممکن نہیں۔ آج دنیا میں محض الزام تراشی اور جنت و دوزخ کی اجارہ داری سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔ آپکی دوزخ کو تسلیم ہی کون کرتا ہے جو اُس سے لرزہ براندام ہو۔ میرا اندازہ ہو کہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات میں سے نوّے فی صدی نوجوان خدا ہی کے وجود کا دل سے یقین نہیں رکھتے۔ دوسری عقائد تو رہے ایک طرف۔ میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس معاملہ میں جہاں ہمارے نوجوانوں کے مغربی ماحول کا قصور ہے وہیں علماء کی بے اعتنائی کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ خود میرا تجربہ ہو کہ علماء موت اور موت کے بعد آنے والی زندگی کے حقائق اس انداز سے نہیں سمجھاتے کہ ایک علمی انسان اُس سے کچھ روشنی حاصل کرسکے پھر نوجوانوں کا کیا گناہ ؟ اگر شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصنیفات میری نگاہوں سے نہ گذری ہوتیں تو ہرگز عالم برزخ کا فلسفہ نہ سمجھ سکتا! اور اگر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات اور مولانا عبید اللہ سندھی کا مکالمہ میری رہنمائی نہ کرتا تو تناسخ کا مسئلہ اور اسکی اصل پوزیشن میرے سامنے عمر بھر نہ آسکتی۔ حالانکہ ان مسائل پر نہ معلوم کتنے مناظرے دیکھ چکا تھا اور کتنی تصنیفات نگاہوں سے گذر چکی تھیں۔

علماء کا عذر ہو کہ ہم زبردست انقلاب نہیں کرسکتے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اس کو تسلیم کئے لیتا ہوں مگر کیا یہ دریافت کرنے کی اجازت دی جائیگی کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے عربی مدرسہ سے لیکر مرکزی دارالعلوم دیوبند تک اتنی گنجائش بھی نہیں نکل سکتی کہ مولانا عبید اللہ سندھی کی اسلامی فکر سے استفادہ کرتے ہوئے طلباء کو شاہ ولی اللہ صاحب کا فلسفہ جدید سیاسی اور اقتصادی نظریات اور اسلام کے درمیان تفاوت اور اسلامی فلسفہ کو ہندوستانی اقوام کے رگ و ریشہ میں جذب کرسکنے کا طریقہ بتایا جاسکے۔ مجھے جہاں تک حالات کا اندازہ ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ گنجائش ضرور ہو مگر قدامت پرستی اور گروہ بندی کے جذبات کسی دوسرے خیال کے عالم کو

گوارا نہیں کر سکتے خواہ وہ حضرت شیخ الہند کا شاگرد رشید اور اسلامی انقلاب کا سب سے بڑا داعی کیوں نہ ہو۔

ہمارے محترم مولانا سید ابو الحسن علی صاحب نے عربی مدارس پر مضمون لکھ کر میرے جذبات کو بیدار کر دیا، حالانکہ میں چاہتا تھا کہ عربی مدارس کا ہر تصور ذہن سے خارج کر کے ہمیشہ کے لئے ذہنی اذیت سے نجات حاصل کر سکوں کاش کہ اس زلف دراز کو چھیڑا نہ جاتا جس کے پیچ و خم سلجھائے نہیں جا سکتے تھے۔ اس موضوع پر کچھ لکھنا اب اگر چہ بیکار تو مفید نہیں ہاں "قومی ہائی کفر" کا دروازہ کھول سکنے کے لئے ضرور "کلید زریں" کا کام دے سکتا ہے۔ میں اپنے مولانائے محترم سید ابو الحسن علی صاحب سے عرض کروں گا کہ آپ عربی مدارس یا اسلامی قلعوں کو محکمہ آثار قدیمہ کے سپرد کرتے ہوئے ندوۃ العلماء کو ہر اس اقدام کے لئے مستعد کر دیجئے جو بہترین درسگاہ کے لئے موزوں ہو سکتا ہے اگر آپ جامعہ ملیہ کی طرح ہر سال اپنا ایک وفد ہندوستان کے اطراف میں مسلسل روانہ کرتے رہیں تو ہندوستان آپ کی صحیح پوزیشن سے واقف ہونے پر بہت زیادہ دلچسپی لینے پر مجبور ہوگا۔ مگر خدا کے لئے آپ بھی کسی دوسری قسم کی جمود میں مبتلا ہونے سے پرہیز کیجئے ورنہ صرف نوعیت کا فرق رہ جائے گا۔ ہندوستان کے سنجیدہ علمی انسانوں سے مشورہ کرتے رہنا کبھی ناکام ثابت نہیں ہوگا۔ کشادہ قلب، بلند نگاہ اور ہر نظریہ پر غور کر سکنے کی صلاحیت خدا کی ایک نعمت ہے۔ جسے ٹھکرانا نہیں چاہئے۔ آپ کو قدرت نے موقع دیا ہے کہ اسلامی ہند کی بہترین خدمت انجام دے سکیں اس لئے آپ کو اس موقع سے بہترین فائدہ اٹھانا چاہئے۔ خدا کرے کہ آپ کامیاب ہوں۔

احتساب اسلام میں

از مولوی محمد آسحٰق پشاوری متعلم ندوہ

احتساب اور محتسب کے دو لفظ اسلامی لٹریچر میں اس کثرت سے آئے ہیں کہ اب ان کا تعارف لاحاصل ہو، البتہ احتساب کی تاریخی سرگذشت قابل بیان ہے۔ اس درمیان اس موضوع پر الثقافۃ (قاہرہ) میں استاذ کرد علی سابق صدر مجلس المجمع العلمی دمشق کا ایک عالمانہ مضمون نظر سے گذرا جسکا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ (آسحٰق)

قرن اول میں تعلیم یافتہ مسلمان اور علماء دینی احتساب کو اپنا ایک اہم فریضہ جانتے تھے۔ اور اس وقت تمام ممالک اسلامیہ میں ہر شخص خواہ وہ کسی ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہو اپنا خود محاسب ہوتا تھا، احتساب کی کوئی قانونی شکل نہ تھی اور نہ حکومت کی طرف سے اس کا نفاذ تھا جس نے جس سے غیر شرعی کام سرزد ہوتے دیکھا اُسے متنبہ کر دیا، اور وہ رُک گیا۔

اس صدی کے بعد جب لوگ اعمال میں تساہل برتنے لگے اور نگاہیں حق شناسی کی روادار نہ رہیں تو حکومت کی طرف سے احتساب کا شعبہ قائم ہوا جسمیں مختلف کارکن ہوتے تھے جو مختلف خدمتوں پر مامور تھے، یہ محکمہ ادارہ قضاۃ کے بالکل مشابہ تھا اور حاکم محکمۂ احتساب کا کام وہی تھا جو قاضی اپنی کرسیِ عدالت پر بیٹھ کر صادر کرتا تھا۔ مگر فرق دونوں میں یہ تھا کہ قاضی کے احکام قول کے دائرے تک محدود رہتے تھے اور محاسب عملی نفاذ کا بھی حق رکھتا تھا۔ محاسب کا کام یہ تھا کہ وہ رعایا کے معاشرتی حالات پر پوری نظر رکھے، ان کے خرید و فروخت کے معاملات اسباب زندگی کے طریقے مثلاً غذا، لباس مکان وغیرہ کا نگہبان ہو، اور اگر وہ مناسب سمجھے تو انمیں ہر قسم کا تغیر بھی کر سکتا ہو، محاسب کو یہ حق بھی حاصل تھا کہ وہ لوگوں کو دین سے غافل دیکھ کر امر بالمعروف کرتا رہے اگرچہ اس زمانے میں اس کا کوئی خاص محکمہ نہیں ہے تاہم اس کا کچھ تصور آجکل کے محکمۂ پولیس یا محکمۂ منصفی سے کیا جاسکتا ہے۔

علماء نے قانون احتساب پر تقریباً بیس سے زائد کتابیں لکھی ہیں، امام ابن ... نے الحسبۃ فی الاسلام جوہری دمشقی نے "المختار فی کشف الاسرار" جعفر ابن علی دمشقی نے "الاشارہ الی محاسن التجارہ" اور سقطی اندلسی نے "آداب الحسبۃ" کے نام سے کتابیں تحریر کی ہیں جنمیں قانون احتساب پر سیر حاصل بحث کی ہے، سقطی اندلسی کی کتاب آداب الحسبۃ کا کچھ حصہ اندلس کے کسی شہر میں طبع ہو گیا ہے، اور دوسرے اندلسی ابن عبدون التجیبی کا رسالہ جو اب فرانس کے ایک اخبار میں شائع ہو چکا ہے اسمیں اندلس اور مغرب اقصیٰ کے قانون احتساب کی توضیح کی گئی ہے

آٹھویں صدی ہجری کے قانون احتساب پر چار قلمی نسخے میری نظر سے گذرے تھے، میں نے ان نسخوں کو "نہایۃ الرتبہ فی طلب الحسبہ" کے نام سے رسالہ المقتبس میں جس کی اشاعت ۱۹۱۳ء میں ہوئی شائع کرا دیے تھے۔ اس موضوع پر شیرازی کی کتاب "نہایۃ الثنیہ" عمر ابن محمد ابن عوض شامی کی کتاب فی الحسبہ ابن الاخوہ کی "معالم القربہ فی احکام الحسبۃ" جو مصر میں طبع ہو چکی ہیں مستند کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ آخر الذکر کتاب کو روبن لیوی نے کیمبرج کے مطبع دار الفنون سے چھپوا دیا ہے اور اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی کر دیا گیا ہے جس کے ساتھ حواشی کا مزید اضافہ ہے، لیکن ترجمہ میں غلطیاں زیادہ ہیں اور مترجم نے مؤلف کے خیالات اور الفاظ کے معانی کو بدلنے کی بہت زیادہ کوشش کی ہے ضعیف راویوں کو عادل اور صحیح روایت کو منکر ثابت کرنا چاہا ہے۔ یہانتک کہ قرآن کی آیتیں بھی تحریف سے نہیں بچ سکیں، ضرورت ہے کہ اس کتاب کی صحت کی طرف توجہ کی جائے، اور اسپر عربی کا مقدمہ لکھ کر اس متعصب مستشرق کے دیدہ دانستہ تساہل کا پردہ چاک کیا جائے۔

ابن حجر عسقلانی نے ابن اخوہ کا حال الدرر الکامنہ میں لکھا ہے

ابن حجر ان کا اصلی نام محمد ابن محمد ابن احمد بن ابی زید القرشی ضیاء الدین بتاتے ہیں اور یہ محدث تھے۔ جنکی وفات ۷۲۹ھ میں ہوئی ہے، لیکن ابن حجر بعد کو خود ہی کہتے ہیں کہ یہ معالم القربہ کے مؤلف نہیں ہیں۔ ابن اخوہ نے کتاب معالم القربہ میں ۷۰ باب قائم کئے ہیں اور ہر باب میں مختلف فصلیں صنعت و حرفت اور شہری اصطلاحات کے نام سے جمع کی ہیں، ہم اس کتاب کی چند کارآمد فصلوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(البواردین) یہ وہ لوگ تھے جو کچی ترکاریاں فروخت کرتے تھے۔ جیسے لوبیا وغیرہ۔ (السداریہ) جو پیستے تھے جیسے صابون اور اس کے مثل (المفاخرانیین) خوشبو بنانے والے (الغفارون) کوٹنے پیچنے والے (السلطانیات) سنگریزے پیسنے والے (المسلاتین) سوئیاں بنانے والے (المردانین) جو کپڑا بننے کے اوزار ایک قسم کی لکڑی سے تیار کرتے تھے۔

مگر مؤلف نے دوسری صدی ہجری کے ذمیوں کے متعلق جو فصل قائم کی ہے اسمیں ذرا مبالغہ سے کام لیا ہے اور ان کے حالات میں کچھ ایسی باتیں لکھ گئے ہیں جنکو مسلمان حکام نے ذمیوں کے ساتھ کبھی بھی روا نہیں رکھا، چنانچہ جاحظ نے مؤلف کے الفاظ کی تشریح اس طرح کی ہے کہ ذمی گھوڑوں پر سوار ہوتے، پولو کھیلتے، لباس فاخرہ پہنتے اور اپنے نام حسنؓ حسینؓ، عباسؓ، فضلؓ، علیؓ کے ناموں پر رکھتے تھے اور ان کی کنیت ابوالقاسم بھی ہوتی تھی، ذمیوں نے مسلمانوں کی اجازت سے زنار باندھنا چھوڑ دیا تھا، اور ان کے منصب داروں نے جزیہ دینا بند کر دیا تھا۔ جن کے بعد وہ خود بھی ان کی پیروی کرنے لگے تھے چنانچہ ان کے راہرو جے مارنے یا سب وشتم کہتے تو یہ بھی ان کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ مؤلف پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ ذمی مسلمانوں کی مسجدوں میں آتے اور ان کی خاص مجلسوں میں برابر شریک ہوتے تھے ذمیوں نے وہ صفات بھی اختیار کر لی تھے جو خلفاء کے لئے مخصوص تھے مثلاً رشید اور وہ کنیتیں جو کسی طرح اُن کے لئے جائز نہ تھیں مثلاً ابوالحسن، ابی الفضل علاوہ بریں مسلمانوں کی سواریوں پر سوار ہوتے ان سے اچھا لباس پہنتے، انھیں اپنی خدمت پر رکھتے، میں نے یہودیوں اور نصرانیوں کو دیکھا کہ وہ کوچوں پر سوار ہیں اور ایک خادم گھوڑے کی لگام تھامے سڑک پر پاپیادہ جارہا ہے۔ ذمی کبھی مسلمانوں کی تحقیر و تذلیل سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے، اُن کی عورتیں مسلمان عورتوں کی طرح گھر سے باہر نکلتی تھیں جنمیں فرق کرنا دشوار ہوتا تھا، ان کو اسکی بھی اجازت تھی کہ بازار میں تاجروں سے خرید و فروخت کریں اور مسلمان تاجران کے لباس کی خوبی کے سبب سے ان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھیں۔

لیکن مؤلف دوسری جگہ اپنی کتاب میں نصاریٰ کے ایک خط کو جو انھوں نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں

روایت کیا تھا نقل کرتے ہیں جس میں مذکورۂ بالا واقعہ کی تکذیب ہوتی ہے اور مؤلف کے اس قول سے دونوں میں زمین وآسمان کا فرق نظر آتا ہو۔ چنانچہ ابن اخوہ نے نصاریٰ کی تحریر کو یوں نقل کیا ہے۔

"جب آپ کی فوج ہم پر غالب آگئی تو ہم اپنے جان ومال اور اولاد کے لئے امن کے طلبگار ہوئے اور ہم نے اس کا وعدہ کیا کہ ہم شہر کے کسی حصہ میں گرجا قلعہ یا راہب خانہ تعمیر نہ کریں گے۔ جو ایسی سو منہدم ہوگئے ہیں ان کی مرمت نہ کیجائے گی، اور نہ اُن کی تعمیر ایسی جگہ ہوگی جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو، علاوہ ازیں اپنے مکانوں یا عبادت خانوں میں جاسوس نہ رکھیں گے اور نہ کسی دشمن کو مسلمانوں کے خلاف جگہ دیں گے۔ اپنے بچوں کو قرآن کی تعلیم بھی نہیں دیں گے، اپنی شریعت کو شرک کی صورت میں ظاہر نہ کریں گے اور نہ اسکی طرف کسی کو دعوت دیں گے اگر ہم میں کا کوئی مسلمان ہوجائے تو اُسے روکا نہ جائے گا۔ ہم ہر صورت میں مسلمانوں کی تعظیم کریں گے۔ اگر مسلمان ہماری مجلس میں آئیں تو ہم احتراماً کھڑے ہوجائیں گے۔ ہم مسلمانوں کے لباس مثلاً ٹوپی، عمامہ، جوتہ، مانگ کی نقل نہ کریں گے۔ اپنے نام یا القاب مسلمانوں کے ناموں پر نہ رکھیں گے، سواری پر نہ چڑھیں گے۔ تلوار نہ لٹکائیں گے ہتھیار بدن پر نہ سجائیں گے اور اپنی انگوٹھی پر عربی نقش نہ کریں گے۔ شراب نہ فروخت کریں گے نہ پلائیں گے، اپنی کتابوں یا گھوڑوں کا مظاہرہ مسلمانوں کی سڑکوں یا بازاروں میں نہ کرینگے گرجاؤں میں گھنٹے آہستہ بجائیں گے۔ جہاں مسلمان موجود ہیں وہاں بلند آواز سے نہ پڑھیں گے۔ اپنے جنازہ کو خاموشی کے ساتھ لیجائیں گے اور اسے مسلمانوں کے قبرستان کے قریب نہ دفن کریں گے۔ یہ شرط ہماری طرف سے اور ہماری ملت کی طرف سے ہے اور ہم نے آپ کی امان قبول کرلی ہو۔ اگر ہم نے ان شرائط کے خلاف کیا تو ہمارا عہد باقی نہ رہے گا اور اسوقت جو سلوک دشمن کے ساتھ کیا جاتا ہو وہی برتاؤ ہمارے ساتھ بھی کیا جائے۔

جب یہ خط حضرت عمرؓ کے پاس پہونچا تو آپنے اتنا زیادہ فرمایا کہ ہم کسی مسلمان کو قتل بھی نہیں کریں گے اگر انھوں نے کسی مسلمان کو قصداً قتل کرڈالا تو یہ عہد وپیمان ٹوٹ جائے گا۔ اس کے بعد آپنے فرمایا، اس عہد کو پورا کیا جائے اور انھیں امان دیدی جائے۔

اگرچہ آج ہم ان اُمور کو جنپر ذمی بخوشی راضی ہوگئے تھے حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں مگر یہ تنگی اُنپر اسلئے تھی کہ ذمیوں کی بیجا کبر و نخوت کا خاتمہ ہوجائے اور ان ذمیوں کی حشمت و وجاہت کا استیصال ہو۔ ورنہ مسلمانوں کا رویہ ذمیوں کے ساتھ ایسا نہیں تھا جس نے ان کی زندگی دشوار کر دی ہو اور ان کو کسی قسم کی سہولت نہ دی گئی ہو اور ذمی اس عہد و پیمان کے سبب سے مشکلات میں پڑ گئے ہوں، بلکہ مسلمانوں کا تعلق ذمیوں کے ساتھ ہمیشہ میانہ روی اور اعتدال کا رہا ہے۔

اسلئے ممکن ہو کہ مؤلف نے بعد کے قول کو چھوڑ کر مسلمانوں کے عمل کا خاکہ پیش کیا ہو اور اس میں ذرا مبالغہ سے کام لیا ہو۔ مؤلف نے اپنی کتاب میں سب سے بڑی شکایت یہ کی ہو کہ مسلمانوں کے عہد میں مسلمان طبیبوں کی بہت بڑی کمی تھی، اکثر علماء کی توجہ زیادہ تر فقہی مسائل کی طرف رہتی تھی۔ کتنے ایسے شہر تھے جن میں سوائے ذمیوں کے اور کوئی طبیب نہیں ہوتا تھا، نہ اس فن کے ساتھ زیادہ دلچسپی لی جاتی تھی، بلکہ پورا شہر مفتیوں سے بھرا رہتا تھا، جو فتوے اور جوابات صادر کرنے میں مشغول رہتے تھے۔

اسکی وجہ یہ ہوسکتی ہو کہ اس زمانے میں اسلامی مسائل کی اشاعت کا زور تھا اور اس کے سبب سے لوگوں کو بڑے بڑے عہدے دیے جاتے تھے جس نے تمامتر مسلمانوں کی توجہ انھیں مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے وقف کر دی تھی۔

امام غزالیؒ احیاء علوم الدین میں اس حقیقت کا انکشاف اسطرح پر کرتے ہیں۔

"مسلمانوں کا میلان دینی علوم کی طرف کچھ مذہبی حیثیت سے نہیں تھا، بلکہ اُمراء اور سلاطین کی نگاہوں میں وقعت حاصل کرنے کے لئے یہ علوم سیکھے جاتے تھے ورنہ ان علوم کے ساتھ ان کی گہری دلچسپی نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے نہ تو وہ دین کی پوری خدمت کرسکے اور نہ دُنیا سے انھیں کچھ زیادہ فائدہ پہونچا۔

پھر ابن اخوہ لکھتے ہیں۔

کسی طبیب، کحال یا جراح کو اسکی اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنے پیشہ سے کسب معاش کرسکتا جبتک

مقررہ کتابوں کا امتحان دیکر اس فن میں مہارت حاصل نہ کرلیتا۔ یہ فنون صرف روم کے مشرکین کے لئے مخصوص تھے۔ اس کے بعد نصاریٰ کو بھی اجازت دیدی گئی تھی لیکن مسلمان اس رخصت سے محروم تھے، مزید برآں طبیبوں سے ایک عہد لیا جاتا جس کو بقراط نے اپنے شاگردوں سے لیا تھا۔ مثلاً کبھی وہ ضرر رساں دوا نہ دیں گے اور نہ اس میں زہر ملائیں گے، عورتوں کو ایسی دوا نہ دیجائے گی جس سے حمل ساقط نہ ہوجائے اور نہ مردوں کو ایسی دوا پلائی جائے گی جس سے انکی نسل منقطع ہوجائے۔

حنین ابن اسحاق کی کتاب جسمیں آنکھ کے متعلق بیس مقالے درج ہیں اور جسے ڈاکٹر مایرہوف نے ۱۹۲۸ء میں قاہرہ میں چھپوادیا اُن کے لئے ان مضامین کا امتحان دینا واجبی تھا اور "مجربین" یعنی سرجنوں کو کناش تولیس کا مقالہ پڑھنا لازمی تھا جسمیں مضمون نگار نے جراحی کے عنوان کو بڑی دقیقہ رسی اور باریک بینی سے واضح کیا ہو اور یہ تحقیق کی ہو کہ انسانی ہڈیوں کی کل تعداد دوسو اڑتالیس ہو، ہر ہڈی کی شکل و صورت کاغذ کے صفحوں پر ظاہر ہے اور اس کی بھی تفصیل ہو کہ اگر کوئی ہڈی اپنی جگہ سے اکھڑ جائے یا ہٹ جائے تو اسکی درستگی کی کونسی صورت اختیار کرنی چاہئے، عمل جراحی کرنے والوں کو اپنے پیشہ کی اجازت اسوقت تک نہیں دی جاتی تھی جبتک کہ وہ جالینوس کی کتاب بقاطاجانس کو پڑھکر فن جراحت میں کامل مہارت اور مرہم پٹی کرنے کا پورا سلیقہ پیدا نہ کرلیتے تھے۔ اور ان کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اعضائے انسانی مثلاً، رگوں، پٹھوں اور اعصاب وغیرہ سے خوب واقف کار ہوں۔

ابن اخوہ نے اپنی کتاب میں "حماموں پر احتساب" کا تذکرہ یوں کیاہے۔ اگر محتسب کسی کو ننگا دیکھ لیتا تو اس کا بغیر تعزیر کے چھٹکارا پانا دشوار تھا، کیونکہ محتسب اس کا عامل رہتا تھا کہ شرمگاہ کا کھولنا حرام ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرمگاہ کھولنے والے اور دیکھنے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہو، بلاشبہ برہنہ غسل کرنے میں عورتیں مردوں سے اک قدم آگے ہیں، اور زیادہ تر منکرات کا ارتکاب وہی کرتی رہتی ہیں اور زندگی کے عیش ونشاط میں مردوں سے بڑھ کر حصہ لینے کی آرزومند ہو اس آٹھویں صدی ہجری

میں عورتوں نے ایسے ایسے لباس پہننا شروع کر دیے ہیں، جس کا تصور شیطان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا، اور جن پر نظر پڑتے ہی جذبات خواہشات نفسانی کو اپیل کرنے لگتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی اوڑھنیاں اپنی کمی وسعت میں نہ تو ان کے چہروں کو ڈھانپ وچھپا سکتی ہیں اور نہ ہی ان کی چاک گریبانی . ان کی سینہ پوشی کی متحمل ہیں، ابن اخوہ کے اس بیان سے ہم نے جانا کہ ہماری آزاد خیال عورتیں ایک صدی سو نہیں بلکہ چھ سو سال سے اس مغربی فتنے میں مبتلا ہیں، جو اسلامی تہذیب کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے اور ہیں تجیبی اندلسی کی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی فتنے کے خوف سے مسلمان عورتوں کو گرجاؤں میں جانے کی اجازت نہیں تھی اور نہ عیسائی عورتیں سوائے اپنے مذہبی تہواروں اور خاص موسموں کے علاوہ گرجاؤں میں داخل ہو سکتی تھیں اور گرجا کے راہبوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ تجرد کی زندگی نہ بسر کریں لیکن اسپر مجبور نہیں تھے، ہاں اگر وہ شادی نہیں کرتے تو ان کے گھروں میں کوئی عورت خواہ وہ بوڑھی ہی کیوں نہ ہو اسکو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی، راہبوں کو ختنہ کرنے کا بھی حکم دیا گیا تھا، کیونکہ وہ اپنے کو عیسیٰ علیہ السلام کا متبع سمجھتے تھے اور عیسیٰ علیہ السلام مختون تھے، اور آپ کے ختنہ کے دن کو مبارک اور خوشی کا دن سمجھتے تھے تجیبی آگے لکھتے ہیں کہ یہود اور نصاریٰ سے کوئی علمی کتاب نہیں خریدی جاتی تھی مگر ان کتابوں کی اجازت تھی جنکا تعلق ان کی شریعت سے تھا کیونکہ وہ اکثر مسلمانوں کی تالیفات کا ترجمہ کرکے ان کی نسبت اپنے بڑوں کی طرف کر دیا کرتے تھے۔

ہم نے ان امور اور کتابوں کا تذکرہ کر دینا اسلئے مناسب سمجھا تاکہ ہماری موجودہ زبان میں معلومات کا مزید اضافہ ہو۔ اور وہ اسلامی دور کہ جنمیں متفرق واقعات جو مختلف ماحول میں نئی نئی شکلوں میں ظاہر ہوتے رہے ہیں نظروں کے سامنے آجائیں، اور سلف کی مدنی زندگی اور ذہنی ترقی کا تاریخی سرمایہ ایک نمونہ کی صورت میں ہمارے پاس موجود رہے۔

افلاطون کا نظریۂ تعلیم

از جناب مولوی محمد اقبال وارث صاحب انصاری

(۳)

درجۂ تکمیل درجۂ ابتدائی کی تعلیم اٹھارہ سال کی عمر میں ختم ہو جائے گی۔ اس تعلیم کے ختم ہو جانے کے بعد ہر شخص کو لازمی طور سے دو سال تک خالص قومی تعلیم دی جائے گی پھر اعلیٰ تعلیم شروع ہو گی مگر یہ تعلیم اس بیست سالہ طبقہ میں سے صرف ان لوگوں کو دی جائے گی جو تحصیل علم اور دیگر مفوضہ امور میں سب سے زیادہ ثابت قدم رہے ہوں، اور کارہائے نمایاں انجام دیے ہوں" یعنی نہایت مضبوط، نہایت مردانہ اور جس حد تک ممکن ہو نہایت خوبصورت ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی شریف، ثابت قدم اور اخلاقی ماہیت والے ہوں اور ان میں ایسے صفات موجود ہوں جو اس طریقۂ تعلیم کے مناسب ہوں[1] نیز یہ کہ

(ا) ان میں نسیان نہ ہو، اسلئے کہ اگر کوئی شخص جو سیکھے اُسے محفوظ نہ رکھ سکے تو اس کا سکھانا نہ سکھانا برابر ہو گا اور وہ ہمیشہ صفحۂ سادہ بنا رہے گا۔

(ب) انھیں تحصیل علم سے لذت و حظ حاصل ہو اس لئے کہ انسان کبھی اس چیز کو بخوشی گوارا نہیں کرتا جسمیں سراسر تکلیف ہی ہو یا کافی محنت کے بعد بھی ترقی برائے نام ہو۔

(ج) ان کے دماغ میں فطری طور سے حسن تناسب، شرافت اور صداقت بدرجہ اتم موجود ہو اور وہ خود بخود تمام اشیاء کے وجود کے معلوم کرنے کی فکر کریں، اسی لئے کہ افلاطون "تعلم برائے دانستن" کا قائل نہیں ہے اس کے نزدیک علم ماہیت وجود کے جاننے کا نام ہے اور اس کا موضوع "وجود" ہے۔

اس درجے میں ان علوم کو جو ابتدائی تعلیم میں بغیر کسی خاص نظم کے سکھائے گئے تھے یکجا لایا جائیگا تاکہ طالب علم بچشم خود ان علوم کی باہمی فطری مناسبت اور وجود حقیقی سے تعلق دیکھ لے، افلاطون سے قبل بھی

---

[1] ریاست ص۲۳۶

خود اس کے ملک میں سوفسطائی معلموں نے اعلیٰ تعلیم کے مدارس کھول رکھے تھے جنہیں خطابت وسیاست کے درس دیے جاتے تھے، مگر افلاطون ان دونوں کو درجۂ تکمیل کے نصابِ تعلیم میں کوئی جگہ نہیں دیتا، وہ اسمیں صرف پانچ مضمون رکھتا ہے۔

(۱) علم الحساب (۲) علم ہندسہ (۳) علم ہیئت (۴) علم منطق (۵) علم فلسفہ

ابتدا میں دس سال تک یعنی بیس سال کی عمر سے تیس سال کی عمر تک صرف ابتدائی چار مضامین کی تعلیم ہوگی جنمیں افلاطون علم الحساب کو خاص اہمیت دیتا ہے اور کہتا ہے۔

"حساب ایک ایسی نوع علم ہے جس کی تعلیم بہترین طبائع کو دینی چاہئے اور اسے ہرگز ترک نہ کرنا چاہئے[1]"

علم الحساب کی اس اہمیت کا سبب یہ ہو کہ افلاطون کے نزدیک تعلیم سے مقصود سپاہی یا فلسفی پیدا کرنا ہے اور یہ دونوں کے لئے یکساں ضروری ہو، اگر ایک طرف سپاہی علم الحساب سے واقفیت کے بغیر اپنی فوج کو صف بستہ نہیں کرسکتا تو دوسری طرف فلسفی بھی حساب دانی کے بغیر تغیر کے بحر بیکراں سے نکل کر وجود حقیقی کی صحیح معرفت حاصل نہیں کرسکتا، اسی لئے افلاطون کا خیال ہے کہ

"یہ (حساب) ایسا علم ہو جسے ہمقنین قانون بجا طور پر لازم قرار دیسکتے ہیں اور ہمیں اپنی ریاست کے خاصان مستقبل کو رغبت دلانی چاہئے کہ وہ علم الحساب کو محض شوقیہ مبتدیوں کی طرح نہ سیکھیں بلکہ اسوقت تک اس کا مطالعہ جاری رکھیں جبتک وہ صرف ذہن سے ماہیت اعداد کو نہ دیکھ لیں، اسی طرح اس کا مطالعہ تاجروں اور خوردہ فروشوں کی طرح خرید وفروخت کے خیال سے نہیں بلکہ اس کے فوجی فائدے اور خود روح کی خاطر کریں کیونکہ روح کے لئے مشہودات سے صداقت اور وجود مطلق تک پہونچنے کا

---

[1] ریاست صفحہ ۲۲۴

یہ سب سے سہل راستہ ہوگا۔[1]

"علم الحساب نہایت عظیم الشان اور نفعت بخش اثر رکھتا ہے۔ یہ روح کو مجرد اعداد کے متعلق توجیہ و تعقل پر مجبور کرتا ہے اور جہاں کہیں دلیل میں مرئی یا محسوس چیزیں داخل ہوئیں بگڑ بیٹھتا ہو، تم جانتے ہو کہ اس فن کے اساتذہ کس بامروی کے ساتھ ہر اس شخص کا رد کرتے ہیں اور مضحکہ اڑاتے ہیں جو حساب کرنے میں وحدت مطلق کو تقسیم کرنے کی کوشش کرتا ہے اگر تم ادھر تقسیم کرو وہ ادھر ضرب دیدیتے ہیں تاکہ وحدت وحدت باقی رہے اور کسور میں گم نہ ہوجائے۔[2]

حساب کے بعد علم ہندسہ کا درجہ ہے، اسمیں شک نہیں کہ افلاطون علم ہندسہ کو بہت اہمیت دیتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ فلسفہ کی تعلیم کے لئے ضروری ہو یہاں تک کہ اس نے مدرسہ کے دروازے پر لکھ رکھا تھا کہ اسمیں صرف وہی شخص داخل ہو جسے علم ہندسہ میں مہارت تامہ حاصل ہو[3] مگر پھر بھی اس کا مرتبہ علم حساب سے کمتر ہے، یہ ضرور ہو کہ علم ہندسہ کا موضوع بھی عارضی یا فانی شے کا علم نہیں بلکہ ازلی و ابدی چیزوں کا علم ہو اور فوجی یا افلاطون کی زبان میں "محافظانہ" نقطۂ نظر سے بھی اس کی بڑی اہمیت ہو، اس لئے کہ پڑاؤ ڈالنے، کوئی موقع اختیار کرنے، فوج کے حصّوں کو مجتمع کرنے یا وسعت دینے اور کسی فوج نقل و حرکت میں خواہ اصلی ہو یا نقلی اس بات سے بہت فرق پڑتا ہے کہ سپہ سالار ہندسہ داں ہے یا نہیں۔

علم ہندسہ کے بعد علم ہیئت کا درجہ ہو اس سے مراد افلاطون کے نزدیک حرکت اجسام ہو اور جنرہ مطالعہ بنانے کی غرض و غایت بھی فوجی اغراض ہیں، اس کے علاوہ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بھی اسکی تعلیم ضروری ہو اس لئے کہ سیئت روح کو اوپر دیکھنے پر مجبور کرتی ہو اور اس دنیا سے ایک دوسرے عالم کی لیجاتی ہے۔[4]

اس کے بعد علم منطق کی باری آتی ہو، "منطق تمام علوم و حکم کا سنگ شرف ہو اور ان کا سرتاج، کوئی اور

---

[1] ریاست ص ۲۴۴۳۴ [2] ریاست ص ۲۳۶ و ۲۳۵ [3] تاریخ الفلاسفہ مطبوعہ قسطنطنیہ ص ۸۶ [4] ریاست ص ۲۴۲

علم اس سے بلند تر نہیں ہو سکتا کہ ماہیت علم اس سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔[1] "منطق اور صرف منطق برا
اصل بلند تک لیجاتی ہے، اور صرف یہی وہ علم ہو جو اپنی بنیاد کو محفوظ کرنے کے لئے مفروضات سے د
کرتا ہے جسم روحانی جو واقعی ایک خارجی دلدل میں مدفون ہے اس کی مدد سے اوپر اٹھتا ہے"[1]

تیس سال کی عمر میں ان مضامین کی تعلیم ختم ہو جائے گی، اس مدت میں جنھوں نے ریاضی
زیادہ دلچسپی لی ہوگی، ریاضیاتی مضامین کا بغور مطالعہ کیا ہوگا اور ان کے باہمی ربط و تعلق کو سمجھا ہ
انھیں پانچ سال تک خالص فلسفہ کی تعلیم دیجائے گی، یہ تعلیم کی سب سے آخری منزل ہوگی جس کے ختم
نیچے غاروں میں بھیجدیا جائے گا جہاں فلسفیانہ مسائل پر غور و خوض میں اپنا وقت صرف کرنا، اور حکومت
ہر ممکن خدمت کرنا طالب علم کا فرض ہوگا اور حکومت نے مناسب خیال کیا تو انھیں کسی فوجی یا ملکی خد
انجام دینے پر بھی جو ان کے لئے زیادہ مناسب ہو مجبور کیا جائے گا، تاکہ انھیں کشمکش حیات سے تجربہ حاصل ہو ا
اس آزمائش کا موقع مل سکے کہ جب انھیں مختلف قسم کی لالچیں ہر طرف سے گھیریں گی تو ثابت قدم رہیں
یا ان کے پائے ثبات کو لغزش آجائے گی اور جادۂ مستقیم سے بہک جائیں گے، ان کی زندگی کی یہ منزل آ
پندرہ سال تک رہیگی یعنی پینتیس سال کی عمر سے پچاس سال کی عمر تک، جسے ثابت قدمی کے ساتھ طے کر
والے کو معراج کمال پر پہونچا یا جائے گا کیونکہ "یہی وہ نمونہ ہو جس کے مطابق ریاست کو حیات افراد کو ا
خود اپنی بقیہ زندگی کو منضبط کرنا ہے"[2]

معراج کمال پر پہونچ جانے کے بعد اگرچہ اکثر وقت فلسفیانہ اشغال کی نظر ہوگا لیکن جب باری
آئے تو انھیں سیاست اور دوسرے فرائض کی بھی انجام دہی اور عوام کے مفاد کی خاطر حکومت کی خدمت کر
ہوگی اور یہ خدمت انھیں نہ صرف اپنی مرضی سے انجام دینی ہوگی بلکہ اسکی انجام دہی ہر طالب العلم کے فرائض منصبی
میں داخل ہوگی جسے وہ چار و ناچار انجام دیگا۔

---

[1] ریاست ص ۲۵۶ [2] ریاست

اسی طرح علی الاتصال ایک گروہ حکومت کی خدمت گزاری کے لئے مہیا ہوتا رہے گا اور جب وہ ہر فرقہ میں اپنے جیسے لوگ پیدا کر دیگا تو دوسروں کے لئے اپنی جگہ چھوڑ کر مبارکوں کے ذیرہ کی راہ لے گا اور وہیں بود و باش اختیار کرلے گا۔ اب ریاست ان کی یادگاریں روضے تعمیر کرائے گی، اہل شہر انکی یادگاریں نصب کریں گے، ان کے نام پر قربانیاں چڑھائیں گے اور بس :-

اطلاع

رسالۂ الندوہ کی پہلی جلد میں اس امر کا اعلان کیا گیا تھا کہ معین الندوہ کے ایسے ممبران کو جو پانچ روپیہ یا اس سے زائد سالانہ ادا کرتے ہیں رسالۂ الندوہ مفت دیا جائے گا، چنانچہ اب تک اس پر عمل بھی کیا گیا، لیکن اب جبکہ عام حالات کی تبدیلی کے باعث معین الندوہ کے اخراجات بدستور کیا معنی پہلے سے بھی کچھ زیادہ بڑھ گئے ہیں اور آمدنی میں طرح طرح کی دشواریاں پیدا ہو رہی ہیں معین الندوہ کے لئے اس سلسلہ کو جاری رکھنا بہت مشکل ہو رہا ہے لہذا بذریعہ تحریر ہذا اعلان کیا جاتا ہے کہ اب آیندہ سے صرف ان حضرات کی خدمت میں رسالۂ الندوہ بلا قیمت بھیجا جا سکے گا جو معین الندوہ کو دس روپیہ سالانہ یا اس سے زائد ادا فرماتے ہیں۔

حامد علی
ناظم معین الندوہ

گذارش

جن حضرات پر چندہ سالانہ رسالۂ الندوہ واجب الادا ہو اُن سے گذارش ہے کہ وہ اپنا چندہ مؤرخہ ۱۵ اپریل سنہ ۴۲ء تک ذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں ۱۵ اپریل سنہ ۴۲ء تک انتظار کرنے کے بعد رسالۂ الندوہ بابتہ ماہ اپریل ذریعہ وی۔ پی۔ ارسال خدمت کیا جائے گا۔

"مینیجر"

حالات ندوہ

وسط مارچ میں دو تین دن دارالعلوم میں بڑی دلچسپی سے گزرے۔ ۱۵۔۱۶ مارچ کو انجمن طلبا قدیم کے سالانہ جلسے ہوئے اور ۱۷ مارچ کو النادی العربی کا کل ہند مباحثہ منعقد ہوا، آجکل سارا ملک جن پریشانیوں میں مبتلا ہو ان کے پیش نظر کسی جلسہ کا انعقاد جسقدر دشوار ہوتا ہے لیکن ندویوں کے لئے ندوہ میں ایسا سامان کشش ہو کہ وہ ہر قسم کے مشکلات و موانع کے باوجود کھنچ کھنچ کر ندوہ میں جمع ہو گئے اور دو تین دن زن و فرزند کے جھمیلوں سے الگ، فکر معاش کی الجھنوں سے آزاد اور مستقبل کے افکار سے بے پروا ہو کر خوش دلی اور خوش باشی سے گزارے کچھ دیر کے لئے بوڑھے جوان ہو گئے تھے اور جوان بچپن کی یاد میں مست تھے، عہد طفلی کے بھولے ہوئے خواب پھر سے یاد آرہے تھے اور معصومیت و بے فکری کے اس عہد زرّیں کی یاد دلوں میں اضطراب پیدا کر رہی تھی۔

اس مرتبہ جلسہ کی صدارت مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے قبول فرمائی تھی، ان کی شہرت نے جلسہ کی شہرت میں اضافہ کر دیا تھا اور ان کی ذات کی کشش نے آنے والوں کے لئے جلسہ میں اور سامان کشش پیدا کر دیا تھا جو لوگ ان سے واقف تھے وہ بھی اور جو ناواقف تھے وہ بھی جلسہ میں ایک خاص قسم کی گیرائی محسوس کرتے تھے، غرضکہ ملک کی موجودہ پریشانیوں کے باوجود ندوی دوستوں اور ندوہ کے قدیم طالبعلموں کی خاص تعداد جمع ہو گئی، باہر سے صاحب صدر کے علاوہ مولانا سید سلیمان صاحب، مولانا عبدالماجد صاحب مولانا نہال احمد صاحب، مولانا ضیاء اللہ صاحب، مولانا محمد یٰسین صاحب، مولانا محمد فضیل صاحب اور مولانا راشد علی صاحب آگئے تھے، تلاوت اور نظم خوانی سے جلسہ کا آغاز ہوا، مولانا کلیم احمد صاحب صدر مجلس استقبالیہ ایک اتفاقی ضرورت کی وجہ سے جلسہ میں نہ آسکے تھے اسلئے قاری محمد منیر صاحب ندوی ناظم مجلس استقبالیہ نے جلسہ کی کارروائی کا آغاز کیا مولوی محمد انور صاحب ندوی نے خطبہ استقبالیہ پڑھ کر

سنایا پھر معذرت کے خطوط پڑھے گئے، اس کے بعد صدر اجلاس مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنا خطبہ پڑھا جسے حاضرین نے شوق و دلچسپی سے سنا۔ اس کے بعد حاجی معین الدین صاحب ندوی پرنسپل شمس الہدیٰ پٹنہ اور مولوی اظہار الحق ندوی کے انتقال پر ہمدردی اور دعائے مغفرت کی تجویز منظور ہوئی۔

دوسری نشست میں مسودہ قانون بحث و ترمیم کے بعد منظور ہوا جو مولانا حفاظت علی صاحب ندوی صدر مجلس قانون ساز کی جانب سے پیش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد انتخابی کارروائی شروع ہوئی اور نئی مجلس منتظمہ کے لئے ۲۵ ارکان کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس مجلس کی صدارت کے لئے جلسہ عام نے مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندوی کو منتخب کیا، پھر مجلس منتظمہ نے نیابت صدارت کے لئے مفتی محمد سعید صاحب اور حکیم عبدالباقی صاحب نظامت کے لئے مولوی حامد علی صاحب، نیابت نظامت کے لئے مولوی محمد انور صاحب اور مالیات کے لئے قاری محمد منیر صاحب کو منتخب کیا۔ اس سلسلہ میں فوری مشورہ کی ضرورت سے دس ارکان پر مشتمل ایک مجلس کی تشکیل بھی عمل میں آئی۔

ان باضابطہ جلسوں کے علاوہ دوستوں کی بے تکلف صحبتیں اس اجتماع کی جان تھیں، طلبا ءِ جدید سے بھی بات چیت اور ملنے جلنے کا کافی موقع ملا، اس سلسلہ میں ہاکی اور والی بال کے میچ اور بزم ادب و مشاعرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ گو میدان چھوٹے بھائیوں کے ہاتھ رہا لیکن کھیل میں پرانے ندویوں نے کمال فن کے نمونے دکھائے جنہیں مولوی نہال احمد صاحب ندوی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو میچ کی ساری رونق انھیں کے دم سے تھی۔

النادی العربی کا کل ہند مباحثہ ۱۸ مارچ کو ہوا، ملک کے موجودہ اضطراب انگیز حالات کی بنا پر اس مرتبہ جلسہ میں گذشتہ سال کا سا اجتماع نہ ہو سکا تاہم کچھ نہ کچھ مجمع ہو ہی گیا تھا، مقابلہ میں دارالعلوم کے طلبہ اول آئے اور عبدالحلیم و محمد صابر کو حسن خطابت کے تمغے ملے لیکن میزبان ہونے کی وجہ سے ٹرافی حسب معمول ندوہ نے نہیں لی۔ مدرسہ اشاعت العلوم بریلی کو دی جس کے طالب علم محمد حامد شاہجہانپوری اس مقابلہ میں دوم آئے تھے۔

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابوالحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبدالسلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیر نگرانی

علّامہ سیّد سلیمان ندوی مدظلہٗ

جلد ۳ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ مطابق اپریل ۱۹۴۲ء نمبر ۴

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے عام

تمام خط وکتابت اور ترسیل زر منیجر رسالۂ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

امسال ۲۰، ۲۱، ۲۲، مارچ کو جمعیۃ العلماء کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں چند ایسی تجویزیں منظور ہوئیں جو اگر بروئے کار آگئیں تو ہندوستان میں اسلامی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا اور جماعتی حیثیت سے مسلمان ایک نئے ولولے نئے جوش اور نئی قوت سے آگے بڑھیں گے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے ضعف و بیچارگی کا سب سے بڑا سبب ان کا باہمی اختلاف ہے یہ مرض انھیں روز بروز کمزور کرتا چلا جا رہا ہے۔ یہ اختلافات یوں تو زندگی کی ہر راہ اور راہ کی ہر موڑ پر ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو سا ری فروعی نزاعیں چند بنیادی اختلافات کا نتیجہ ہیں جنھیں اگر متعین کیا جائے تو سیاست مذہب اور نسل کے دائروں میں محدود نظر آئیں گے۔ آپ مخالفت کے سارے ہنگاموں پر نظر ڈالیں تو ظاہر ہو جائے گا کہ ان کا تعلق انھیں تین بنیادی مسائل سے ہے۔

جمعیۃ العلماء نے لاہور کے اجلاس میں انھیں مسائل کی طرف توجہ کی ہے اور اخلاق و رواداری سے ان پیچیدگیوں کو حل کرنے کی کوشش کی ہے سیاسی انتشار کو دور کرنے کے لئے یہ راہ نکالی ہے کہ تمام جماعتوں کے رہنماؤں کو دعوت دی جائے کہ وہ کسی جگہ جمع ہو کر پورے غور و فکر کے بعد خوب سوچ سمجھ کر مسلمانوں کا ایک نصب العین متعین کرلیں تاکہ بنیادی طور پر ان کے سامنے ایک مقصد حیات اور معیار عمل آجائے، پھر انھیں اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی فہم و بصیرت کے مطابق اس مقصد و معیار کی روشنی میں اپنے لئے لائحہ عمل متعین کریں نسلی اختلافات شریف و رذیل کے تفرقہ کو دور کرنے کے لئے بھی ایک تجویز منظور ہوئی ہے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، عقائد و اعمال کے بنیادی مسائل میں تمام مسلمان متفق ہیں۔ اختلاف صرف جزئیات و فروعیات

میں ہے اور یہ اختلاف آج سے نہیں بلکہ آغاز اسلام ہی سے چلا آرہا ہے صحابہ کرامؓ، تابعین عظام اور ائمہ مجتہدین جزئی مسائل میں مختلف الرائے تھے۔ ہر شخص کتاب و سنت کی روشنی میں مسائل مستنبط کرتا تھا اور آزادی کے ساتھ اُن پر عمل کرتا تھا۔ لیکن دور انحطاط میں یہی فروعات مرکز بحث بن گئے۔ بحث نے جدال و قتال کا رنگ اختیار کیا اور دین واحد کے پیرو سیکڑوں فرقوں میں بٹ گئے اور ایک اُمت بیسیوں گروہ میں تقسیم ہو گئی۔

اس صورت حال نے دردمند دلوں کو مدت سے بے چین کر رکھا ہے۔ ۱۳۱۱ھ میں ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا تو رفع نزاع باہمی اسکا ایک اہم مقصد قرار پایا، گذشتہ پچاس برس سے ندوہ کے پلیٹ فارم سے یہ صدا برابر بلند کی جا رہی ہے، اس اثناء میں مشکل سے کوئی اجلاس ایسا ہوا ہو گا جسمیں اس مسئلہ پر توجہ نہ کی گئی ہو، ندوہ کے ارکان نے اس سلسلہ میں صرف تقریروں اور تحریروں ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اتحاد و رواداری کی عملی مثالیں قائم کیں۔ ندوہ کے جلسے مختلف الخیال علماء کے اتحاد کے مظہر اور اس کا پلیٹ فارم فریقین کے اجتماع کا مرکز رہا ہے۔ آج بھی اسکی مجلس حنفی و شافعی مقلد و غیر مقلد اور قدیم و جدید کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہے۔

جمعیۃ العلماء کے تازہ اجلاس میں اسی رواداری برتاؤ کی جانب توجہ دلائی گئی ہے اور مسلمانوں سے درخواست کی گئی ہے کہ "وہ وقت کی نزاکت اور باہمی افتراق و انشقاق کی ہلاکت خیزی اور اس کے عواقب و نتائج مشئومہ کا پورا پورا احساس کریں"۔ ان مختلف فیہ مسائل میں جو دور اول یعنی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین وائمہ مجتہدین کے زمانہ سے مختلف فیہ چلے آتے ہیں باہم دست و گریباں نہ ہوں اپنے عقیدہ کے موافق عمل کرتے ہوئے دوسرے خیال کے مسلمانوں پر زبان طعن دراز نہ کریں۔ (بقیہ صفحہ ۴)

اعیان و ارکان ندوہ

مولانا شاہ حافظ سید تجمل حسین صاحب دیسنوی بہاری

(از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی)

منجملہ ان بزرگوں کے جو ندوۃ العلماء کے ابتدائی اراکین تھے، ایک قابل ذکر ہستی
مولانا شاہ حافظ سید تجمل حسین صاحب بہاری کی ہے جن کا ذکر الندوہ میں کئی بار ضمناً آچکا ہے
گو اب اکثر لوگ ان کو بھول گئے ہوں گے تاہم خاندان سید کا فرض ہے کہ اسلاف کرام کے ناموں اور
کارناموں کو محفوظ رکھیں نام نیک رفتگاں ضائع مکن (س)

نام و نسب وطن و پیدائش تجمل حسین نام، والد کا نام میر صابر حسین بن میر حسین بخش بن میر منیر بخش
بن سید حبیب علی بن میر محمد شیر بن حضرت میر صدر الدین رضوی مشہدی تیسویں پشت پر یہ سلسلہ امام ہمام حسین علیہ السلام
تک پہونچتا ہے

وطن بہار کے قریب دیسنہ نام ایک مردم خیز قریہ ہے۔ مورث اعلیٰ حضرت میر صدر الدین غالباً فرخ سیر کے
زمانہ میں مشہد سے آکر اس قریہ میں مقیم ہوئے تھے اور شاہ وقت سے کچھ جاگیر پائی تھی جو ائمہ کے نام سے مشہور ہے۔
اس قریہ کے اکثر سادات انھیں بزرگ کی اولاد ہیں۔

شاہ صاحب ۱۲۶۲ھ میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ خاندان کے دو بزرگوں
حکیم سید محب الحق صاحب[1] اور مولانا محمد یعقوب صاحب[2] نے ان کی پرورش کی اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا
حق ادا کیا، پہلے قرآن پاک حفظ کیا پھر فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں حسب دستور زمانہ پڑھیں۔

---

[1] مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی کے پرنانا عربی تعلیم بنارس میں اور طب کی تعلیم دلی میں پائی، بڑے حاذق طبیب تھے ٹیابرج کلکتہ
میں واجد علی شاہ کی سرکار سے بھی تعلق رہا

[2] اپنے زمانہ کے مشہور عالم مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری (جد مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب جونپوری) کے شاگرد رشید تھے
فرنگی محل تک کے مدرسین میں ان کی دھوم تھی۔

تعلیم و تکمیل کے لئے سفر جس زمانے میں انھوں نے آنکھیں کھولیں، ہندوستان کی شہنشاہی انگریزوں کے ہاتھوں میں جا رہی تھی۔ بہار و بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج تھا، اسوقت ریل کلکتہ سے لیکر مغل سرائے تک چلتی تھی، گھر سے نجیبا بیونٹ تک جو ان کے قریہ کا سب سے قریب ایسٹ انڈیا ریلوے کا اسٹیشن اور جو ان کے گھر سے ۳۰ میل دور تھا، اس شان سے پیادہ پا نکلے کہ جیب میں صرف چند ٹکے پیسے تھے، کتابوں کا پشتارہ کمر سے بندھا تھا، کچھ پھٹے پرانے کپڑوں کی گٹھری بغل میں تھی۔

ریل پر چڑھ کر مغل سرائے پہونچے، اکّے پر بیٹھ کر بنارس کے اس پار اترے اور پھر پیادہ چل کر جونپور آئے، اور پھر لکھنؤ میں فرنگی محل کو دیکھ کر آگے بڑھے بریلی، رامپور ہوکر سہارنپور تک پہونچے۔

اساتذہ ان کے اساتذہ میں پہلا نام مولانا لطف علی بہاری کا ملتا ہے، معلوم نہیں اُن سے کہاں پڑھا اس نے معقولات کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ جونپور میں مدرسہ امام بخش میں مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب رامپوری شاگرد رشید مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی سے پڑھا۔ لکھنؤ میں مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے درس میں کچھ دن رُکے، رامپور میں مولانا عبدالعلی صاحب رامپوری مشہور ریاضی داں و معقولی، مولانا سعداللہ صاحب رامپوری اور مولانا ارشاد حسین صاحب مجدّدی مشہور فقیہ سے کتابیں پڑھیں۔ بریلی میں مولانا ہدایت علی صاحب شاگرد مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی و استاذ مولانا فضل حق رامپوری سے معقولات اور سہارنپور میں مولانا مظہر صاحب سہارنپوری (بانی مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور) سے تفسیر اور مشہور محدث مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری (شاگرد مولانا شاہ اسحاق صاحب دہلوی) سے حدیث پڑھی، حدیث کی دوسری سند مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی (شاگرد و خلیفہ مولانا شاہ آفاق صاحب دہلوی) سے حاصل کی۔

ہمدرس رفقاء شاہ صاحب کے ہمدرس رفقاء میں مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی اور مولانا شبلی نعمانی کے نام معلوم ہیں، اور ان دونوں کے قصے انکی زبان سے سنے ہیں۔ سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے

لہ موجودہ نواب سر محمد یوسف کے پردادا

درس میں تینوں یکجا تھے، مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی اور مولانا شبلی دونوں معقولات کے مرد میدان تھے مفتی صاحب گو اصلاً بہاری تھے، مگر سکونت ٹونک کی مشہور ہوگئی تھی، اسلئے "وہ بچھا ہیں" طالب علموں کے ہیرو تھے، اور مولانا شبلی پورب کے تھے، اسلئے پوربی طالبعلموں کے پہلوان تھے، ان دونوں پہلوانوں کا دنگل سہارنپور کی جامع مسجد میں ہوا، موضوع بحث معلوم نہیں، آخر مناظرہ نے مجادلہ کی صورت اختیار کی اور مجادلہ مضاربہ تک پہونچا۔

مولانا شبلی مرحوم جب دارالعلوم کے معتمد تھے اور گولہ گنج میں مرشد آباد والے مکان میں رہتے تھے شاہ صاحب اُن سے ملنے گئے، راقم بھی طالبعلمانہ موجود تھا، مدت کے بعد ملاقات ہوئی تھی، زمانۂ طالب علمی کے بہت سے پرلطف حوالہ طلب باتیں تھیں گفتگوئیں رہیں، مولانا شبلی نے فرمایا کہ آپ میرے شاگرد ہیں، میں نے آپ کو منطق پڑھائی ہے، شاہ صاحب نے فرمایا تم منطق پڑھاتے تھے کہ ہم لوگوں کو نیز اخفش بنا کر اپنی منطق صاف کرتے تھے۔ پھر شاہ صاحب نے فرمایا، وہ یاد نہیں کہ مناظرہ کے بعد جامع مسجد سے جو ہم تمکو گلی گلی باہر نکال لائے تھے۔

مولانا شبلی کے مکاتیب فارسی میں ایک خط کا فقرہ یہ ہے

"اگر کسے بہ جونپور رود ظرف مسی کہ در راہ حج می داشتم واکنوں غالباً بر مکان خواہد بود بیاد بسپرد گوید کہ در مدرسۂ مولوی ہدایت اللہ خاں صاحب بہ طالب العلم حافظ تجمل حسین صاحب بدہد و گوید کہ ایں را شبلی از مولوی بشارت کریم صاحب استفادہ طلب کردہ بود اکنوں حوالۂ جناب است کہ بذریعۂ آنجناب بہ مولوی بشارت صاحب خواہد رسید۔ (مکاتیب شبلی ۲ نامۂ فارسی ۲)

اس تجمل حسین سے مراد یہی شاہ تجمل حسین صاحب ہیں، اُس زمانہ میں دونوں مولانا احمد علی صاحب کی درسگاہ میں حدیث پڑھ رہے تھے۔ یہیں سے مولانا شبلی اپنے والد کے پاس جو حج کے ارادہ سے بمبئی پہونچ چکے تھے بمبئی روانہ ہوگئے، شاید لوٹا ساتھ نہ تھا، شاہ صاحب کا لوٹا لیگئے، اور جب وہ واپس ہوئے تو شاہ صاحب جونپور میں مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب کے مدرسہ میں تھے۔

سند فراغ شاہ صاحب نے مولانا احمد علی صاحب کی درسگاہ سے جمادی الاخری ۱۲۹۵ھ میں سند فراغ حاصل کی

یہ سند اُن کے صاحبزادے کے پاس موجود ہے جس کی نقل تبرکاً یہاں نقل کی جاتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین، اما بعد فیقول العبد

الضعیف الراجی رحمۃ ربہ القوی احمد علی السہارنفوری عفی عنہ ان المولوی السید تجمل حسین

بن السید صابر حسین دسنوی العظیم آبادی قد عرض علی الصحیحین للبخاری ومسلم رحمہما اللہ تعالیٰ

قرأۃ وسماعۃ وانا عرضہا علی الشیخ الشہیر فی الآفاق مولانا الاعظم المولوی محمد اسحٰق الدہلوی

قدس سرہٗ ......[1] ...... وانا اجیز السید تجمل حسین ......[1] ......

...... المعتبرۃ عند اہل الحدیث

وبالمراجعۃ الی الشروح وغیرہ عند الحاجۃ واوصیہ بتقوی اللہ فی السر والعلانیۃ

واللہ المستعان وعلیہ التکلان وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین حرر ۱۲۹۵ہجری

فی شہر جمادی الاخریٰ

احمد علی کل حال

بزرگانِ دین کی صحبت اور بیعت شاہ صاحب ہمیشہ سے نہایت نیک متقی اور پرہیزگار تھے۔ بزرگوں ہی کی صحبت میں اپنی ساری عمر گذار دی۔ اس زمانہ میں علماء کے سب سے بڑے روحانی مرکز حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو حضرت مولانا شاہ محمد آفاق صاحب قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے، شاہ صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے طریقۂ نقشبندیہ میں مُرید ہوئے اور تقریباً ۲۵ برس تک اُن کے روحانی فیض سے سیراب رہے۔

حضرت شاہ فضل رحمان صاحب قدس سرہٗ کے وصال کے بعد حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند دہلوی سے طریقۂ قادریہ میں ارشاد حاصل کیا۔ حضرت خواجہ صاحب بھی حضرت شاہ محمد آفاق رحمۃ اللہ علیہ کے مُرید وخلیفہ

---

[1] کرم خوردہ

یعنی حضرت شاہ فضل رحمان صاحب قدس سرہٗ کے پیر بھائی تھے اور جادرہ میں رہتے تھے۔

حج کے لئے جب مکہ معظمہ گئے تو اُس وقت کے شیخ الکل حضرت مولانا حاجی شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے طریقہ چشتیہ میں ارشاد حاصل کیا اور مثنوی مولانائے رومؒ جس کے حضرت حاجی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ وقت کے امام تھے، حضرت سے پڑھکر اسکی سند حاصل کی، اس درس مثنوی میں شاہ صاحب کے ساتھ مولانا انوار اللہ خاں صاحب سابق صدر الصدر حیدرآباد بھی رفیق تھے، اس سند کی نقل بھی تبرکاً یہاں ثبت کی جاتی ہے۔

عنایت نامہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ

۱۳۰۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم اما بعد الحمد والصلوٰۃ فقیر حقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ کہ عزیزم مولوی تجمل حسین سلمہٗ با فقیر نسبت ارادت و محبت بدلی و طالب صادق نام حق تعالیٰ ہستند لہذا اجازت اذکار و اشغال کہ فقیر را از بزرگان سلسلہ رسیدہ عام اجازت دادم امید قبولیت از فیاض کہ باشتغال این ہا مطلب خواہند رسید و نیز مولانا روم صاحب مثنوی معنوی مولانا رومی قدس سرہٗ نسبتے و ربطے دارند و بیش فقیر چیزے چیزے درس کردہ اند انشاء اللہ تعالیٰ از فیضان و برکات آنہا محروم نخواہند۔

ھو الولی التوفیق و بہٖ نستعین ۱۲

فقیر امداد اللہ چشتی

حضرت حاجی صاحب کے دونوں خلیفہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی (بانی مدرسۂ دیوبند) اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی علیہ الرحمۃ سے بھی انھوں نے روحانی فیض اُٹھایا اور تصوف کے بہت سے دقائق ان بزرگوں سے سیکھے، اسی سلسلہ میں مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی اور مولانا محمد یعقوب صاحب اولین مدرس مدرسۂ دیوبند سے بھی اُن کی صحبتیں رہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب ادام اللہ فیوضہ نے اپنے لکھنؤ کے ملفوظات میں

حضرت شاہ صاحب کا بہت دلچسپ تذکرہ کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں فرمایا، مولوی سلیمان صاحب مثنوی خوب پڑھتے تھے، اور لوگ زیادہ اسی شوق میں ان کے وعظ میں بیٹھتے تھے، ان کا طرز ادا دونوں چیزیں بہت اچھی تھیں۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کہ مولانا شاہ تجمل حسین صاحب مولانا شاہ فضل رحمان صاحب علیہ الرحمہ کے خادموں میں بڑے ہو ظریف تھے، وہ ہر چیز کی رجسٹری کیا کرتے تھے۔ ایک بار فرمانے لگے کہ میں مولانا احمد حسن صاحب امروہوی کے تو حسن کی رجسٹری کرتا ہوں اور مولوی سلیمان صاحب کی خوش آوازی کی۔"

(۲۳) انھیں شاہ تجمل حسین صاحب کے متعلق فرمایا کہ صاحب ذوق و شوق تھے۔ ایک روز مکہ مکرمہ میں شافعی امام کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی۔ اکثر شافعی امام خوش الحان تھے، لمبی لمبی سورتیں پڑھا کرتے تھے جس سے ذوق و شوق میں ترقی ہو جاتی تھی، امام نے اپنے مذہب کے موافق دوسری رکعت میں رکوع کے بعد ہاتھ اُٹھا کر اللّٰھم اھدنی فمن ھدیت الخ پڑھا، مقتدی سب آمین کہہ رہے تھے اس منظر کو دیکھ کر ان کو بھی جوش ہوا، دعائے قنوت تو یاد نہ تھی آپنے بھی ہاتھ اُٹھا کر یہ دُعا مانگنا شروع کیا ؎

پادشاہا جرم ما را در گذار ما گنہگاریم و تو آمرزگار

یہ طویل مناجات ہو شیخ فرید عطارؒ کی، عرب لوگ تو خاموش رہے، مگر ہندیوں نے بڑا شور مچایا یہ نماز میں تم نے کیا پڑھا، نماز کہاں رہی، حضرت حاجی صاحب نے بھی سنا تو ہنسنے لگے مگر کچھ فرمایا نہیں، دیکھو حضرت کی فقہ کی ایسی جزئیات پر نظر تھی مگر کیا وہی جو فقہا کا فتویٰ ہو یعنی نماز میں غیر عربی زبان میں دعا ناجائز ہو مگر اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی باقی ناجائز فعل پر نکیر کیوں نہیں فرمایا تو اُسکی وجہ یہ ہو کہ حضرت کو انکے غلبۂ حال پر نظر تھی، یہی شاہ تجمل حسین صاحب کہا کرتے تھے کہ میں حضرت کا قوال ہوں غالباً حضرت ان سے مثنوی سنتے تھے

صوبۂ بہار کے بزرگوں میں سے حضرت شاہ ولایت علی صاحب اسلام پوری سے بھی روحانی تعلقات تھے اور بہار میں حضرت شاہ امین احمد صاحب سجادہ نشین مخدوم الملک شاہ شرف الدین بہاری سے اُن کے مراسم تھے۔

مولوی سید محمد علی صاحب (سابق ناظم ندوۃ العلماء) خلیفۂ شاہ فضل رحمان صاحب سے اُن کے تعلقات خصوصیت سے جو بعد کو مونگیر میں قیام فرما ہو گئے تھے قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے دل سے معترف تھے اور بہار میں اُن کے سلسلہ کو جو خاص وسعت حاصل ہوئی اُس کا ایک سبب شاہ صاحب ہی کی کشش تھی۔

بھوپال کے زمانۂ قیام میں خانقاہ رونی مجددی کے سجادہ نشین حضرت شاہ ابو احمد صاحب مجددی جو نسلاً اور نسبتاً بھی مجددی تھے اور وقت کے کامل شیوخ میں تھے، اُن کے تعلقات دوستانہ تھے اور دونوں میں بڑی محبت تھی۔

مشاغل شاہ صاحب تعلیم سے فراغت پاکر کچھ دنوں دہلی کے ایک مدرسہ میں جسمیں مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی بھی درس دیتے تھے مدرس ہوئے، مگر اسمیں اُن کا جی نہ لگا تو کوئی چھوٹی سی تجارت شروع کی، لیکن اسمیں ان کو کامیابی نہیں ہوئی، تو پھر مدرسی کی طرف رجوع کیا، لیکن اس دفعہ مغرب کے بجائے مشرق میں صوبۂ بہار کے شہر مونگیر میں دلاور پور کے محلہ میں شاہ صاحبوں کا ایک خوشحال گھرانا ہے جس کو علم تہذیب، سلیقہ، دولت اور دنیاوی جاہ و اعزاز اور مناصب میں کافی حصہ ملا ہے۔ شاہ صاحب نے اس گھر میں دس برس بسر کئے۔ بظاہر کچھ لڑکوں کی تعلیم کا بہانہ تھا، مگر درحقیقت اس خاندان کے بزرگوں کے ساتھ اُن کے مراسم ایک بزرگ اور ایک مرشد کی حیثیت کے تھے۔ جناب شاہ محمد صاحب، شاہ محمد یعقوب صاحب، شاہ احمد سعید صاحب، شاہ عبداللطیف، اور شاہ محمد خلیل صاحب نیک صفات لوگ تھے، جنکی قدر شناسی اور خدمت سے شاہ صاحب جیسے بے نیاز اور بے پروا بزرگ اتنے زمانہ تک وہاں رہ سکے۔

بھوپال کا قیام شیش محل میں غالباً سنہ ۱۳۰۱ھ کے پس و پیش زمانہ سے اُن کا قیام بھوپال میں شروع ہوا، اسکی صورت یہ ہوئی کہ جناب منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کے والد بزرگوار جناب منشی محمد امتیاز علی صاحب جو اُسوقت اودھ کے نامور وکیل اور اس زمانہ کے ممتاز اشخاص میں تھے وہ حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادیؒ کے عقیدتمندوں میں تھے منشی صاحب جب بھوپال

میں وزیر مقرر ہوئے تو مولانا نانے اُن کی صحبت کے لئے جناب شاہ صاحب کا انتخاب فرمایا، وزیر صاحب کو لکھا کہ شاہ تجمل حسین صاحب جاتے ہیں ان کو آپ میرا قائم مقام تصور کریں، وزیر صاحب نے شاہ صاحب کو قدر کے ہاتھوں سے لیا اور عقیدت کی آنکھوں سے دیکھا اور اُن کا ایک معقول وظیفہ مقرر کردیا۔ یہ وظیفہ قیام بھوپال کے ساتھ مشروط نہ تھا چنانچہ کبھی ایسا ہوتا کہ سال دو سال کے بعد وہ بھوپال گئے مگر وظیفہ جاری رہا۔

شاہ صاحب جب بھوپال میں رہتے تو وزیر صاحب ہی کے محل میں جو شیش محل کے نام کے مشہور تھا قیام رہتا، وزیر صاحب کو جب ریاست کے کاموں سے فرصت ہوتی تو یہ ملاقات کے کمرہ میں جہاں ریاست کا ارکان اور عمائد بیٹھے ہوتے تشریف لیجاتے اور دلچسپ گفتگو میں طرح طرح سے لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے۔ گفتگو بڑی ظریفانہ ہوتی، اور اسی ظرافت کے پردہ میں ہر قسم کی نصیحت کرجاتے تھے، کبھی بزرگوں کے واقعات، کبھی تصوف کے نکات کبھی مذہبی مسائل کبھی مولوی رومؒ کی مثنوی اور کبھی حقیقت و معرفت کے دوسرے اشعار بہت اچھے لہجے میں پڑھتے تھے، حاضرین محظوظ اور مستفید ہوتے۔

کبھی مجلس خاص ہوتی تو وزیر صاحب کے خاص کمرے میں جاکر اُن کو ذکر و اوراد کی تعلیم دیتے۔ وزیر صاحب کی طبیعت کبھی دنیا کے کاموں سے گھبرا جاتی تو وہ خود شاہ صاحب کو بلا لیتے اور دینی تذکروں سے دل بہلاتے۔

وزیر صاحب جس درجہ اُن کا اعزاز کرتے تھے اسکی ایک مثال یہ ہے کہ گو شاہ صاحب کی ایک درویشانہ شان تھی، تاہم جب شہر میں اُن کی سواری نکلتی تو ایک مسلح پہرا اُن کی سواری کے ساتھ رہتا اکثر اہلِ حاجت اُن کو اپنی سفارشوں کا ذریعہ بناتے۔ وہ باتوں باتوں میں بزرگوں کے تذکروں اور رحم و کرم اور عدل و انصاف کے فضائل کے سلسلوں میں ان حاجتمندوں کا کام نکال دیتے تھے۔

وزیر صاحب کے علاوہ ریاست کے دوسرے عمائد اور ارکان بھی اُن سے عقیدت رکھتے تھے، اہلِ شہر میں بھی ان کو مقبولیت تھی، علما اور صوفیہ بھی اُن کی قدر و منزلت کرتے تھے، علما اور صلحا کو خاص طور سے

مولوی سید محمد علی صاحب (سابق ناظم ندوۃ العلماء) خلیفہ شاہ فضل رحمان صاحب سے اُن کے تعلقات خصوصیت سے جو بعد کو مونگیر میں قیام فرما ہو گئے تھے قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے دل سے معترف تھے اور بہار میں اُن کے سلسلہ کو جو خاص وسعت حاصل ہوئی اُس کا ایک سبب شاہ صاحب ہی کی کشش تھی۔

بھوپال کے زمانۂ قیام میں خانقاہ رونی مجددی کے سجادہ نشین حضرت شاہ ابو احمد صاحب مجددی جو نسلاً اور نسبتاً بھی مجددی تھے اور وقت کے کامل شیوخ میں تھے، اُن کے تعلقات دوستانہ تھے اور دونوں میں بڑی محبت تھی۔

مشاغل شاہ صاحب تعلیم سے فراغت پاکر کچھ دنوں دہلی کے ایک مدرسہ میں جسمیں مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی بھی درس دیتے تھے مدرس ہوئے، مگر اسمیں اُن کا جی نہ لگا تو کوئی چھوٹی سی تجارت شروع کی، لیکن اسمیں ان کو کامیابی نہیں ہوئی، تو پھر مدرسی کی طرف رجوع کیا، لیکن اس دفعہ مغرب کے بجائے مشرق میں صوبۂ بہار کے شہر مونگیر میں دلاور پور کے محلہ میں شاہ صاحبوں کا ایک خوشحال گھرانا ہے جس کو علم تہذیب، سلیقہ، دولت اور دنیاوی جاہ و اعزاز اور مناصب میں کافی حصہ ملا ہے۔ شاہ صاحب نے اس گھر میں دس برس بسر کئے۔ بظاہر کچھ لڑکوں کی تعلیم کا بہانہ تھا، مگر درحقیقت اس خاندان کے بزرگوں کے ساتھ اُن کے مراسم ایک بزرگ اور ایک مرشد کی حیثیت کے تھے۔ جناب شاہ محمد صاحب، شاہ محمد یعقوب صاحب، شاہ احمد سعید صاحب، شاہ عبداللطیف اور شاہ محمد خلیل صاحب نیک صفات لوگ تھے، جنکی قدر شناسی اور خدمت سے شاہ صاحب جیسے بے نیاز اور بے پروا بزرگ اتنے زمانہ تک وہاں رہ سکے۔

بھوپال کا قیام شیش محل میں غالباً ۱۳۱۰ھ کے پس و پیش زمانہ سے اُن کا قیام بھوپال میں شروع ہوا، اسکی صورت یہ ہوئی کہ جناب منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کے والد بزرگوار جناب منشی محمد امتیاز علی صاحب جو اُسوقت اودھ کے نامور وکیل اور اس زمانہ کے ممتاز اشخاص میں تھے وہ حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادیؒ کے عقیدتمندوں میں تھے منشی صاحب جب بھوپال

میں وزیر مقرر ہوئے تو مولانا نے اُن کی صحبت کے لئے جناب شاہ صاحب کا انتخاب فرمایا، وزیر صاحب کو لکھا کہ شاہ تجمل حسین صاحب جاتے ہیں ان کو آپ میرا قائم مقام تصور کریں، وزیر صاحب نے شاہ صاحب کو قدر کے ہاتھوں سے لیا اور عقیدت کی آنکھوں سے دیکھا اور اُن کا ایک معقول وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ وظیفہ قیام بھوپال کے ساتھ مشروط نہ تھا چنانچہ کبھی ایسا ہوتا کہ سال دو سال کے بعد وہ بھوپال گئے، مگر وظیفہ جاری رہا۔

شاہ صاحب جب بھوپال میں رہتے تو وزیر صاحب ہی کے محل میں جو شیش محل کے نام سے مشہور تھا قیام رہتا، وزیر صاحب کو جب ریاست کے کاموں سے فرصت ہوتی تو یہ ملاقات کے کمرہ میں جہاں ریاست کا ارکان اور عمائد بیٹھے ہوتے تشریف لیجاتے اور دلچسپ گفتگو میں طرح طرح سے لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے۔ گفتگو بڑی ظریفانہ ہوتی، اور اسی ظرافت کے پردہ میں ہر قسم کی نصیحت کر جاتے تھے، کبھی بزرگوں کے واقعات، کبھی تصوف کے نکات کبھی مذہبی مسائل، کبھی مولوی روم کی مثنوی اور کبھی حقیقت و معرفت کے دوسرے اشعار بہت اچھے لہجے میں پڑھتے تھے، حاضرین محظوظ اور مستفید ہوتے۔

کبھی مجلس خاص ہوتی تو وزیر صاحب کے خاص کمرے میں جا کر اُن کو ذکر و اوراد کی تعلیم دیتے۔ وزیر صاحب کی طبیعت کبھی دنیا کے کاموں سے گھبرا جاتی تو وہ خود شاہ صاحب کو بلا لیتے اور دینی تذکروں سے دل بہلاتے۔

وزیر صاحب جس درجہ اُن کا اعزاز کرتے تھے اسکی ایک مثال یہ ہے کہ گو شاہ صاحب کی ایک درویشانہ شان تھی، تاہم جب شہر میں اُن کی سواری نکلتی تو ایک مسلح پہرہ اُن کی سواری کے ساتھ رہتا اکثر اہلِ حاجت اُن کو اپنی سفارشوں کا ذریعہ بناتے۔ وہ باتوں باتوں میں بزرگوں کے تذکروں اور رحم و کرم اور عدل و انصاف کے فضائل کے سلسلوں میں ان حاجتمندوں کا کام نکال دیتے تھے۔

وزیر صاحب کے علاوہ ریاست کے دوسرے عمائد و ارکان بھی اُن سے عقیدت رکھتے تھے اہلِ شہر میں بھی ان کو مقبولیت تھی، علما اور صوفیہ بھی اُن کی قدر و منزلت کرتے تھے، علما اور صلحا کو خاص طور سے

اُن سے محبت تھی۔

نور محل میں وزیر صاحب کے انتقال کے بعد جب اُن کے متوسلین کا شیرازہ بکھرا تو شاہ صاحب کو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے بڑے صاحبزادے نواب نور الحسن خاں صاحب جو ایک صوفی منش علم دوست رئیس تھے اور مولانا شاہ فضلِ رحماں صاحب گنج مرادآبادی کے مُرید و عقیدتمند تھے، ان کو اپنے پاس نور محل میں لے گئے۔ اس زمانے میں حضرت قطب العالم مولانا شاہ فضل رحماں صاحب نے وصال فرمایا۔ شاہ صاحب نے نور محل ہی میں بیٹھ کر نواب نور الحسن خاں ہی کی فرمائش سے اپنی کتاب فضل رحمانی لکھی۔ جسمیں حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کے حالات، کرامات اور تعلیمات کو قلمبند فرمایا، نواب صاحب نے اس کتاب کو خود چھپوایا اور بکثرت تقسیم کیا۔

نواب شاہجہاں بیگم کی وفات کے بعد جب نواب صدیق حسن خاں کے خاندان کے لوگ بھوپال سے شاید ۱۹۰۲ء میں لکھنؤ آگئے تو شاہ صاحب اُن کی وجہ سے اکثر لکھنؤ آتے اور وہ مہینوں اُن کو روک روک کر رکھتے اور اُن کی باتوں سے مستفید اور محظوظ ہوتے۔

ندوۃ العلماء اور دار العلوم ندوہ لکھنؤ میں یہ سب کو معلوم ہو کہ ندوۃ العلماء کے ساتھ مولانا شاہ فضل رحماں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تمام عقیدتمندوں کو یکساں عقیدت تھی، اُن کے خلیفۂ خاص مولانا سید محمد علی صاحب اس کے ناظم اول تھے، اور دوسرے ارکان و داعیان ندوہ بھی گنج مرادآباد کے متوسلین میں تھے، انہیں ہمارے شاہ صاحب بھی تھے۔ چنانچہ وہ ندوہ کے اولین اجلاسوں میں برابر شریک رہے۔ کانپور کے سب سے پہلے اجلاس میں بھی تھے۔ پٹنہ کے ساتویں اجلاس میں جو ۱۹۰۰ء میں ہوا تھا وہ بھی علماء و مشائخ کی صف میں تشریف رکھتے تھے۔

اس کے بعد مولانا محمد علی مرحوم کے اخیر زمانۂ نظامت میں ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء میں وہ پہلے دار العلوم کی تعمیرات کی دیکھ بھال کرنے لگے تھے۔ شاہ صاحب اگرچہ ایسے بھولے بھالے آدمی تھے کہ ہر شخص

اُن کو آسانی سے دھوکا دے سکتا تھا مگر اُن کو تعمیر سے بڑی دلچسپی تھی اور معماروں اور مزدوروں کے ساتھ اپنے طریق پر نرمی اور انعام سے بڑے بڑے کام نکال لیتے تھے۔

اس کے بعد اسی زمانہ میں موصوف دار العلوم میں اتالیق مقرر ہوئے۔ اُس زمانہ میں دار العلوم گولہ گنج میں تھا، اُس میں دو وسیع ہال تھے جنمیں رات کو طلبہ بیٹھ کر دن کے سبق یاد کرتے اور مطالعہ دیکھتے تھے اور شاہ صاحب اُن کی نگرانی کرتے تھے۔

اسوقت خوب یارانِ باصفا جمع تھے۔ مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولانا شاہ تجمل حسین صاحب دسنوی، مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دار العلوم اور مولانا سید عبدالحی صاحب (اُسوقت) مددگار ناظم، انکی آپس میں بڑی بے تکلف باتیں ہوتیں، شاہ صاحب صوفیوں کی شراب یعنی چاء کے عادی تھے اور بڑے تکلف سے پیتے تھے، چاء کا دور چلتا، ہر قسم کے مسائل اور بزرگوں کے لطائف و حکایات کا تذکرہ ہوتا، اس بے تکلفی میں شاہ صاحب کو شاہ سلیمان صاحب تجو سائیں، اور وہ اُن کو سلّو سائیں کہتے تھے۔

شاہ صاحب دار العلوم کی اس خدمت پر شاید ایک سال رہے ہوں، اور یوں تو وہ جب لکھنؤ نواب نور الحسن خاں کے یہاں آکر رہا کرتے تو دار العلوم حیدر میں ایک بار اُن کا آنا ضرور تھا، اور نواب صاحب کے ہاں وہ آکر مہینوں رہتے تھے اور نواب صاحب اُن کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔

سفر حج شاہ صاحب نے تین حج کئے تھے اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا کہ وہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے مکۂ معظمہ میں جا کر مستفید ہوئے تھے۔

سیر و سیاحت ہندوستان میں بھی بزرگوں کی زیارت اور وعظ کے سلسلہ میں بہت سے شہروں میں گئے تھے، سفر اکثر وہ سکنڈ کلاس میں کرتے تھے، کبھی کبھی اُسی میں انگریز ملتے، تو اُن سے بھی بے تکلفی پیدا کر لیتے تھے، اُن سے کہتے کہ میں مسلمانوں کا پادری ہوں۔ اُن کی اس قسم کی بعض دلچسپ حکایتیں ہیں۔

حیدر آباد میں حیدر آباد بھی وہ کئی دفعہ گئے، مولانا انوار اللہ خاں صاحب استاد حضور

میر عثمان علی خاں بہادر، اور بعدہٗ صدر الصدور دولت آصفیہ شاہ صاحب کے گویا رفیق درس یا پیر بھائی تھے یعنی دونوں نے ایک ساتھ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے مکۂ معظمہ میں مثنوی پڑھی تھی، مولانا انوار اللہ خاں صاحب کا گھرانا دونوں علما اور صوفیہ کا مہمان خانہ تھا، شاہ صاحب حیدرآباد میں زیادہ تر مولانا انوار اللہ خاں صاحب یا قاری محمد سلیمان صاحب کے مہمان ہوتے، اور شہر میں اُن کے مواعظ ہوتے جن میں کبھی کبھی اعلیحضرت میر محبوب علی خاں بہادر نظام سابق، اور اُسوقت کے عمائد نواب بشیر الدولہ، نواب وقار الامرا، نواب خورشید جاہ بہادر شریک ہوتے، چونکہ شاہ صاحب بے نیاز طبیعت کے تھے، وہ امرا کی خوشامد نہیں کرتے تھے اس لئے وہ بھی قدر کرتے تھے بعضوں نے اُن کے وظیفہ کی وہاں تحریک کی، مگر شاہ صاحب نے ادھر التفات نہ کیا۔

شاہ صاحب کا وعظ شاہ صاحب وعظ فرماتے تھے اور لوگ پسند کرتے تھے، اور اثر لیتے تھے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اُن کی تقریر مسلسل ہوتی تھی، نہ اسمیں خوش بیانی ہوتی تھی اور نہ اسمیں خطیبانہ بلند آہنگی تھا فاضلانہ دلائل و براہین، بالکل سیدھی سادھی باتیں، بے تکلفی کی بول چال، اور روزمرہ کے پیش افتادہ واقعات کا بیان، بیچ بیچ میں بزرگوں کے حکایات و نصائح، دلچسپ اشعار، رباعیاں اور مثنوی کہیں کہیں ظریفانہ انداز، پھر بھی کلام میں اثر اور بیان میں درد، مثنوی اور اشعار خاص انداز میں پڑھتے تھے، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت حکیم سید ابوالحسن صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں جو بہار کے ممتاز مشائخ میں تھے، (والد بزرگوار مولانا سید سلیمان صاحب ندوی) حضرت شاہ صاحب نے ایک شعر اس انداز سے پڑھا کہ جناب حکیم صاحب قبلہ بیتاب ہوکر مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگے اور حاضرین دم بخود تھے۔

طبیعت میں غصہ ... [illegible] ... وہ ایسی ملا دیتے تھے کہ سننے والے کبھی ناراض نہیں ہوتے تھے۔

وہ اپنی تقریروں میں انگریزوں کی تعریف کیا کرتے تھے اور اُن کے عدل و انصاف کو سراہا کرتے تھے، مگر اسی کے ساتھ اُن کی دوسری بُرائیوں کو انگریزوں کے سامنے بیان کر دیتے تھے، ایک دفعہ مونگیر کی

انجمن حمایت اسلام میں وعظ تھا ضلع کا انگریز کلکٹر صدر تھا، وعظ میں انگریزوں کی حسب معمول تعریف کی پھر فرمایا، لیکن ان لوگوں میں ایک بڑی برائی ہو اور وہ یہ کہ انمیں بے حیائی بہت ہو، یہ اپنی میموں کو نچواتے ہیں کلکٹر صاحب کی میم کمشنر صاحب کے ساتھ اور کمشنر صاحب کی میم کلکٹر صاحب کے ساتھ. کلکٹر صاحب خود اور حاضرین بھی ہنستے رہے

اخلاق شمائل حضرت شاہ صاحب کا قد درمیانہ، رنگ گندمی، جسم ذرا بھرا ہوا، اخیر عمر میں بدن بہت بھاری ہوگیا تھا، داڑھی لمبی، سر گھٹا ہوا، سامنے کے دانت بڑے،

لباس یہ تھا، گھر میں لمبا کرتہ اور تہمد، گرمیوں میں کرتہ بھی اُتار دیتے، باہر نکلتے تو سر پر عمامہ اور جسم پر بیش قیمت عبا اور ہاتھ میں جریب، دوسرے ہاتھ میں اکثر تسبیح بھی رہا کرتی.

اُن کے اخلاق بہت نرم اور عفو ودرگذر کے تھے، کبھی کسی کو سخت بات نہیں کہی، کبھی کسی کو آزار نہیں کیا، اُن کے وطن میں بچے سے لیکر بوڑھے تک کوئی ایسا نہ تھا جس کو ان کی بات سے کوئی تکلیف پہنچی ہو، اس کے برخلاف لوگ اُن کو سخت سے سخت کہہ جاتے تھے، مگر وہ بہت تحمل سے برداشت کرلیتے تھے اور کبھی اُس کی شکایت نہیں کرتے تھے.

طبیعت میں صفائی بہت تھی، کیا مجال کہ ان کے فرش میں کوئی دھبہ ہو، اُن کا لوٹا کوئی چھو نہیں سکتا تھا، ہر وقت ہر چیز دھوئی جاتی تھی، ذرا سی چھینٹ کو بھی طہارت لازم سمجھا جاتی تھی، کپڑے صاف پہنتے تھے، مکان صاف رکھتے تھے ہر سال مکان میں سپیدی کرتے تھے.

ان کے حالات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ بھوپال کے زمانہ کے علاوہ اُنھوں نے کہیں جم کر قیام نہیں کیا، اور نہ کوئی بڑی نوکری کی، اگر کی تو اسکی حیثیت ایک شغل سے زیادہ نہیں سمجھی اور اسی عالم میں ساری عمر گذار دی. عجب متوکلانہ شان تھی، انھوں نے کبھی کل کے لئے آج فکر نہیں کی، جو آج ہے اُس کو کبھی کل کے لئے اُٹھا کر نہیں رکھا، اُن کی اردو میں بزرگوں کے حالات اور تصوف میں چند کتابیں تھیں جب اُنکو

ضرورت پڑتی اپنے بے تکلف دوستوں اور عقیدتمندوں کو اُسی ضرورت کے بقدر وی.پی کر دیتے. آخر عمر میں عجیب طرح تجارت شروع کی تھی. نخاس میں جاکر وہاں سے قلمی کتابیں، قلمی قرآن پاک، یا نگینے خرید لاتے اُن کو درست کرتے، کتابوں کو جلدیں لگاتے، اُسکی جلدیں بندھواتے اور جب وہ درست ہو جاتیں انکو دوستوں کے ہاتھ یوں ہی اونے پونے بیچ دیتے، اُن کی قیمت چیز کی چھوٹی بڑی یا قیمتی یا کم قیمت ہونے پر نہ تھی، بلکہ اُسوقت کی ضرورت کے مطابق ہوتی. مثلاً اُن کے پاس جاڑا نہیں، جاڑے کے ایک ڈبہ بھر کتاب کی قیمت نہیں، کبھی شکر نہیں تو اُس دن کی شکر کی قیمت

یوں کبھی کسی سے نذر نہیں قبول کرتے تھے، خاص لوگ جو واقف تھے اُن سے کوئی معمولی سا کام لیتے اور اُس کو بہانہ بناکر خدمت کرتے تھے. جیسے جب لکھنؤ میں نواب نورالحسن خاں کے یہاں قیام تھا اُن کے ذمہ، یہ کام تھا کہ اُن کی بیگم صاحبہ اُن سے قرآن پاک یا حدیث کا ترجمہ پڑھتی تھیں اور وہ اُن کی خدمت کرتی تھیں.

اُن کو کبھی دولت کی ہوس نہیں ہوتی تھی، گاؤں میں جو اُن کا وطن تھا بزرگوں کی وراثت میں کچھ کھیت اُن کو بھی ملے تھے، اُس کی مالگذاری کے تقاضے کے لئے کبھی سرکاری پیادے آتے تھے اُن کے ڈر سے اُنھوں نے اپنے حصہ ہی کو فروخت کر ڈالا.

امرا کبھی کبھی اُن کو بیش قیمت تحفے دیتے تھے، مگر وہ اُن کے پاس شاید ہی رہتے، یا تو کوئی مانگ کر لیجاتا یا وہ خود کسی کو دیدیتے. یا ضرورت کے وقت اُس کو اونے پونے بیچ دیتے، ایک دفعہ بڑی بیش قیمت گھڑی کسی نے اُن کو دی تھی، ایک صاحب کو وہ پسند آئی بولے حافظ صاحب (اپنے وطن میں وہ حافظ صاحب ہی کہلاتے تھے) اس کو میرے ہاتھ بیچ دیجئے انھوں نے پوچھا کیا دوگے، انھوں نے کوئی معمولی سی قیمت بتائی، حافظ صاحب راضی ہو گئے، اور گھڑی لیگئے) حافظ صاحب کے بڑے صاحبزادے مولوی محمد قاسم صاحب نے پوچھا آپنے اُن کو اتنے سستے داموں میں یہ گھڑی کیوں دیدی، فرمایا، اُس بیچارے کو پسند

آگئی تھی اور مجھے اسوقت اتنے ہی کی ضرورت تھی۔

ان کی خلوت کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا کسی نے پکارا اور ضرورت ظاہر کی تو کھول دیا ورنہ اندر ہی سے جواب دیا، صبر و تحمل، زہد و توکل، حق گوئی، طہارت، معاملات کی صفائی، سچائی، سادگی، خوف الٰہی خلق سے کم آمیزی، گوشہ نشینی، ان کی صفات تھیں، ان کو کبھی کسی کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ خوف الٰہی کے سوا اور کسی کا خوف اُن کے دل میں نہ تھا، اور کسی موقع پر حق کے اظہار سے کوئی ہیبت دینا اُن کو باز نہیں رکھتی تھی، خدا کی یاد ہمیشہ رہتی، تسبیح ہر وقت ہاتھ میں رہتی، یہاں تک کہ سوتے وقت بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتی، قلب ہمیشہ ذاکر و شاغل رہتا، کبھی گہری نیند سے نہیں سوتے، جب سوتے تو معلوم ہوتا کہ غنودگی میں ہیں، آخر شب میں ہمیشہ بیدار رہتے کبھی گنگنا کر شعر پڑھا کرتے، کبھی کوئی آیت تلاوت کرتے۔

اُن کو زیادہ روپے کی ہوس کا مصرف سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک دفعہ جب وہ لکھنؤ میں نواب نورالحسن خاں کے یہاں مقیم تھے، شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم ان سے ملنے گئے، شاہ صاحب نے مولانا سے دریافت کیا کہ آجکل کیا تنخواہ ہے، اُنھوں نے کہا، دو سو روپے، ان کو بہت تعجب ہوا۔ فرمایا مولوی کو اور دو سو روپے؟ بھائی میں نے مولویوں کی تنخواہ بیس پچیس میں سنی تھی، آخر یہ دو سو روپے ہر مہینہ آپ کیا کرتے ہوں گے، کیسے خرچ ہوتا ہوگا، مولانا خاموش تھے، اور لوگ مسکرا رہے تھے۔

اُن کو کھلانے کا بہت شوق تھا، اگر کوئی اچھی چیز ہوتی تو کہتے کہ بھائی رات کی ہنگی اسی وقت کھلا دو چنانچہ اُسوقت کھا لیتے اور رات کو فاقہ کر دیتے، کبھی کبھی یوں بھی فاقہ کرتے، طہارت کے وسوسہ کے سبب سے اُن کو پانی کی ضرورت زیادہ رہتی تھی، اس لئے بہشتی کو خوش رکھتے تھے اور اُس کو اپنا کھانا کھلا دیتے تھے۔

خطبۂ صدارت[1]

از جناب مولانا عبد السلام صاحب ندوی رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

حضرات! ادھر چند مہینوں کے اندر مجھے دو ادبی جلسوں کی صدارت کرنے کا اتفاق ہوا ہے پہلے دسمبر ۱۹۴۲ء میں انجمن جامعہ ادبیہ کانپور کی صدارت کا شرف حاصل ہوا، اس کے بعد فروری میں بعض کرم فرماؤں نے شاعرۂ نمائش اعظم گڈھ کی صدارت کا اعزاز بخشا، اور ان دونوں ادبی جلسوں میں میں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا اُس کے سننے اور دیکھنے سے ہر شخص کو بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ میں نے یہ دونوں صدارتیں محض اعزاز حاصل کرنے کے لئے نہیں قبول کی تھیں بلکہ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ علم ادب کی دو اہم شاخوں یعنی نظم و نثر کے متعلق اپنے ادبی خیالات کا اظہار کروں، اور اگر وہ قابل قبول ہوں تو اُن کے مطابق نظم و نثر کے نقائص کی اصلاح کی جائے تاکہ صحیح ادبی اصول و قواعد کے مطابق ان دونوں شاخوں کو پھولنے پھلنے کے لئے ایک عمدہ فضا مل سکے۔

ان دونوں جلسوں کے بعد اب صدارت کا یہ تیسرا اعزاز ہے، خود ہماری جماعت کے لوگوں کی عنایت سے حاصل ہوا ہے، اسلئے میں نے اس کو نہایت شکریہ کے ساتھ قبول کیا ہے کیونکہ مجھے اس ذریعہ سے اُس جماعت کی اصلاح و ترقی کے متعلق اظہار خیال کا موقع ملا ہے جس سے میرے تعلقات قدرتی طور پر بہت زیادہ گہرے ہیں یا کم از کم بہت زیادہ گہرے ہونے چاہئیں۔

حضرات! اس سے پہلے بھی انجمن طلبائے قدیم کے متعدد جلسے ہو چکے ہیں اور خود مجھکو انجمن کے

[1] سالانہ اجلاس طلبائے قدیم کے موقع پر پڑھا گیا۔

بعض جلسوں میں شرکت کا موقع مل چکا ہے، بلکہ زبردستی سے ایک جلسے کا صدر بھی مجھکو بنایا گیا ہے لیکن ابتدا میں ان جلسوں کی حیثیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ ندوہ کے کسی سالانہ جلسہ یا اور کسی ضمنی موقع پر چند زندہ دل اور خوشباش طلبائے قدیم کو خیال آیا کہ "مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے" اور اس دعوتِ آب و ہوا کے لئے انھوں نے سرزمینِ دار العلوم کی فضا کو وادیٔ کشمیر کا قائم مقام بنایا۔ دل کی حرارت نے سب سے زیادہ مطبخ میں اپنی گرمی دکھائی، رسمی طور پر جلسہ ہو گیا اور سب سے زیادہ توجہ خورد و نوش کی طرف مبذول ہو گئی اور اس باقیات الصالحات کا اثر شاید اب بھی کچھ کچھ باقی ہے، لیکن اب حالات بالکل بدل گئے ہیں، نہ صرف زمانہ کے بلکہ خود طلبہ قدیم کی حیثیت بھی بہت کچھ بدل گئی ہے، اور اب وہ ہندوستان میں ہر با وقعت زندگی کے نمایاں جزء ہو گئے ہیں۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں وہ معزز تعلیمی عہدوں پر سرفراز ہیں، صحافت اور اخبار نویسی میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا ہے، تصنیف و تالیف میں دار المصنفین کی بدولت انھوں نے نمایاں امتیاز حاصل کیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ خود دار المصنفین کو اُن کی بدولت یہ امتیاز حاصل ہوا ہے، اسکے علاوہ درس، تدریس، تبلیغ و اشاعت اور رشد و ہدایت غرض علم و مذہب کی کوئی شاخ ایسی نہیں جسمیں اُنکا کچھ نہ کچھ حصہ نہ ہو، ایسی حالت میں جو جلسہ اُن کی نمایندگی کر رہا ہے اُسکی حیثیت محض تفریحی نہیں ہونی چاہئے بلکہ اسکا اصلی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم نے ابتک جو پوزیشن حاصل کر لی ہے، وہ نہ صرف قائم رہے بلکہ اس کو اور بھی زیادہ ترقی و استحکام حاصل ہو اور علم و عمل کی ایک ایسی شاہراہ قائم ہو جائے جسپر ہمارے ساتھ چلنے کا جوش و حوصلہ جدید طلبہ کے دل میں بھی پیدا ہو۔

نمونۂ علم و عمل

لیکن اس شاہراہ کے قائم ہونے اور اس صراط المستقیم پر چلنے کے لئے ہم کو اپنے ساتھ میں ایک ایسی مشعل رکھنی چاہئے جو ہم کو تاریک سے تاریک مقام میں بھی بھٹکنے نہ دے، کیونکہ علم و عمل کے راستوں میں ہمیشہ اس قسم کے چراغ راہ کی ضرورت واقع ہوتی ہے، اور فطرت انسانی کی خود سری آزادی کا کتنا ہی

دعویٰ کرے تاہم وہ تقلید سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتی، اس بنا پر جیسا کہ مسلمانوں کے دوسرے دینی اور دنیوی اداروں نے اپنا ایک رہنما بنا لیا ہو اور اُسی کی قائم کردہ شاہراہ پر چل رہے ہیں اُسی طرح ہمکو بھی ایک ایسے رہبر کامل کی ضرورت ہو جس کے نقش قدم ہمارے لئے چراغ راہ بنجائیں، اسوقت مسلمانوں کے دینی مدارس میں دیوبند اور دنیوی تعلیم گاہوں میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سب سے زیادہ ممتاز ہیں اور ان دونوں نے اپنا اپنا ایک رہنما بنا لیا ہو، دیوبند کے پیشوا مولانا محمد قاسم علیہ الرحمہ ہیں، اور مسلم یونیورسٹی سرسید مرحوم کے نقش قدم پر چل رہی ہے، لیکن کیا صرف ہمیں لوگ ایک ایسی فوج ہیں جس کا کوئی سپہ سالار نہیں؟

حضرات! اس سوال کا جواب حسرتناک نہیں، بلکہ نہایت پر فخر ہے، ندوۃ العلماء علم و مذہب کا ایک ایسا شاندار گہوارہ ہو جس کے قائم کرنے، قائم رکھنے اور اس کے چلانے میں ہندوستان کے تمام اکابر علماء نے حصہ لیا ہے، بالخصوص ندوہ کی نظامت، ندوہ کی رکنیت اور دارالعلوم کی معتمدی کے تعلق سے ہم کو بعض ایسے علماء سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا ہے جنپر ہم بجا طور سے فخر کر سکتے ہیں۔ استاذالاساتذہ مولانا مفتی لطف اللہ صاحب، مولانا محمد علی صاحب خلیفہ مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی، مولانا مسیح الزماں خاں صاحب، مولانا خلیل الرحمان صاحب، مولانا سید عبدالحی صاحب، مولانا شاہ سلیمان صاحب، شمس العلماء نواب علی حسن خاں صاحب، مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی اور مولانا شبلی نعمانی ہمارے اُن مربیوں میں ہیں جنکو ہم تمام ہندوستان کے سامنے اسپر فخر و دعوے کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔

ان بزرگوں میں اگرچہ ہر شخص علم و عمل کے لحاظ سے قابل تقلید و اتباع ہو لیکن ندوہ کی نظامت اور دارالعلوم کی معتمدی کی وجہ سے ہم کو سب سے قریبی تعلق مولانا سید عبدالحی علیہ الرحمہ یادگار خانوادۂ حضرت مولانا سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ، شمس العلماء نواب علی حسن خاں علیہ الرحمہ اور

مولانا شبلی نعمانی سے رہا ہو، اوران تینوں بزرگوں کی ذات میں ایسی مختلف خصوصیتیں جمع ہوگئی تھیں جو مختلف حیثیتوں سے ہمارے لئے قابل تعلید واتباع ہیں، اسلئے علمی ذوق اور تصنیف و تالیف کے لحاظ سے مولانا شبلی کا طرز انشا، طریقہ تصنیف، اور ذوق علم ہمارے اُن تمام بھائیوں کا سدرۃ المنتہیٰ ہونا چاہیئے جو علمی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ دار المصنفین اُنھیں کے نقش قدم پر چل رہا ہے، اور مولانا سید سلیمان ندوی جو اسوقت معتمد دار العلوم ہیں اُن کی صحیح جانشینی کر رہے ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ ساتھ زہد و تقدس، پابندی شریعت، حسنِ اخلاق اور اصابت رائے کا بہترین نمونہ ہمارے سامنے مولانا سید عبد الحی علیہ الرحمہ نے قائم کیا ہو اور موجودہ حالت میں اُن کے فرزند رشید ڈاکٹر سید عبد العلی جو اسوقت ناظم ندوۃ العلماء ہیں ان تمام باتوں میں اُن کی صحیح نیابت کر رہے ہیں۔ دولت و جاہ کے ساتھ علم و مذہب کی خدمت کی قابل تقلید مثال ہمارے سامنے نواب علی حسن خاں علیہ الرحمہ خلف الصدق محدث جلیل نواب صدیق حسن خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قائم کی ہے۔

اسلئے ہماری حیثیتیں کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں، لیکن اگر ہم علم و مذہب کی خدمت کا کوئی جذبہ رکھتے ہیں تو ہم کو تقلید و اتباع کے لئے اپنے گھر سے باہر جانے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے لئے ہم کو اپنے گھر کی چار دیواری ہی کے اندر ایسے روشن چراغ مل سکتے ہیں جن کی روشنی صرف چار دیواری تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کا گوشہ گوشہ اُن کی چمک سے جگمگا رہا ہے، اب ہمارا فرض یہ ہے کہ سب سے پہلے اُن کی روشنی سے اپنے دلوں کے چراغ کو روشن کریں، اس کے بعد اس کو اُن جدید طلبار تک پہونچائیں جو اسوقت دار العلوم ندوہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں یا آیندہ تعلیم حاصل کرینگے۔

دائرۂ علم و عمل

علم و عمل کے ان قابل تقلید نمونوں کے بعد جو اللہ تعالیٰ کے محض فضل و کرم سے ہم کو میسر آگئے ہیں ہم کو ایک عملی دائرے کے بنانے کی ضرورت ہو جس کے اندر ہم پرکار کی طرح گردش کرنے

رہیں، لیکن اس کے لئے ہم کو بہت زیادہ جد وجہد کی ضرورت نہیں بلکہ جس طرح ہم کو علم وعمل کے نمونے آسانی کے ساتھ ہاتھ آگئے ہیں، اسی طرح ہم کو بنا بنایا عملی دائرۂ عمل بھی ہاتھ آگیا ہو صرف علم و مذہب دو لفظ ہیں جو ہماری تمام عملی قوتوں کا مرکز ہیں اور انھیں دونوں کی خدمت کرکے ہم دین و دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرسکتے ہیں، لیکن علم ومذہب کی خدمت کے لئے کسی اصطلاحی ادارے کی ضرورت نہیں ہو، بلکہ اس کے لئے صرف علمی ذوق، اور دینی خدمت کا مقدس جذبہ کافی ہے، اسلئے ہمارا ہر بھائی تجارت، زراعت، ملازمت، صنعت وحرفت غرض دنیا کا ہر پیشہ بھی کرسکتا ہو اور ساتھ ساتھ علمی اور مذہبی خدمت بھی کرسکتا ہو، اس کے لئے ضرورت ہو کہ ہم اپنے تمام بھائیوں کے مشاغل زندگی کا پتہ لگائیں اور دیکھیں کہ اُن میں یہ دونوں جذبے حق کے ذریعہ سے ہماری شیرازہ بندی ہوسکتی ہو موجود ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں ہیں تو انجمن طلبائے قدیم کا فرض ہے کہ اُن کو اسطرف متوجہ کرے اور اگر وہ اس کے لئے کچھ سروسامان چاہتے ہیں تو مناسب طریقہ پر اُن کے بہم پہونچانے کا انتظام کرے لیکن اسوقت عملی زندگی کے سامنے ایک اور وسیع میدان بھی کھل گیا ہو اور سیاست ہندوستان کی قومی زندگی کا سب سے اہم جزو زندگی ہو جسمیں روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہو اور اس ترقی کا ایک نتیجہ یہ ہو کہ اب ہمارے علماء کا گروہ بھی سیاست میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہوگیا ہے۔

سیاسی حیثیت سے اسوقت ہمارا ایک مقدم فرض یہ ہو کہ گورنمنٹ کے سامنے ایسے مطالبات پیش کریں جن سے مسلمانوں کے مذہبی حقوق محفوظ ہوں اور علماء اُن حقوق کے نظم وادارہ میں کام کی جگہ پائیں محض سیاسی حقوق حاصل کرلینے سے تمام علمی تعلیمی اور مذہبی ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتیں، جبتک ان ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے علماء کے ہاتھ بھی کام میں نہ لائے جائیں، اسلامی سلطنتوں میں بہت سے حقوق، بہت سے عہدے اور بہت سی خدمتیں علماء کے لئے مخصوص تھیں اور انھیں کے ذریعہ سے وہ ہر قسم کی علمی اور مذہبی خدمتیں کرتے تھے، میں سمجھتا ہوں کہ اسوقت علماء کو سیاسیات میں شامل ہوکر مسلمانوں کے

ان حقوق کا مطالبہ کرنا چاہیئے، شور و غل، انقلاب زندہ باد کے نعرے، پرچم کشائی کی رسم اور جلوسوں کی شرکت، کوئی سیاسی کام نہیں بلکہ سیاسی ہوس پرستی ہو۔

طلبۂ قدیم و طلبۂ جدید

اسوقت ہماری زندگی دو حصوں میں منقسم ہے، ایک تو ہماری خارجی زندگی ہو اور جہاں تک اس زندگی کا تعلق ہو، ہمارے ذاتی مشاغل بالکل الگ الگ ہیں۔ ان مشاغل کے لحاظ سے ہم میں ایک کا دوسرے پر کوئی خاص اثر نہیں پڑسکتا، لیکن ہماری زندگی کا داخلی حصہ بہت زیادہ اہم ہو۔ کیونکہ اس زندگی میں ہم صرف ایک جماعت کے فرد نہیں رہتے بلکہ ایک ایسے خاندان کے فرد بن جاتے ہیں جو بہت سے چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کر رہا ہے، اور آپ کو معلوم ہو کہ تربیت اطفال کا فرض کسقدر اہم ہے۔ اسوقت ہم ندوہ اور دارالعلوم ندوہ سے تعلق رکھنا چاہتے ہیں تو ہم کو سب سے زیادہ اُن طلبہ سے تعلق رکھنے کی ضرورت ہو جو اسوقت دارالعلوم ندوہ میں تعلیم پا رہے ہیں، آج سے چند سال پیشتر خود ہم نے یہ حیثیت حاصل نہیں کی تھی کہ طلبہ جدید پر کوئی خاص علمی، مذہبی، تعلیمی، اخلاقی اور روحانی اثر ڈال سکیں، لیکن اب خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم سے ندوہ اور دارالعلوم ندوہ خود ہماری جماعت کے بعض ممتاز افراد کی رہنمائی میں چل رہا ہو، اور ہماری جماعت کے افراد صرف اس کے ارکان انتظامیہ ہی میں داخل نہیں ہیں بلکہ اس کے ناظم و معتمد بھی ہیں، ایسی حالت میں یہ مسئلہ سب سے زیادہ قابل غور ہو کہ ہمارے تعلقات طلبۂ جدید کے ساتھ کس قسم کے ہونے چاہئیں؟ یہ مسلم ہو کہ ہماری جماعت کی شیرازہ بندی صرف علم و مذہب کی خدمت سے ہو سکتی ہے، اور یہی اصول طلبہ جدید پر بھی منطبق ہو سکتا ہو یعنی ہم اُن سے صرف علم و مذہب کے ذریعہ سے تعلق پیدا کر سکتے ہیں اور اُن پر صرف علمی اور مذہبی اثر ڈال سکتے ہیں، لیکن خود طلبۂ قدیم کی حالت اس معاملہ میں مختلف ہو، جو لوگ علمی مشاغل میں مصروف ہیں اُن کا ذوق بالکل مختلف ہو، کوئی تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہو کوئی ادب کا شیدائی ہو کسی کو تفسیر میں انہماک ہو، کسی کو حدیث سے شغف ہو۔ غرض ہم لوگ اسوقت

وللناس فیما یعشقون مذاہب

کے مصداق کامل ہیں، لیکن ہمارے ذوق کا اختلاف اگرچہ اس حیثیت سے طلبہ جدید کے لئے مفید ہے کہ کسی علم اور کسی فن کی تکمیل اور رہبری میں اُن کو ہمارے حلقہ سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خود طلبہ قدیم میں اس قسم کے لوگ موجود ہیں جو علم کی ہر شاخ میں اُن کی رہنمائی کرسکتے ہیں، صرف قدیم مشرقی علوم وفنون کی تخصیص نہیں بلکہ مغربی علوم کے متعلق بھی ہماری جماعت کے بعض افراد سے اُن کو کافی مدد مل سکتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ اگر اس اختلاف مذاق سے صحیح طور پر کام نہ لیا گیا تو وہ طلبہ جدید کے لئے مضر بھی ہوسکتا ہے، انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ جس چیز کو پسند کرتا ہے، دوسروں کو بھی اُسی طرف مائل کرنا چاہتا ہے اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسری چیزوں سے اُن کی توجہ کو ہٹاتا ہے اگر ایک شخص تفسیر یا حدیث کا ذوق رکھتا ہے تو وہ قدرتی طور پر دوسروں کو اُس کے پڑھنے کی طرف مائل کریگا اور فقہ، کلام، منطق اور فلسفہ کی طرف سے اُن کی توجہ کو ہٹائے گا، لیکن تعلیمی حیثیت سے اس قسم کی یک رُخی کوشش طلبہ کے لئے سخت مضر ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جو اساتذہ مختلف علوم وفنون کا ذوق رکھتے ہیں اُن کو دوسرے طلبہ میں اپنے محبوب علم کے ذوق پیدا کرنے کا پورا حق حاصل ہے لیکن اسی کے ساتھ اُن کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے علوم وفنون کی تنقیص کریں، کیونکہ اس سے اُن اساتذہ کی توہین ہوتی ہے جو دوسرے علوم وفنون کا ذوق رکھتے ہیں جس سے باہم اختلاف پیدا ہوتا ہے اور طلبہ کے قدرتی ذوق اور قدرتی استعداد کو صدمہ پہونچتا ہے، ممکن ہے کہ ایک طالب العلم کا قدرتی میلان تفسیر وحدیث کی طرف ہو، اور دوسرے کا فقہ، کلام اور منطق وفلسفہ کی طرف ہو۔ اگر ہم خود اپنی جماعت میں ہر علم کے اساتذہ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو ہر صحیح ذوق کی تربیت کرنا چاہئے۔

ہم اس طریقہ سے طلبہ واساتذہ میں باہم بہت زیادہ اتحاد واتفاق قائم کرسکتے ہیں، اور اس سے دار العلوم میں ایک ایسی خوشگوار فضا پیدا ہوسکتی ہے جو ہر قسم کے درختوں کو نشو ونما دے سکتی ہے۔

خارجی اثرات

طلبہ قدیم، اساتذہ اور ارکان انتظامیہ کے علاوہ طلبہ جدید پر اور بھی بہت سے خارجی اثرات
ڑ سکتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ طلبہ کی مذہبی اور اخلاقی حالت پر زیادہ تر انھیں خارجی چیزوں کا اثر
پڑ سکتا ہے، سید محمد بدر الدین حلبی اپنی کتاب تعلیم الارشاد میں طلبہ ازہر کے متعلق لکھتے ہیں کہ " یہ نہایت
افسوسناک بات ہو کہ طلبائے ازہر میں حد سے زیادہ بداخلاقیاں پھیل گئی ہیں اور اسی وجہ سے لوگ اُن سے
نفرت کرتے ہیں، دنیا کی ہر جماعت کا یہ حال ہو کہ اُس کے افراد کی تعداد جسقدر بڑھتی جاتی ہو اور وہ جسقدر
ترقی کرتی جاتی ہو اُسی قدر اُسکی قدر و منزلت بڑھتی ہو، صرف علوم دینیہ کے طلبہ کی یہ حالت ہو کہ جسقدر
ان کی تعداد بڑھتی ہو اور اُسکی قدر و منزلت گھٹتی جاتی ہو، لیکن اسمیں خود طلبہ کا کوئی قصور نہیں وہ غریب تو
سادہ دیہاتوں سے آتے ہیں اور اسوقت وہ اخلاق و معاشرت سے بالکل بیگانہ ہوتے ہیں البتہ جب اُن کا
گذر اُن شہروں میں ہوتا ہے جو بداخلاقیوں کا مرکز ہیں تو اُن کی آنکھیں خواہ مخواہ ان اخلاقی مناظر پر
پڑتی ہیں اور وہ اُن سے قدرتی طور پر متاثر ہوتے ہیں، ان بداخلاقیوں کی نشوونما زیادہ تر اُن طلبہ کی
صحبت سے ہوتی ہو جن کے ساتھ وہ رہتے ہیں، اسمیں قصور صرف اُن مدارس کے ارکان اور عہدہ داروں کا ہو
جنھوں نے ان طلبہ کی باگ بالکل ڈھیلی کر دی ہو اور اُن کو مطلق العنان بنا دیا ہو، کچھ دنوں سے انکی توجہ
اس طرف مبذول ہوئی ہو اور انھوں نے نصاب تعلیم میں بعض اخلاقی کتابیں بھی شامل کر دی ہیں، لیکن
اس سے ذرہ برابر بھی اخلاقی اصلاح نہیں ہوئی ہے۔

اس اقتباس کے نقل کرنے سے اسوقت میرا یہ مقصد نہیں کہ طلبہ جدید کے اخلاق و عادات پر
کوئی حملہ کروں، میرا یہ مقصد بھی نہیں ہو کہ دار العلوم کے اساتذہ اور معتمد اور ناظم نے طلبہ کو بالکل مطلق العنان
کر دیا ہے بلکہ میں صرف دو باتیں کہنا چاہتا ہوں، ایک یہ کہ اس زمانہ کی بداخلاقیاں نہایت دلفریب
اور اخلاقی قالب میں نمایاں ہوتی ہیں، ڈنر، پارٹی، سینما، تھیٹر، جلوس وغیرہ سیکڑوں بداخلاقیوں کا

مظہر ہیں، لیکن ان بداخلاقیوں پر خوشنما پردے پڑے ہوئے ہیں۔

دوسری بات یہ ہو کہ آپ ایسے شہر اور ایسے ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہیں قدم قدم پر یہ بداخلاقیاں نہایت دلفریب صورتوں میں نظر آسکتی ہیں، لکھنؤ کا قدیم تمدن اپنی دلفریب صورت میں قائم ہو اور دور جدید کی ناخوش رنگ تہذیب اُس پر مستزاد ہو اسلئے ممکن ہو کہ بداخلاقیوں کے یہ خوشنما پردے طلبہ جدید کی آنکھوں پر پردے ڈال دیں اور وہ نادانستہ طور پر اُن میں مبتلا ہو جائیں۔ انسان کے لئے بڑے بڑے گناہوں سے زیادہ چھوٹے چھوٹے گناہ خطرناک ہیں اور ان گناہوں کا جال بڑے بڑے شہروں کی ہر ہر گلی میں بچھا ہوا ہے، میں نہیں جانتا کہ دارالعلوم کے اساتذہ اور عہدہ داروں نے طلبہ جدید کو اُن سے بچانیکی کیا کیا تدبیریں کی ہیں۔ البتہ میں خود طلبہ جدید سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے اخلاق وعادات اور وضع ولباس اور طرز معاشرت کی اصلاح کے لئے قیام دارالعلوم کے اصلی مقاصد کو پیش نظر رکھیں، دارالعلوم نے بے شبہ اپنے عربی خواں طلبہ کو مغربی علوم اور مغربی خیالات سے آشنا کرنا چاہا ہو، لیکن مغربی علوم اور مغربی خیالات مغربی تہذیب سے بالکل مختلف ہیں، اسلئے مغربی علوم اور مغربی خیالات سے آشنا ہونے کے لئے اگر طلبہ جدید اپنے آپ کو مغربی تہذیب کے قالب میں ڈھال لیں تو یہ قیام دارالعلوم کے مقصد کی تائید نہ ہوگی بلکہ اسکی عملی تردید ہوگی، خود مغربی علوم اور مغربی خیالات سے واقف ہونے کا یہ مقصد نہیں کہ دارالعلوم کے طلبہ مغربی تہذیب کے اثرات کو قبول کریں بلکہ اس کا اصلی مقصد یہ ہو کہ جو لوگ مغربی تہذیب اور مغربی علوم و فنون کے مضر اثرات کو قبول کر چکے ہیں اُن کی اصلاح کی خاطر ان مغربی علوم وافکار سے واقفیت حاصل کر کے اُن کے مفاسد سے اُن کو مطلع کریں اور اُن پر اپنا اسلامی اثر ڈالیں اور اس طریقہ سے جدید تعلیم یافتہ گروہ کی مذہبی رہبری کریں، لیکن اگر انھوں نے اخلاق ومعاشرت میں خود جدید تعلیم یافتہ گروہ کو اپنا رہنما بنا لیا تو اس سے دارالعلوم کی قلب ماہیت ہو جائے گی اور لکھنؤ یونیورسٹی اور دارالعلوم ندوہ میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا، اسلام نے دنیا میں مسلمانوں کی جماعت کو ایک مؤثر ہستی بنا کر پیش کیا ہو اور انھوں نے

روم و ایران کی تہذیب کو جو اس زمانے کی تہذیب سے بالکل مشابہ تھی اپنا مذہبی اور اخلاقی اثر ڈال کر بہت کچھ بدل دیا ہے، خداوند تعالیٰ فرماتا ہو" وکذالک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا" لیکن ارشاد خداوندی صرف صحابہ، تابعین اور تبع تابعین تک محدود نہ تھا بلکہ قیامت تک مسلمانوں پر صادق آئے گا اسلئے اگر ہم اس کے مصداق بننا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہم کو اپنے اندر ایسی صلاحیت پیدا کرنی چاہئے جس کے ذریعہ سے ہم خود تہذیب جدید پر اپنا اثر ڈال سکیں، نہ یہ کہ خود تہذیب جدید کا اثر قبول کریں، کیونکہ

اسپہ کیا ناز کہ بدلا ہے زمانے نے ہمیں مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

میں خیال کرتا ہوں کہ میں نے طلبہ قدیم و طلبہ جدید کی اصلاح و ترقی کے متعلق ضروری باتیں عرض کر دی ہیں، اور اس سے زیادہ آپ کی سمع خراشی کو غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

وہذا آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(بقیہ صفحہ ۳) سب و شتم سے محترز رہیں، اور انما المومنون اخوۃ کے ماتحت بھائی بھائی کی طرح زندگی بسر کریں۔ اور باہمی تعاون و تعاضد کرکے کالبنیان یشد بعضہ بعضا ایک مضبوط و مستحکم دیوار بن جائیں جس کو کسی مخالف کی دشمنی کسی قسم کا گزند نہ پہونچا سکے۔

ہمیں اُمید ہو کہ اس تجویز کا خیر مقدم کیا جائے گا اور علماء اپنے روادارانہ عمل سے اسلامی وحدت کا ایسا نمونہ قائم کریں گے جو دوسروں کے لئے دلیل راہ کا کام دیگا۔

کتبخانۂ ندوۃ العلماء کے بعض اہم مخطوطات

مولوی محمد انور صاحب ندوی نائب مہتمم کتب خانہ

الندوہ کی جلد ا ع ۹ میں کتبخانۂ ندوہ کی ایک نادر قلمی تفسیر کے تعارف کے سلسلہ میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ کتبخانہ کی اُن قلمی کتابوں کا ذکر بھی آیندہ کیا جاتا رہے گا جو بعض وجوہ سے نہایت اہم اور دنیا کی نوادر کتب میں شمار کئے جانے کی مستحق ہیں، لیکن افسوس کہ یہ سلسلہ پہلی قسط سے تجاوز نہ کرسکا۔ آج کا مضمون اُسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ ہم کو افسوس ہے کہ آج کی صحبت میں ہم ان علمی جواہر ریزوں کے صرف نام ہی گنانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر ان کے متعلق دوسری اہم تفصیلات بھی پیش کریں گے۔ ساتھ ہی اہل علم اور اصحاب ذوق سے درخواست ہے کہ اس سلسلہ میں وہ اپنے مفید مشوروں سے نوازیں گے۔　(انور)

نمبر شمار	نمبر کتاب	نام کتاب مع مصنف	وجوہ ندرت	نام کتبخانہ
۱	۱۲۱	السیف الباتر فی بین الصابر والشاکر للعلامہ سید محمد بن اسمٰعیل الامیر الیمانی المتوفی سنہ ۱۱۸۲ھ	مصنف کا دستخطی نسخہ ہے اور سنہ ۱۱۳۵ھ میں اسکی کتابت ہوئی۔ یہ کتاب دراصل علامہ ابن قیم کی کتاب عمدۃ الصابرین والشاکرین کا خلاصہ ہے شروع صفحہ پر جلیل القدر علماء کے دستخط اور عبارتیں ہیں۔	ندوۃ العلماء
۲	۱۵۰	کتاب الروح لابن قیم المتوفی سنہ ۷۵۱ھ	علامہ سید محمد بن اسمٰعیل الامیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے	؍؍
۳	۱۶۳	خزانۃ المفتین لحسین بن محمد السمعانی	مصنف کے اصل نسخہ سے سنہ ۸۸۳ھ میں نقل کی گئی	؍؍

نمبر شمار	نمبر کتاب	نام کتاب مع مصنف	وجوہ ندرت	نام کتبخانہ
۴	۱۸۵	زبدۃ الاصول للشیخ بہاء الدین محمد بن حسین العاملی المتوفی سنہ ۱۰۳۱ھ	سنہ ۱۰۰۰ھ کی تصنیف ہو اور سنہ ۱۰۱۲ھ میں مصنف کی خاص نقل ہوئی۔ کاتب کا نام میر صادق ہے۔ جلد اول مطلا، مفید حواشی سے مزین ہے۔	ندوۃ العلما
۵	۱۸۷	مجموعہ سوال و جواب لابن تیمیہ المتوفی سنہ ۷۲۸ھ	سنہ ۷۲۶ھ کی تصنیف ہو اور مصنف کے اصل نسخہ سے محمد بن سیف بن ابراہیم نے سنہ ۱۲۱۴ھ نقل کیا۔	//
۶	۲۹۷	تحفۃ الذاکرین لشیخ الاسلام محمد بن علی الشوکانی المتوفی سنہ ۱۲۵۰ھ	سنہ ۱۲۲۵ھ کی تصنیف ہو اور سنہ ۱۲۳۶ھ میں خود مصنف نے اس کو لکھا ہے	//
۷	۳۹۰	تذکرۃ الشعراء للمصحفی المتوفی سنہ ۱۲۴۰ھ	سنہ ۱۲۰۹ھ میں اسکی کتابت ہوئی، اکثر جگہ مصنف نے اصلاح کی ہے	//
۸	۴۰۳	جوگ بششت لمولنا فیضی المتوفی سنہ ۱۰۰۶ھ	مصنف کے دستخطی نسخہ سے منقول ہے۔	//
۹	۴۵۸	التکمیل لشاہ مولانا رفیع الدین رح	سنہ ۱۲۴۹ھ میں مولانا سید اولاد حسین قنوجی نے اس کو نقل کیا، ابتک طبع نہیں ہوا۔	//
۱۰	۴۸۶	ادب الطلب و منتہی الارب للقاضی محمد بن علی الشوکانی المتوفی سنہ ۱۲۵۰ھ	مصنف کے اصل نسخہ سے منقول ہو اور مولانا حسین بن محسن الیمانی نے اسکی تصحیح فرمائی ہو، سنہ کتابت سنہ ۱۲۹۲ھ، کاتب احمد حسین المقبول ہے۔	//
۱۱	۵۳۴	راگ درپن سیف الدین محمود معروف بہ فقیر الدین تربیت خانی المتوفی سنہ ۱۰۹۵ھ	سرورق پر علامہ شبلی رح کے دست خاص کا مختصر ترجمہ مؤلف لکھا ہو، ابتک چھپی نہیں ہے۔	//

نمبر شمار	نمبر کتاب	نام کتاب مع مصنف	وجوہ ندرت	نام کتبخانہ
۱۲	۵۸۱	رسالہ الجوہرۃ فی الضاعۃ الاصطلاحیۃ للمجتہد ملا آقا بن عابد بن رمضان بن زاہد الشیروانی الدربندی (مطبوع)	۱۲۷۳ھ کی تصنیف ہو اور ۱۲۸۳ھ میں طبع ہوا۔ اس ایڈیشن کی کاپی خاص مصنف کے مسودہ سے لکھی گئی۔	ندوۃ العلماء
۱۳	۵۶	سعدیہ حاشیہ تفسیر کشاف للعلامہ سعد الدین مسعود الدین مسعود بن عمر التفتازانی المتوفی ۷۹۲ھ	یہ نسخہ قدیم الخط ہو اور کتاب ابتک طبع نہیں ہوئی ہے۔	״
۱۴	۵۷	منتہی العلوم فی تفسیر کتاب اللہ الحی القیوم جلد ۲ از سورۂ نساء تا سورۂ اعراف للعلامہ نور الدین ابی طالب عبد الرحمٰن بن عمر البصری المتوفی ۶۸۴ھ	کتاب ابتک طبع نہیں ہوئی ہو اور یہ نسخہ مصنف کی زندگی میں لکھا گیا اور ان کے سامنے پڑھا گیا، جن اکابر علماء کے مطالعہ میں وقتاً فوقتاً رہا ہو ان کے دستخط تفصیل سے کتاب کے اخیر صفحہ پر ہیں۔	״
۱۵	۲۵۷	نجوم المشکوٰۃ شرح مصابیح المشکوٰۃ تا جزء سادس، لمولانا محمد صدیق	کتاب ابتک چھپی نہیں ہو، قدیم الخط ہو۔ ابتدائی صفحہ پر ایک مہر ہو جسمیں ۱۱۰۰ھ درج ہے۔	״
۱۶	۲۵۸	دیوان شاہ ولی اللہ الدہلویؒ جامع اسحٰق بن عرفان برادر اکبر سید احمد شہیدؒ	کتاب ابتک طبع نہیں ہوئی ہے۔	״
۱۷	۳۶۲	کتاب الاوائل للعسکری المتوفی ۳۹۵ھ	ابتک طبع نہیں ہوئی ہے۔	״
۱۸	۴۳۸	الرد علی المنطق لشیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ المتوفی ۷۲۸ھ	ابتک طبع نہیں ہوئی ہی، علامہ شبلیؒ نے ایک قدیم اور صحیح خوشخط نسخہ سے خود اس کا مقابلہ کیا ہے سنہ کتابت ۱۳۱۹ھ	״

(باقی آیندہ)

حالات ندوہ

دار العلوم میں بہت عرصہ سے رمضان اور گرمی میں دو بڑی تعطیلیں ہوتی تھیں، لیکن اب دونوں تعطیلوں کے درمیان اتنا کم فاصلہ رہ گیا ہو کہ ان کا علٰحدہ علٰحدہ جاری رکھنا تعلیمی نقطۂ نظر سے مضر تھا اسلئے اس مرتبہ دونوں تعطیلیں اسطرح ملا دی گئی ہیں کہ ۱۰/ اپریل سے ۳۰/ جون تک دار العلوم بند رہے گا۔ یکم جولائی سے پھر تعلیم شروع ہوگی۔ رمضان میں امسال مدرسہ کھلا رہے گا۔ اگر تجربہ سے یہ صورت مفید ثابت ہوئی تو آیندہ اسپر عمل ہوگا ورنہ کوئی اور مناسب انتظام کیا جائے گا۔

پچھلے مہینے متعدد اصحاب دار العلوم تشریف لائے جنمیں نواب بہادر یار جنگ، پنڈت جواہر لال نہرو، اور ڈاکٹر حمید اللہ پروفیسر جامعہ عثمانیہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور نواب بہادر یار جنگ نے طلبائے دار العلوم کے سامنے تقریریں بھی کیں۔ پنڈت جی نے اپنی تقریر میں دنیا کے موجودہ سیاسی اور معاشی حالات سے بحث کی، لیکن ساری گفتگو جماعتی عصبیت سے الگ ہو کر خالص علمی انداز میں تھی۔ پوری تقریر میں پروپیگنڈا کہیں نام کو بھی نہیں آنے پایا۔

نواب بہادر یار جنگ نے حیدرآباد کے سیاسی حالات، انجمن اتحاد المسلمین کی سرگذشت، مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد، پاکستان کی اہمیت و ضرورت پر اپنے خیالات ظاہر کئے اور علماء کو ان مقاصد کے لئے میدان میں آنے کی دعوت دی۔

اس درمیان مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ بھی دار العلوم تشریف لائے اور ایک ہفتہ سے زائد قیام رہا، خالص علمی مجلسوں میں اساتذہ اور طلبا کے سامنے مختلف علمی اور دینی مسائل پر گفتگو کے

علاوہ قرآن مجید، علم کلام اور اسرار دین سے متعلق طلبہ کو اسباق پڑھائے۔ عام مجمع میں نواب بہادر یار جنگ کی تقریر کے سلسلہ میں آپ کا صدارتی خطبہ بہت ہی خوب تھا، جسمیں آپنے مسلمانوں کی سیاست پر سطح عام سے ہٹ کر بلند نقطۂ نظر سے تبصرہ فرمایا۔ اور مولانا محمد علی مرحوم کی مثال سے اسلامی قیادت کا ایسا جامع تصور پیش کیا جو مسلمانوں کے لئے دلیل راہ بن سکتا ہے۔

بزم ادب کے ارکان عرصہ سے مشاعروں کے عام رنگ کو بدل کر اُس کے بجائے گہرا و پائدار ادبی ذوق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اساتذۂ ادب کی ایک فہرست ترتیب دی تاکہ ان کے کلام کو سامنے رکھ کر صحیح ذوق پیدا کیا جا سکے۔ اس غرض سے پچھلے مہینے سوداؔ کے حالات زندگی اور ان کے کلام پر تبصرہ و تعارف کے لئے ایک مجلس شعر و سخن کی آراستہ کی گئی، جسمیں کچھ لوگوں نے سوداؔ کی منتخب غزلیں جلسہ میں سنائیں بعض نے ان کے حالات زندگی بیان کئے بعض نے ان کے کلام کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر دکھایا۔ کچھ لوگوں نے سوداؔ کی زمینوں میں اپنے فکر و خیال کے نئے گل بوٹے لگائے۔ آیندہ اس سلسلہ میں دوسرے اساتذہ پیش نظر ہیں۔

وسطِ ربیع الاوّل میں دار العلوم کے چھوٹے بچوں نے جلسۂ سیرت کا انتظام کیا۔ اس موقع پر عام انتظام کے علاوہ بچوں نے تقریریں بھی کیں، جسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا۔ خوش قسمتی سے اسوقت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ بھی موجود تھے۔ بچوں کی درخواست پر انھوں نے بھی ایک تقریر فرمائی۔

Regd. No. A-596.

اس صدی کی بہترین تالیف
کامیاب زندگی بسر کرنے کا دستور العمل

طلسم عمل (یا) حسن معاشرت

مؤلفہ جناب سید مجتبیٰ حسن صاحب نبی ہو جونپوری

عملی نفسیات پر ایک مفید اور معرکۃ الآرا کتاب — بہترین دل و دماغ کے عمل اور تدبیروں کا نچوڑ

اردو میں آجتک اس اچھوتے اور کارآمد موضوع پر کوئی کتاب نہیں نکلی

کشمیر اور میسور کی ریاستوں نے اسکول اور کالج کے کتبخانوں اور تقسیم انعام کیلئے منظور کرلیا ہو

لوگوں کو مسخر اور گرویدہ کرنے کاروبار و پیشہ میں خاطر خواہ ترقی اور منافع حاصل کرنے، اپنی شخصیت کو وزن دار اور اپنی باتوں کو جادو اثر بنانے، نام و نمود، عزت، شہرت، دولت، ثروت، سربلندی حاصل کرنے کے راز اس کتاب میں پوشیدہ ہیں۔ اقتصادی بدحالی اور روزگار کی پریشانی کا آسان حل، طلبا کے لئے معلومات کا بیش بہا خزانہ، پبلک زندگی بسر کرنیوالوں اور مصلحان اخلاق کے لئے مشعل ہدایت۔

ہندوستان کے سرآوردہ رسائل اور اخبارات، ممتاز لیڈران قوم، تعلیمی اداروں کے صدر اور علم دوست احباب نے اسپر بہترین الفاظ میں تبصرہ کیا ہو اور اسکے افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے نصاب تعلیم میں داخل کئے جانیکی ہدایت کی ہو۔ اس صدی کے مطبوعات میں اس سے زیادہ مفید اور کارآمد کتاب شائع نہیں ہوئی جو ہر فرقہ ہر قوم اور ہر پیشہ کے لئے یکساں مفید ہو۔

حجم ۲۵۶ صفحات، مجلد معمولی عہ مجلد خاص ۶؍

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو، لکھنؤ

پبلشر حامد علی ندوی، پرنٹر بانکے لال سکسینہ ملازم مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابوالحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبدالسلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

شذرات

پچھلے مہینہ کا رسالہ پریس میں جاچکا تھا کہ جناب حامد صاحب نعمانی کے انتقال کی دردناک اطلاع ملی۔ مرحوم علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ تھے۔ اس تعلق کی بنا پر اہل ندوہ اُن کے ساتھ ایک رابطۂ خاص محسوس کرتے تھے۔ علامہ مرحوم کی زندگی ہی میں آپ نے ملازمت اختیار کرلی تھی۔ زندگی کا بڑا حصہ اسی مصروفیت میں بسر ہوا کئی برس ہوئے تحصیلداری سے پنشن لی اور اعزہ و احباب کے درمیان سکون سے زندگی گذارنے لگے۔ مزاج میں کافی متانت و سنجیدگی تھی۔ نمائش وریا سے طبیعت کو سخت نفرت تھی، ملنے جلنے میں بیحد خلیق و متواضع تھے۔ خدا سے دُعا ہے کہ وہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انھیں اپنے دامنِ رحمت میں جگہ دے۔

اس موقع پر ایک اور حادثہ بھی قابل ذکر ہے۔ مولانا ظہور احمد صاحب وحشی کسی تعارف کے محتاج نہیں، ندویوں کے حلقے میں ان کی خبر وفات سخت رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی۔ مرحوم نے آخر تک ندوہ ہی میں تعلیم پائی اور یہاں کے بہت ہی ذہین و طباع طالبعلموں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی ذہانت و تیز فہمی کا تذکرہ آجتک ندوہ کی روداد میں موجود ہے تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک سید جالب مرحوم کے ساتھ ہمدم میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ بعض عربی ناولوں کے اردو ترجمے اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ پھر دہلی چلے گئے، وہاں کی فضا کچھ ایسی بھائی کہ ساری زندگی وہیں گذار دی۔ اس عرصہ میں متعدد رسالے نکالے۔ تجلی پریس کے نام سے ایک مطبع بھی قائم کیا، عبارت بہت ہی شگفتہ اور رواں لکھتے تھے، ان کے اصلاحی افسانے اور ادبی مضامین ملک میں کافی مقبول تھے اور اچھے اونچے حلقے انھیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے مرحوم کو ندوہ اور ندویوں سے بڑا تعلق تھا جب ملاقات ہوتی، اس لطف و محبت سے پیش آتے کہ دل مدتوں اس کا اثر محسوس کرتا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ انھیں اپنی رحمتوں اور نوازشوں سے سرفراز فرمائے۔ مرحوم کے

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۳ جمادی الاول ۱۳۶۱ھ مطابق مئی ۱۹۴۲ء نمبر ۵

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر منیجر الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

اعزہ واحباب میں سے اگر کوئی صاحب ان کے مضامین کا مجموعہ شائع کریں تو اچھی خدمت انجام پائے۔ ان کے اصلاحی افسانے خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ مفید ہیں۔

پچھلی اشاعت میں جمعیۃ علماء ہند کی بعض تجویزوں کا ذکر ہوچکا ہے۔ بلاشبہ لاہور کے اجلاس میں جو تجویزیں منظور ہوئی ہیں۔ اگر وہ بروئے کار آگئیں تو جمعیۃ کی زندگی کا نیا دور شروع ہوجائے گا۔ اس وقت ضرورت صرف اسکی ہو کہ ہر قسم کے جماعتی تعصب سے بالاتر ہوکر خلوص ویک جہتی کے ساتھ کام کیا جائے۔ تاکہ اتحاد ویگانگت کی فضا پیدا ہو۔ فروعی مباحث کے بجائے اصول وکلیات پر نظر رہے۔ علماء کے مختلف حلقوں کو اتحاد عمل اور شرکت کار کی دعوت دی جائے تاکہ جمعیت کے دائرے میں وسعت اور اس کے اثر ونفوذ میں اضافہ ہو۔ ہمیں اس باب میں جمعیۃ کے پرجوش ناظم مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے خاص توقعات ہیں۔ اُمید ہو کہ ان کے دور میں زنجیر کی ٹوٹی ہوئی کڑیاں پھر سے جُڑ جائیں گی اور جمعیۃ حقیقتًا تمام علماء ہند کی ایک مرکزی انجمن بنجائیگی

علماء کی تنظیم کے سلسلہ میں عرصہ سے ہمارا خیال ہو کہ عربی مدارس کو منظم کیا جائے۔ آج اس گئی گذری حالت میں بھی یہ مدرسے مسلمانوں کی زندگی پر خاصہ اثر رکھتے ہیں۔ ملک میں مشکل ہی سے کوئی شہر یا قصبہ ایسا ہوگا، جہاں چھوٹا یا بڑا کوئی نہ کوئی عربی مدرسہ موجود نہ ہو، اگر ان منتشر اداروں کی تنظیم عمل میں آجائے تو ملت کا انتشار بڑی حد تک دور ہوسکتا ہو۔ یہ کام بہت زیادہ اہم اور جمعیۃ العلماء کی فوری توجہ کا محتاج ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جمعیۃ کے بالغ نظر علماء اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں گے کہ عربی مدارس کی تنظیم درحقیقت علماء کی تنظیم ہو اور یہی ادارے حقیقتًا ان کی قوت کا مرکز ہیں۔ ضرورت ہو کہ جلد سے جلد ان درسگاہوں کے نمائندوں کو دعوت دیجائے کہ وہ کسی مرکز پر جمع ہوں اور باہم گفت وشنید کے بعد کوئی اجتماعی شکل اختیار کریں۔ اگر کسی ایک مرکز سے پوری وابستگی فی الحال دشوار ہو تو کم از کم یہی ہوجائے کہ ہر عربی درسگاہ ایک واحدہ (یونٹ) قرار پائے اور یہ واحدے ملکر اپنا ایک وفاق بنائیں۔

عربی مدارس کا نیا نظام

از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ

عربی مدارس کی اصلاح و تنظیم سے متعلق ان صفحات میں وقتاً فوقتاً مضامین شائع ہوتے رہے ہیں، اس موضوع پر مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ کی ایک مفصل تقریر، ندوہ کی جو کہ روداد میں نظر سے گذری، قارئین کے استفادہ کے خیال سے تقریر شائع کی جا رہی ہے۔ مدیر

اسوقت جس موضوع سخن پر مجھے کچھ کہنا ہو، آج سے بیس برس ہوئے کہ وہ مسلمانوں کے سامنے ایک درد انگیز داستان کی طرح بار بار دُہرایا گیا ہو، نطق و لفظ کے تماشا میں عجب نہیں کہ گھبرا اٹھیں، لیکن درد آشنا دلوں نے ہر بار اس سے نیا لطف اُٹھایا ہے۔

ذوقِ نظر بہ لذتِ کاوش نمی رسد		داغم ازیں کہ دل نتواں کرد دیدہ را

حاضرین اگر اسوقت بھی سراپا دل ہوں تو اُمید ہو کہ یہ حکایت مکرر ناگوار نہ گذرے گی،

حضرات! دار العلوم کی ضرورت اور اس کے فوائد پر ایک مبسوط تقریر، ندوہ کے ہر سالانہ جلسہ کا ایک جز رہی ہو، اس اجلاس سے پہلے ہر جلسہ میں جن بزرگوں نے اس موضوع پر تقریریں کیں، وہ دلائل، واقعات شواہد، اور جامعیت میں یقیناً بے نظیر تھیں، لیکن یہ پہلا موقع ہو کہ خود دار العلوم کا آغوش پروردہ آج اپنی ضرورت کا آپ اعلان کرتا ہے۔

زمانہ کے انقلاب اور حوادث کے تسلسل نے آج جو مشکلات ہمارے سامنے پیدا کر دیے ہیں، اُنمیں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ لائق توجہ مذہب اور مذہبی علوم کی بقا و حفاظت کا مسئلہ ہو، مسلمان آج اعتراضات اور حملوں کے آماجگاہ ہیں، لوگ کہتے ہیں ہاتھ بجائے قلم کے تیر اس کے کسب و تحصیل محال ہو، پاؤں بجائے کہ دبا پاؤں میدان میں تگاپو ناممکن ہو، لیکن میں کہتا ہوں کہ سینہ بجائے کہ اُسمیں دل ہو، جو زندگی کا گھر ہو، قومیت اسلامیہ کا

دل کیا ہو؟ مذہب ہو! تمام دنیا کی قوموں میں مذہب قومیت سے ہو لیکن مسلمانوں میں قومیت مذہب سے ہو۔
اگر یہ شیرازہ بکھرا تو قومیت اسلامیہ کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ جائیں گے۔

یہ روئے سخن اُن کی طرف تھا جو خود مذہب اور مذہبی علوم کی بقا و حفاظت کی ضرورت کے قائل نہیں لیکن جو لوگ اس حد تک ہمارے ساتھ ہیں اُن سے سوال ہو کہ اگر یہ ضروری ہو تو اب تک مسلمانوں کی طرف سے اس کے لئے کیا تدبیر عمل میں آئی؟ کیا ہماری انگریزی درگاہوں کے وسیع ایوان، کیا ہماری مذہبی تعلیم گاہوں کے تنگ و تاریک حجرے، کوئی جواب دے سکتے ہیں۔ کلا ثم کلا

ہندوستان جب انقلاب کی کشاکش میں تھا، چند روشن ضمیر بزرگوں نے موقع کی نزاکت اور اہمیت کو سمجھا، وہ اُٹھے، اور آواز دی، آواز ایسی شیریں اور دلپسند تھی کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اس کے جواب میں لبیک کی صدائیں آئیں، ندوہ کی مجلس مرتب ہوئی، علمائے ہند جن کا مشغلہ اسوقت صرف نزاع و کشاکش باہمی تھا، خواب سے چونکے، محبت اور ہمدردی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف بڑھے، اور بالآخر قوم کے تمام امراض کا علاج دارالعلوم قرار پایا۔

ہمنے کہا ہو کہ ہم اُس زخم کا علاج نہیں چاہتے جو ہاتھ میں ہو، اُس زخم کا علاج نہیں چاہتے جو پاؤں میں ہے، اُس زخم کا علاج چاہتے ہیں جو دل میں ہو۔ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب (حدیث) ہمارے قومی جسم کا دل علماء کی جماعت ہو۔ اگر یہ درست ہو تو ہمارے جسم کے دوسرے اعضاء خود بخود درست ہو جائیں گے۔ مسلمان ۱۳۲۲ برس سے دنیا میں ہیں، اُن کی سیزدہ صد سالہ زندگی صحیح مذہب، عظیم الشان کارنامے، مسلسل حکومتیں، متعدد علوم و فنون، اعلیٰ تمدن و معاشرت، قومی اخلاق، اور خصائص وروایتی کا مجموعہ ہو، مسلمانوں کی آیندہ زندگی کا مفہوم کیا ہو؟ یہ ہے، موجودہ ضروریات و مقتضیات کی مطابقت کے ساتھ اپنی قومیت کے قدیم اجزا کی حفاظت و نگہداشت، کہ اگر یہ اجزا نکل گئے تو بقیہ اجزائے قومیت مسلمانوں کے نہ ہوں گے بلکہ کسی اور نئی جنس قومی کے،

حضرات! اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو صرف تخیل نہیں ہے، وہ عمل کا طالب ہے، اور عمل اسکی حقیقت کا ایک جزء ہے، پھر عمل سے وہ صرف مخصوص طریقۂ عبادت و پرستش کو مراد نہیں لیتا، بلکہ ایک انسان کی زندگی کے وہ تمامتر کام جو اُسکی زندگی کے لوازم ہیں اس کے احاطہ میں داخل ہیں، اس بنا پر وہ اپنے پیرووں سے ایک مخصوص طریقۂ زندگی کا طالب ہے اور اسلئے اُس کو ایسے کارکن کی ضرورت ہے جو لوگوں کو اُنکی زندگی کے ہر شعبہ میں مشورہ دے سکے۔ وہ اخلاق بھی ہے، تمدن بھی ہے، علم بھی ہے، حکومت بھی ہے، اصلاح بھی ہے اور آخراً مذہب بھی ہے، اس بنا پر اس کے متبعین کے لئے ایسے راہبر مطلوب ہیں جو ان تمام شعبوں میں قوم کی رہبری کر سکیں، ضرورت کے ہر موقع کو پہچان سکیں، اصلاح و ہدایت کی ہر صنف میں چراغ راہ بن سکیں۔

یہ تشریح اگر صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو کیا ایسے علماء اسلام کی رہبری کر سکتے ہیں جو فقہ و معقولات کے چند ابواب کے سوا دنیا اور دنیا کے تمام شعبوں سے قطعاً بیخبر اور غافل ہوں، جو تمدن کا صحیح مفہوم نہ جانتے ہوں جو اخلاق کا کوئی نمونہ نہ رکھتے ہوں، جو ذوق علم و فن سے ناآشنا ہوں، جو مقتضیات حال سے ناواقف ہوں، جو سیاسیات کی گرہ کشائی سے عاجز ہوں۔

حضرات! آج مسلمانوں کی سیکڑوں ضرورتیں ہیں، لیکن مذہبی ضروریات کے بالائی قشر کے سوا اُن کو کس ضرورت کے اتمام و تکمیل کا احساس ہے، آج قوم کو تعلیم کی ضرورت ہے، تعلیم ہمیشہ سے علماء کے ہاتھ میں رہی ہے، لیکن تعلیم کی اشاعت و ضرورت کی آواز آج کس کی زبان و دہن سے بلند ہوتی ہے؟ اسکی ضرورت کا وعظ مسجد کے منبر سے قوم سُن رہی ہے، یا کانفرنس کے پلیٹ فارم سے عام اسلامی یونیورسٹی کی تحریک پیدا ہوئی لیکن کس نے پیدا کی، ترکی ٹوپی کے جھبوں نے، یا عماموں کے شملوں نے آج مسلمانوں کو اصلاح رسوم و تمدن کی ضرورت ہے لیکن اس ضرورت کے لئے مجلس کس نے بنائی آج ہر تحریک کس کے قلب و لسان کی حرکت ہے، اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اعضائے قومی کا سب سے معطل، سب سے بیکار سب سے ناکارہ وہی حصہ ہے جس کو سب سے زیادہ عامل سب سے زیادہ باکار اور سب سے زیادہ کارآمد ہونا چاہئے تھا۔

آج علما قوم میں کوئی پایہ نہیں رکھتے، اُن کے لئے عزت کا کوئی درجہ نہیں ہو، اُن کی آواز کو ملک میں کوئی سماعت حاصل نہیں ہو، حالانکہ یہ وہی گروہ ہو جس کا مسند فقر، تخت شاہی کا ہمپایہ تھا جس کا دلق پارینہ، قبائے نازو غرور سے ممتاز تھا جس کی آواز کے سامنے ملک کی ہر آواز پست تھی۔

حضرات! آخر اس انقلاب حال کے کیا اسباب ہیں؟ یہ عموج تمام ظاہر ہیں، وہ قوم کی کس خدمت کے سزاوار ہیں، وہ قوم کی کس تحریک کے لئے آمادہٗ اعانت ہیں، وہ قوم کی زندگی کے کس مقصد کو سمجھ سکتے ہیں وہ قوم کی کس ضرورت و مصلحت سے واقف ہیں، ایسی حالت میں وہ قوم سے کس خدمت کا معاوضہ اور صلہ چاہتے ہیں؟ ہم کو ایسے علما کی ضرورت ہو کہ قوم کی زمام اپنے ہاتھ میں لے سکیں، وہ ہر قومی تحریک کے بانی ہوں وہ ہر قومی ضرورت و مصلحت کے واقف کار ہوں، وہ قوم کے حقیقی و عملی رہبر ہوں، اس موجودہ کشمکش میں، وہ صحیح ہدایت و ارشاد کر سکیں۔

حضرات! آپنے دیکھا ہوگا، اور افسوس ہوا ہوگا کہ اسکول کا ہر بچہ آج کس دریدہ دہنی اور گستاخ طبعی سے مذہب، علوم مذہبی، بلکہ علوم عربی کی تحقیر کرتا ہو، علما کے ادب و احترام کو اُس نے فراموش کر دیا ہو، اُن کی عظمت کا تخیل دل سے محو ہو گیا، مولوی، اور جاہل کا مفہوم تقریباً اُس کے ذہن میں ایک ہو، یہ ایک گمراہی ہو، اور سچ ہو کہ یہ گمراہی ہو لیکن اس کا ذمہ دار کون ہو؟ وہ اسکول کا بچہ ہو یا کالج کا اسٹوڈنٹ ہے، اُس کے آس پاس علوم و فنون کا ڈھیر ہو، وہ ایسے پروفیسروں کی صحبت میں رہتا ہو جو علوم کے انتہائی مدارج تک پہونچ چکے ہیں، اُس کے سامنے دنیا کا ایک ایک گوشہ ہو، وہ قدرت و قوانین قدرت کا ماہر ہو، وہ ہر انسانی علم کی واقفیت کا دعویدار ہو، دوسری طرف اسکو وہ علما نظر آتے ہیں جو ایک ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے گھر سے باہر کی خبر نہیں رکھتے، وہ علوم انسانی کے نام سے بھی واقف نہیں وہ خود اپنے ملک کے جغرافیہ سے آگاہ نہیں، وہ موجودہ دنیا کی ہیئت سے عاجز ہیں، اس حالت میں اگر وہ ان کو عزت کا مستحق نہیں سمجھتا تو کیا وہ حق بجانب نہیں ہو، ایک وہ زمانہ تھا جب علما ہی علوم و فنون کے مالک تھے، دنیا کی کنجی اُنھیں کے ہاتھ میں تھی دنیا کا

گزشتہ گوشۂ اُن کے پائے بادیہ پیما کے نیچے تھا علم کی تلاش وجستجو میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے وہ اندلس سے بغداد اور بغداد سے اندلس جاتے تھے، علم وحکمت کے شہپر اُن کے بازوؤں میں لگے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ایک طرف منبر تو دوسری طرف تخت شاہی اُن کے لئے جھک جاتے تھے۔

حضرات! اگر ہماری قوم میں ایسے علما پیدا ہوں جو مذہبی علوم کی واقفیت ومہارت کے ساتھ تمام جدید علوم میں بھی عام افراد تعلیم جدید کے ہمپایہ ہوں تو کوئی سبب نہیں ہو کہ وہ قوم میں عزت کے لائق نہوں، اور وہ ملک کا سب سے بہتر طبقہ نہوں، آہ! کسقدر افسوس کی بات ہو کہ ہماری جہالت وکمزوری خود ہمارے مذہب کی عظمت ووقار کو کھو رہی ہی، خدا فرماتا ہو کہ "ربنا لاتجعلنا فتنۃ الذین کفروا" خدایا ہم کو کفار کے لئے فتنہ نہ بنا، یعنی ہماری حالت ایسی نہ بنا کہ کفار ہم کو دیکھکر کہیں کہ کیا اسلام کے یہی نمونہ ہیں اور ہم کو دیکھکر خود ہمارے اسلام سے پھر جائیں، حق حوکہ ہم کہیں "ربنا لاتجعلنا فتنۃ للناس" خدایا ہم کو دنیا کے لئے فتنہ نہ بنانا، کہ دنیا کی متمدن وصاحب علم قومیں دیکھکر کہیں کہ کیا یہی ہم اسلامی کے نمونے ہیں؟ کیا یہ جہالت بے دانشی کا صنم خانہ اسلام کا کعبہ ہے؟

حضرات! ہماری مذہبی تعلیم کے نقص کا تمامتر ذمہ دار ہمارے مدارس دینیہ کا نصاب تعلیم ہی، ان مدارس کا مایۂ امتیاز جو فنون تھے علم کے بازار میں اس جنس کاسد کی مانگ نہیں، علوم کی دو قسمیں ہیں، علوم آلیہ اور علوم مقصودہ، علوم آلیہ کا کام صرف یہ ہی کہ وہ علوم مقصودہ کی تحصیل میں معین ہوں، ورنہ ہماری کوشش کا اصل وحقیقی مرکز علوم مقصودہ ہونا چاہئے لیکن چالیس پچاس برس سے جو نصاب زیرعمل ہی بدبختی سے اسکا بڑا حصہ علوم آلیہ ہیں، صرف ونحو علوم آلیہ ہیں ان کا مقصد صرف زبان کے حصول میں سہولت اور کلام کی تصحیح ہی لیکن یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہو کہ صرف ونحو کی تکمیل کے بعد طلبا عربی زبان پر کوئی قدرت نہیں رکھتے ہیں، ادب میں چند کتابیں متنبی، حماسہ، سبعہ معلقہ پڑھائی جاتی ہیں لیکن حاشا کہ ان کے رٹ لینے کے بعد عربیت کا مذاق بھی پیدا ہو، سبب یہ ہو کہ انسان کو روزمرہ زندگی میں نظم سے زیادہ نثر کی حاجت پڑتی ہو اور اس کا کوئی

نمونہ طلبہ کے سامنے نہیں ہوتا، رہ سہہ کے ایک ابوالقاسم حریری کے مقامات ہیں، جنمیں بند ھے ہوئے فقرے تکلف اور تصنع کے بند و زنجیر میں جکڑے ہوئے ادا ہوتے ہیں، ضرورت ہو کہ نصاب تعلیم میں عربی نثر کی ایسی کتابیں ہوں جنمیں روزمرہ، محاورہ اور بے تکلف و بے تصنع، رواں زبان استعمال کیگئی ہو، جنمیں ہر قسم کے مضمون آجاتے ہوں، ایسی کتابیں جاحظ ابو ہلال عسکری، ابن اثیر عبدالقاہر جرجانی، ابن قدامہ، ثعالبی، ابن خلدون وغیرہ کی تصنیفات ہیں۔

ایک اور بات جسپر مجکو ہمیشہ ہنسی آتی ہے وہ فن معانی و بیان و بدیع کی تعلیم ہو، ان فنون کی تعلیم سے مقصد فصاحت و بلاغت کی تحصیل ہو، لیکن ان کتابوں سے جو اس غرض سے پڑھائی جاتی ہیں کبھی کبھی یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، ہمارے یہاں خود کتابوں میں لکھا ہو کہ بدیع کا درجہ معانی و بیان کے بعد ہو، لیکن حریری کا تنہا نمونہ جو طلبا کے سامنے ہوتا ہو وہ بدیع کی وقعت ہمیشہ اُن کی آنکھوں میں بڑھا دیتا ہو، اسلئے بہت کم آپ ایسے علما پائیں گے جو سلیس و بامحاورہ اور رواں عربی عبارت کو پسند کرتے ہیں، وہ ہمیشہ قافیہ بندی، صنائع لفظی، تجنیس و تضاد وغیرہ کو معراج بلاغت سمجھتے ہیں، اور حضرات! یہ چیزیں ایک صاحب مذاق سخندان کی ملت میں بدعات ہیں، اس نقص کا ذمہ دار بھی ہمارا نصاب تعلیم ہو کہ سامنے نمونہ نہیں، مختصر معانی اور مطول بیشک منطقی حدود کے ساتھ فن معانی و بیان کی بہترین کتابیں ہیں، لیکن انکی مثال بعینہ ایک عالم بے عمل کی ہو، یہ کتابیں منطقی حدود و دلائل و تقسیم کے ساتھ مسائل کو خوبی سے بیان کرتی ہیں، لیکن ان کی عبارت خود معیار بلاغت سے گھٹ کر ہو، اُن کی عبارت اور منطق و فلسفہ کی عام بے مزہ اور پھیکی بلکہ غیر فصیح عبارت میں کوئی فرق نہیں ہوتا، ایسی کتابیں کیا فصاحت و بلاغت اور مذاق ادب کا جوہر پیدا کرسکتی ہیں، نصاب میں ایسی کتابیں چاہئیں جو علماً تعلیم و تشریح مسائل کے ساتھ عملاً خود بھی معیار کے مطابق ہوں، کہ ان کے پڑھنے سے خود بخود عملی طور سے مذاق درست ہو جائے مثلاً دلائل الاعجاز، اسرار البلاغۃ مثل السائر، کتاب الصناعتین وغیرہ یہ کتابیں دارالعلوم کے نصاب میں داخل ہیں اور بحمداللہ ان سے

وہ فوائد حاصل ہوتے ہیں جو مختصر معانی کے سیکڑوں بار اور مطول کے ہزاروں بار پڑھنے سے حاصل نہیں ہوسکتے اور اسوقت اعلان ہو کہ آپ حضرات میں سے جس کا جی چاہے امتحان کرلے۔

حضرات! یہ تو صرف ایک علم کے متعلق بحث تھی، منطق و فلسفہ کا کیا حال ہو؟ منطق ایک ایسا مکمل علم ہو جسمیں تغیر و تکمیل کی اب حاجت نہیں، گو اب یورپ میں منطق کا جو نظام قرار پایا ہو، استقرا کو جس حد تک اہمیت دی گئی ہو وہ بالکل ایک حیثیت سے صحیح ہو، لیکن اصل منطق ریاضی کی طرح تکذیب و ابطال کی چیز نہیں ہے، منطق کا مقصد یہ ہو کہ انسان کا دماغ دلائل کی صحت کا امتحان کرسکے، باقی مباحث اسی مقصد کے فروع ہیں۔ یہ مقصد کہاں تک حاصل ہوتا ہو؟ نتیجۂ عملی تو یہ ہو کہ ایک منطق خواں عربی طالب العلم، ایک غیر منطق خواں عربی طالب العلم سے زیادہ کج بحث اور کج دماغ ہوتا ہو ٹھیک اس طرح جس طرح موجودہ نصاب کی ادبی کتابیں مذاق زباں دانی کو برباد کردیتی ہیں اسی طرح موجودہ طرز تعلیم منطق دماغ کی صحیح الخیالی اور راست فہمی کو نیست و نابود کردیتی ہو، سبب یہ ہو کہ ہمارے موجودہ نصاب میں منطق کی جو کتابیں داخل ہیں وہ بجائے اس کے کہ صحیح اور سلجھے ہوئے طریقہ سے مسائل کو بیان کریں، ہمہ وقت آفرینی، ژولیدہ بیانی اور اشکال پسندی سے مسائل کو بیان کرتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ ابتدا سے عربی کا طالب العلم ژولیدہ بیان، مناظرہ پسند متعصب الرائے اور خود پسند ہوجاتا ہو، وہ ہمیشہ اپنا مقصود ایسی عبارت میں اور ایسے دلائل سے ثابت کرتا ہے جس کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے اور اس کا نصب العین صرف یہ ہوتا ہو کہ فریق کی زبان بند کردے، اور بس! اس بنا پر بجائے اسکے کہ منطق سے طالب العلم کا دماغ درست ہو اور زیادہ خراب ہوجاتا ہو، اور عجب نہیں کہ اسی سبب سے ہمارے علما، زیادہ جنگجو اور نزاع پسند ہوتے ہیں۔

حضرات! ضرورت ہو کہ ان کتابوں کی جگہ پر ایسی کتابیں منطق کی نصاب میں داخل ہوں جو سہل و آسان اور واضح طریقہ سے سیدھی سیدھی عبارت میں اصل فن کے مسائل کو بیان کریں مثلاً ابن سینا کی منطق المشرقیین، غزالی کی محک النظر، یا ایک دوسرے مصنف کی کتاب بصائر نصیریہ

حضرات! ہماری تعلیم کا سب سے بڑا جز فلسفہ ہے، اور وہ اس طرح ضروری اور لازم غیر منفک ہو گیا ہے کہ ممکن ہے کہ عربی کا طالب العلم تفسیر کا صرف ایک ہی صفحہ یا ایک ہی پارہ تمام عمر میں پڑھے لیکن فلسفہ کی تعلیم دو تین سال صرف کئے بغیر کوئی مستند عالم نہیں ہو سکتا، ایک وہ زمانہ تھا کہ فلسفہ پڑھنا گناہ اور زندقہ تھا امام شافعیؒ اور ابن حنبلؒ وغیرہ نے اسپر فتوے دیے، امام غزالیؒ کے بعد سے یہ حال ہو کہ یہی فلسفہ کی کتابیں ہیں جسمیں بیسیوں مسئلے حقیقت میں کفر و زندقہ ہیں، تاہم بڑی بڑی مذہبی درسگاہوں میں زور و شور سے اس کی حقیقت صحت پر دلیلیں قائم کی جاتی ہیں اور متکلمین اسلام کی علانیہ ہنسی اُڑائی جاتی ہے ۔

گر تو قرآں بریں نمط خوانی　　　ببری رونقِ مسلمانی

پھر تعجب ہو کہ آج فلسفۂ جدیدہ سے یہی لوگ نفرت کلی ظاہر کرتے ہیں، اور بغیر پڑھے ہوئے اس کے ہر مسئلے کی تردید و تغلیط کے لئے ہمہ تن تیار ہیں حضرت الاستاذ نے خوب فرمایا ہو کہ "فارابی بننے سے پہلے غزالیؒ بننا حماقت ہو" حقیقت میں پہلے فلسفہ فارابی کی طرح پڑھو پھر غزالیؒ کی طرح کلام بناؤ، ورنہ بغیر اس کے ہر کوشش مسخرہ ہے ۔

حاضرین! آپکو حیرت ہوگی کہ نہ فلسفۂ قدیمہ اسلام کا جز ہو، اور نہ فلسفۂ جدیدہ، نہ یہ میراث ہو نہ وہ، پھر کیا سبب ہو کہ فلسفۂ یونانی کے ساتھ ہمکو وہ شغف ہو کہ اُس کا ایک نقطہ بھی مٹ جائے تو ہم کو دلی افسوس و رنج ہوتا ہے، حقیقت میں گو ہنسی کی بات ہو لیکن ہمارے مخدوم مولانا شاہ سلیمان صاحب نے خوب فرمایا کہ ایک پرانی لٹھیا بھی کسی کے پاس مدت تک ہاتھ میں رہتی ہو تو اس کے بھی گم ہو جانے کا افسوس ہوتا ہو پھر یہ فلسفۂ یونانی صدہا سال سے ان کے دماغوں میں جاگزیں ہو، اُس کا چھٹنا کیوں ناگوار خاطر نہو۔ لیکن اے حاضرین! اُن پرانی لٹھیوں والوں کی خدمت میں التماس ہو کہ یورپ سے نئی بنائی نہایت عمدہ خوبصورت اور مضبوط چھڑیاں آ گئی ہیں، جائیے اب اُن کو خریدیے ۔

تعجب ہو کہ فلسفۂ قدیمہ کن مسائل سے عبارت ہو؟ فلسفہ کی تعریف یہ ہو کہ "کائنات کی اشیاء کا علم

بقدر طاقت بشری"، لیکن سوال یہ ہو کہ اس فلسفہ سے کائنات کی کن اشیا کا ہم کو علم ہوتا ہو، دقیق اور مخفی قوتی کے علم کو جانے دو، کیا اس کو پڑھ کر ہم کو زمین کا علم ہوتا ہو؟ کیا پہاڑ کا علم ہوتا ہو، کیا نباتات کا علم ہوتا ہو؟ کیا معدنیات کا علم ہوتا ہو، کیا اجسام کا علم ہوتا ہو؟ کیا چاند سورج اور ستاروں کا علم ہوتا ہو، کیا قوانین فطرت کا علم ہوتا ہو؟ ہیولی، صورت، زمان، مکان، حیز، اسی قسم کی چند مرعوب کن اصطلاحیں ہیں اور ان کا ایک جال پھیلا ہوا ہو، اور انسان اسمیں گرفتار ہو، ہمکو وہ فلسفہ پڑھنا چاہئے جسمیں فرضیات کے بجائے واقعیات کا علم ہو، اور جس سے حقیقت میں ہم کائنات کے اسرار سے واقف ہوں۔

حضرات! ابتک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہو اُس سے قطع نظر کر لیجئے، عربی مدارس کا دوسرا نام مذہبی مدارس ہو، انکی تاسیس و بنا کی اصل غرض، قرآن مجید، حدیث شریف، فقہ و کلام وغیرہ، علوم دینیہ کی تعلیم ہو یہ تمام علمائے کرام ہمارے سامنے ہیں، جنمیں سے اکثر بڑے بڑے مدرسوں کے مدرسین اور بانی ہیں، یہ خود شہادت دے سکتے ہیں کہ ان کے مدارس میں جو نصاب تعلیم ہو دیگر علوم دنیوی کے مقابلے میں ان علوم دینیہ کا کیا پایہ ہو عام مدارس کو چھوڑ کر خاص مذہبی مدرسوں سے سوال ہو کہ کیا وہ قرآن مجید کا باقاعدہ درس دیتے ہیں جسمیں باقاعدہ قرآن مجید کے مطالب و حقائق پڑھائے جاتے ہوں، تفسیر کا جو حصہ زیر درس ہو کیا وہ سورۂ بقرہ سے جو تمام قرآن کا بیسواں حصہ ہو گا آگے بڑھتا ہو؟ جلالین کامل کا شاید نام لیا جائے جو اکثر مدارس میں پوری پڑھائی جاتی ہو، لیکن اُسکی ناتمامی اور اختصار کا یہ حال ہو کہ عجب نہیں کہ قرآن کی اصل عبارت اور تفسیر کے الفاظ برابر ہوں، کیا قرآن مجید کے مشکلات صرف و نحو پر اُن کو عبور ہو، قرآن مجید کی فقہ سے واقفیت ہو، ہمارے علماء ہدایہ سے مسائل لکھدیں گے، لیکن خود قرآن جو اصل دین اور مخرج علوم ہو کیا اُس سے بھی واقف ہیں، قرآن مجید کا علم کلام کیا ہو؟ شرح عقائد نسفی پڑھانے والوں سے پوچھتا ہوں کہ وہ اُس سے آگاہ ہیں۔ قرآن مجید میں فصاحت و بلاغت کی کیا کیا مثالیں ہیں، کیا اُن کو یاد ہیں؟ اور ہاں پوچھتا ہوں کہ قرآن مجید میں اخلاق و معاشرت اور تمدن کے قواعد ہیں کیا انکی تشریح اُن کے مدارس میں کی گئی ہو،

حدیث شریف کی تعلیم کا آپ دعویٰ کریں گے کہ بہت سے مدارس میں زور شور سے ہوتی ہو لیکن میں عرض کروں گا کہ ہاں زور شور سے ہوتی ہو لیکن یہ سارا زور صرف اس مسئلہ پر ہو کہ حدیث کا ہر ٹکڑہ فلاں مجتہد کے اجتہاد اور مذہب کے مطابق ہو، حاشا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اسلئے نہیں آئے تھے کہ وہ کسی جماعت کا اجتہاد اور مذہب دنیا کو سکھائیں، وہ ایک عام تعلیم وہ ایک عام ارشاد، وہ ایک عام ہدایت لیکر مبعوث ہوئے تھے۔ کیا حدیث کی تدریس کے وقت یہ بھی مدنظر رہتا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک پیغمبر کی حیثیت سے جو تعلیم و ارشاد پیش کرتے ہیں وہ کہانتک دُنیا کے فوز و فلاح کے لئے ضروری ہو، آپ دنیا کو اخلاق کی کیا تعلیم دیتے ہیں، احادیث میں غلطی سے جو قابل اعتراض واقعات مذکور سمجھے جاتے ہیں کیا اُن کی تلاش کی جاتی ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک پر احادیث کا کیا اثر ہوا اسکی جستجو ہوتی ہو، مصنفین کتب صحاح رواۃ حدیث اور دیگر رجال متعلقین حدیث کی تاریخ سے ہمکو واقفیت ہوتی ہو، آج اس صف میں کتنے علما ہیں جو بخاری، مسلم، ترمذی کا نام روزانہ اپنی زبان سے ادا کرتے ہیں، کیا وہ اُن کے اصلی نام و نسب و حالات اور تصنیف کی تاریخ و خصوصیات سے آگاہ ہیں؟

یہ تو مصنفین ہیں، رواۃ میں سلیمان، شعبہ، زہری، مکحول، نافع، سالم، قاسم، ابن معین، اوزاعی، مدینی وغیرہم کبار رجال ہیں کیا ان کے حالات کی واقفیت میں طلبائے حدیث کی زندگی کا کوئی حصہ گذرتا ہو، سب سے بڑی بات یہ ہو کہ حدیث کی کتابیں تنہا عبادات کی کتابیں نہیں ہیں، وہ اسلام کی اجتماعی، سیاسی، اخلاقی، قانونی کتابیں ہیں، کیا حدیث شریف کی تعلیم میں یہ حیثیتیں مدنظر ہوتی ہیں؟

حضرات! اب علم کلام کی نسبت کچھ کہنا چاہتا ہوں، علم کلام پہلے اُس فن کا نام تھا جسمیں اعتقادات مذہبی کو عقلی دلائل سے مستحکم کیا جاتا تھا، لیکن اے حاضرین اب علم کلام کا دائرہ اس سے زیادہ وسیع ہوگیا ہو اب وہ نام ہو ہر اُس مسئلہ کو دلائل عقلی سے مستحکم کرنے کا جس کو مذہب اپنی جانب منسوب کرتا ہو، اب مذہب پر اعتراضات اعتقادات کی حیثیت سے جسقدر کئے جاتے ہیں اُن سے کہیں زیادہ وہ اعتراضات ہیں جو

معاشرت وتمدن کے لحاظ سے کئے جاتے ہیں، عبادات کے ایک ایک جزء کو قرین عقل و پرفوائد دکھانا اب علم کلام ہو، نکاح، طلاق، غلامی، سود، جزیہ، کب علم کلام کا حصہ تھا، اب ان تمام تمدنی واقتصادی چیزوں سے واقفیت متکلم کا فرض ہو، تاریخ اسلام کا ایک ایک نقطہ اب علم کلام کے دائرے میں ہو، حضرت سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک کا ایک ایک واقعہ اب علم کلام کا ایک ایک مبسوط باب ہو، اب ضرورت ہو کہ ہمارے طلبا، جو ایک متکلم کی حیثیت سے میدان میں کھڑے ہوں وہ نہ صرف یونانی فلسفہ کے چند پارینہ مسائل کے حافظ ہوں، بلکہ سائنٹسٹ ہوں، اسٹرانومر ہوں، ایکانومسٹ ہوں، اور تقریبًا ہر فن سے آشنا ہوں۔

اے حضرات! یہ ڈیفنس (دفاع) کے ہتھیار تھے، دوسرے مذاہب کے مقابلے میں حملہ آور ہونا ابتک متکلم کا فرض نہ تھا، اب ضروری ہو کہ جو اسلام کی حمایت کے لئے کھڑا ہوتا ہو جس طرح وہ بچاؤ کے پہلو جانتا ہو وہ حملہ کے وار بھی جانتا ہو، وہ یہودیت سے واقف ہو، وہ مجوسیت سے واقف ہو، وہ عیسائیت سے واقف ہو، وہ ہندؤوں کے مذہب سے واقف ہو، اس بنا پر اب صرف قرآن پڑھنا متکلم کے لئے کافی نہیں ہو، توراۃ، زنداوستا، انجیل اور وید پڑھنا بھی ضروری ہو۔

سائنس اور فلسفۂ جدیدہ کے مقابلے میں جو متکلم کا فرض ہو وہ اس سے بھی زیادہ اہم ہو، میں فلسفۂ جدیدہ و قدیمہ پر اسوقت ریویو نہیں کرتا، بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں اور اُمید ہو کہ حاضرین اس فرق کو اچھی طرح سمجھیں گے کہ فلسفۂ قدیمہ مخاطب کی زبان کو بند کرتا ہے دل کو بند نہیں کرتا، فلسفۂ جدیدہ صرف دل کو بند کرتا ہو زبان کی پروا نہیں کرتا، یہ بالکل ممکن کہ ایک متشکک فی الدین کے دل میں ایک زخم (شک) ہو تم فلسفۂ قدیمہ کے پرپیچ استدلال سے اُسکی زبان بند کردو، لیکن قلب کو تسکین نہیں دیسکتے، لاجرم دل کا زخم بڑھے گا، اور ایک دن تمام جسم کو ہمہ تن ناسور کردے گا، علمائے کرام، دل کی خبر لو، زبان کی بندکنا دسے کیا فائدہ؟ تسلیم ہو کہ وہ تمھارے مشکل الفہم دردپر اصطلاح اعتراض پر خاموش ہوجائے، لیکن کیا اس سے قلب میں اطمینان پیدا ہوا جو ایمان کا عنصر حقیقی ہے۔

متکلم کا فرض ہو کہ مذہب پر جو اعتراضات واقع ہوتے ہیں اُن کو دور کرے، آج مذہب کا سب سے بڑا دشمن "جدید فلسفہ" ہو لیکن اس حملہ آور کے حملوں کو قدیم فلسفہ سے روکنا توپ کے گولہ کو تلوار سے روکنا ہو، سب سے پہلے ہمکو خود اعتراضات سے واقف ہونا چاہئے، اور اس کے لئے علوم جدیدہ سے واقفیت لازم، اس کے بعد وہ وقت آئے گا جب ہم خود یورپ کے بنے ہوئے ہتھیاروں سے یورپ کی فوج کا مقابلہ کرسکیں گے، ہم کو تسلیم ہے کہ اسلام ایک مضبوط و مستحکم اور رو ئین تن قلعہ ہو، لیکن آؤ کہ اسلام کے لئے ہم آج جدید طرز کے قلعے بنائیں کہ وہ دشمنوں کے جدید ہتھیاروں سے بھی امن پائے۔

حضرات! اسوقت کی صحبت دراز ہوتی جاتی ہے، اور شاید آپ میں سے اکثر صاحب اکتا بھی گئے ہوں، لیکن اگر میں ایک اور ضرورت کی طرف آپ کو توجہ نہ دلاؤں گا تو یقیناً اپنے جرم کا مجھکو دل میں اعتراف کرنا پڑے گا ہم سب کا اعتقاد ہو کہ اسلام ایک عالمگیر اور عمومی مذہب ہو، اُس کو دنیا کے ہر گوشہ میں پھیلنا ہو، اُس کو ہر ملک و ملت کے سامنے پیش ہونا ہو، اُس کو ہر زبان میں ادا ہونا ہو، لیکن یہ فرض کس کا ہو؟ کیا علمائے کرام کا نہیں ہو؟ لیکن کیا افسوس کے قابل یہ امر نہیں کہ انگلینڈ میں اشاعتِ اسلام کا کام کون انجام دے رہا ہو، کوئی عربی خواں نہیں! کوئی عالم نہیں! کوئی ہماری جماعت کا ممبر نہیں! ایک انگریزی داں، ایک گریجویٹ! ایک باہر کا آدمی!

کامل اس فرقۂ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

حضرات! ہمارا یہ اعتقاد ہو کہ اسلام کی ہر ملک و زبان میں اشاعت فرض ہو، کہ حق کی آواز ہر جگہ گونجے، قرآن کہتا ہو "وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ" تو اے وارثینِ پیغمبر! تم نے اس رحمتِ عالم کو دنیا کے کس کس حصہ میں پہونچایا، خدا کہتا ہو "اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ کَافَّةً لِّلنَّاسِ" اے حاملینِ علمِ نبوی! تم نے یہ رسالت کہاں تک ادا کی، اگر یہ سچ ہو کہ اسلام کو ہر ملک و زبان میں روشناس کرنا اور قرآن کی آواز ہر گوشہ میں پہونچانا فرض ہو تو یقیناً اس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ تمام دنیا کی قوموں میں پھرنا، تمام دنیا کے ملکوں میں جانا۔

تمام دنیا کی زبانوں کو سیکھنا، ہم پر فرض واجب ہو، پھر کہاں ہیں وہ علمائے کرام، جو صرف ایک عربی زبان جان لینے کے بعد جس کے جاننے کے بھی یہ معنی ہیں کہ وہ اُس زبان کی کتابیں پڑھ لیتے ہیں، لکھ بول نہیں سکتے تمام دنیا کی زبانوں سے اپنے کو مستغنی قرار دیچکے ہیں بلکہ غیر زبان کو سیکھنا وہ بدعت و حرام جانتے ہیں، آج فارسی زبان وہ خوشی سے بولتے ہیں، کیا یہ مجوس کی زبان نہیں، وہ ہندوستان آکر ہندی اور بھاشا بولنے لگے، کیا یہ غیر زبان نہیں؟ کیا انھیں یاد نہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کو عبرانی زبان کی تعلیم دلائی تھی جو اہل کتاب کی زبان تھی، خدا فرماتا ہو "وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ" ہم ہر پیغمبر کو اُس کی قوم کی زبان دیکر مبعوث کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لئے پیغمبر تھے وہ اپنی قوم عرب کو پیغام سناگئے، اب اُن کے پیروؤں کا فرض ہو کہ وہ تمام دنیا کی زبانیں سیکھیں، اور اپنے پیغمبر کے فرض کو جو اُن پر خود اُسی نے عائد کیا ہو مکمل کریں۔

حضرات! اسلام ایک بلند حوصلہ اور بلند نظر مذہب ہو جس کے لئے ایک مخصوص تربیت کی ضرورت ہے جو اس کے مقتداؤں میں بلندیٔ حوصلہ، استغنائے طبع، وسعت نظر، پیدا کرے، وہ اخلاق عالیہ کے بہترین نمونہ ہوں، صفائی، پاکی، تنزہ، جو علمائے سلف کی خاص صفت تھی۔ آج اُسکی سخت ضرورت ہو کہ بغیر اسکے انسان آج کسی سوسائٹی میں شریک نہیں ہوسکتا، اسلام کا داعی جس کو ہر سوسائٹی میں پہونچنا چاہئے اس کو ان صفات سے کسقدر متصف ہونا چاہئے۔ آپ میں سے ہر شخص سمجھ سکتا ہو، لیکن جو تربیت آج عربی خواں طلبہ کو مدارس میں حاصل ہوتی ہو کیا اُس سے اس قسم کی بلند حوصلگی، استغنا اور طہارت و تنزہ کا خیال پیدا ہوسکتا ہو؟ اسکی دلیل مشاہدہ ہو۔

حضرات! ہم نے آپ کے سامنے جس قسم کے علما کی، جس قسم کے نصاب تعلیم کی، جس قسم کی تربیت کی ضرورت پیش کی ہو کیا وہ حقیقی نہیں؟ کیا ان اصلاحات کی حاجت نہیں؟ آپ اسوقت جس ایوان عمارت میں ہیں وہ وہی اصلاحی درسگاہ ہو جس کا اساس بنا ان اصلاحات کے ساتھ اس قسم کے علما پیدا کرتا ہو۔

ہم سب کو خداوند جل وعلا کا سپاس گذار ہونا چاہئے کہ اُس نے ہم مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت پیدا کی جس نے قوم کے اصلی مرض کی تشخیص کی اور اس کا علاج کیا، دار العلوم سپاہیوں کی ایسی جماعت پیدا کرتا ہے جو موجودہ میدان میں کام آسکیں، وہ ایسے طبیب تیار کرتا ہو جو موجودہ امراض میں کارآمد ہو سکتے ہیں، دار العلوم نے ابتک جو کچھ کیا وہ حقیقت میں لائق صد شکر ہو، ایک وہ زمانہ تھا جب اصلاح کی آواز کفر کے ہم معنی تھی، جب اس کے لئے تکفیر کے فتوے جاری کئے گئے، جب ان کو بدعتی کہا گیا، لیکن آج بیس برس کے بعد وہ آواز نامانوس نہیں رہی، دیوبند کی عظیم الشان درسگاہ میں اصلاح ہوتی ہو ہم خوش ہیں کہ دار العلوم کام کر رہا ہو، فرنگی محل میں انگریزی اور بعض علوم جدیدہ داخل کئے جاتے ہیں ہم مسرور ہیں کہ دار العلوم اپنا فرض ادا کر رہا ہو، حیدرآباد میں نئے اُصول پر عربی درسگاہ قائم کی جاتی ہو، ہم محظوظ ہیں کہ دار العلوم کی تکمیل ہو رہی ہو، ہندوستان سے باہر نیل کی وادی میں ازہر کی یونیورسٹی صدائے اصلاح بلند کرتی ہو، اور مصر کی ممتاز مذہبی جماعت دار العلم والارشاد کی بنیا ڈالتی ہو، اور اعلان کرتی ہو کہ علمائے ندوہ کا طرز ہمارا رہنما چراغ راہ ہو، باسفورس کے ساحل پر قسطنطنیہ کے گنبد صدائے اصلاح سے لرزاں ہیں، ندوۃ العلماء کی آواز اُسکی فضا میں گونجتی ہو، روس کی حکومت میں جدید طرز پر عربی مدارس بن رہے ہیں، کیا یہ ندوہ کی کامیابی نہیں؟ کیا یہ دار العلوم کے مقاصد کی تکمیل نہیں، ندوہ اور دار العلوم کا صرف وہی کام نہیں ہو جو اس کے احاطۂ عمارت میں ظہور پذیر ہو، وہ تمام کام ندوہ اور اس کے دار العلوم ہی کا کام ہو جو اصلاح کے نام سے دنیا کے ہر عربی اور مذہبی مدرسہ میں ہو رہا ہو، تاہم ندوہ اور دار العلوم نے جو کچھ کیا ہو وہ کم ہو اور جو کچھ انکو کرنا ہو وہ بہت زیادہ ہے۔ وما توفیقی الا باللہ وھو حسبی ونعم الوکیل

ارکان واعیان ندوہ

حضرت مولانا قاری سید شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی علیہ الرحمہ

از مولانا سید شاہ عزالدین صاحب ندوی پھلواروی

ولادت شب یازدہم محرم الحرام ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۰ اگست ۱۸۵۹ء کو پھلواری شریف میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی حضرت مولانا شاہ حکیم محمد داؤد الہاشمی القادری تھا۔ اور آپ کا خاندان زمانۂ دراز سے علم وعرفان کا گہوارہ تھا۔

بیعت آپکے خسر مصباح الطالبین حضرت مولانا شاہ علی حبیب نصر پھلواروی تھے شیخ العالم حضرت حاجی امداد اللہ چشتی مہاجر مکیؒ اور حضرت مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ، آپکے مرشدین کاملین میں تھے، بیعت طریقت آپنے اپنے خسر سے سلسلۂ قادریہ میں کی لیکن تعلیم واجازت وخلافت تمام طرق مروجہ کی اپنے شیوخ ہند وحرمین سے حاصل کی، اخذ بیعت وتعلیم طریقت مرید کی اپنی صلاحیت ومیلان کے مطابق کرتے تھے لیکن بایں ہمہ چشتیت کا غلبہ آپ میں بہت نمایاں تھا۔

تعلیم وتکمیل کتب درسیہ حضرت نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر کے بزرگوں سے حاصل کی، اور قدیم نصاب تعلیم کے ماتحت میبذی وملا حسن تک اپنے وطن میں پڑھا، پھر استاذ الہند مولانا عبد الحی الانصاری فرنگی محلی سے تکمیل فرمائی اور دورتکمیل حدیث حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری اور حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی سے کی، نیز صحاح ستہ اور دیگر سنن ومسانید کی اجازتیں آپ کو شیوخ حجاز وحرمین سے حاصل ہوئیں، آپکے شیوخ حدیث فی الہند والحجاز کی تعداد ستر سے متجاوز ہے۔

حضرت کی شخصیت اور تصانیف حضرت اپنے عصر کے اُن چند وسیع النظر علماء ربانی میں سمجھے جاتے تھے جن کی نظیر ہندوستان کے طول وعرض میں مشکل سے مل سکتی تھی، آپ کی وسعت معلومات، وسعت مطالعہ

جامعیت، عدیم النظیر تھی، بڑے بڑے علما آپ سے استفادہ کرتے تھے، آپ بیک وقت ایک اچھے ادیب، بلند پایہ معقولی ومنقولی اور بے نظیر مذکر تھے، آپ کا وعظ اتنا مؤثر وجاذب قلوب ہوتا تھا کہ جس اجتماع میں آپ ہوتے آپکے سوا ہر آواز ماند پڑجاتی تھی، آپکے وعظ سے عالم، جاہل، مشائخ، انگریزی داں، عربی خواں قدیم وجدید دونوں خیال کے لوگ یکساں دلچسپی رکھتے تھے۔ آپکے اثر وعظ سے غیر مسلموں کی ایک کثیر تعداد آپکے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوتی تھی، آپ پہلے شخص ہیں جس نے میلاد خوانی کے غلط طریقہ کو موقوف کرکے زبانی بیان میلاد اور سیرت نبویؐ کی اشاعت کی ابتدا اور ترویج فرمائی اور خود اپنی خانقاہ میں ربیع الاول شریف کی چاند رات سے بارھویں رات تک صحیح سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ بیان شروع کیا، جو اب تک بحمداللہ جاری ہے۔ آپنے مختلف عنوانوں پر مختلف تصنیفیں کتاب ورسالے کی شکل میں فرمائی ہیں جن کو میں ذیل میں درج کروں گا آپ جو کچھ بھی لکھتے وہ نہایت عالمانہ ومحققانہ لکھتے آپ کی تصنیفوں میں دلائل کی فراوانی زور استدلال بہت کافی ہوتا، دینی علوم میں علم تصوف پر آپکی وسیع وعمیق نظر، عصر حاضر کی دنیائے تصوف میں بےمثال اور مسائل تصوف میں آپ کی ذات اور آپ کی تحقیق کو سند وحجت مانا جاتا تھا۔ ہر خانوادۂ علم وعرفان سے آپکا گہرا تعلق تھا، اور تمام خانوادہ ہائے علم وتصوف آپکی بیحد قدر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سارے اکابر واصاغر دیوبند وغیرہ بھی آپ کی انتہائی عظمت فرماتے تھے، اگرچہ کچھ فروعی مسائل میں آپکا اور اہل دیوبند کا اختلاف تھا۔

ہندوستان کے ایک ذی مرتبہ عالم وصوفی ہونے کی حیثیت سے آپکا تعارف حجاز، عراق، فلسطین مصر، یمن وغیرہ ممالک اسلامی میں بھی تھا، آپ بذات خود بھی حج بیت اللہ وزیارت روضۂ نبویؐ وسفر عراق وفلسطین وغیرہ سے شرف اندوز تھے، آپ کے ارادتمندوں اور مریدوں کا حلقہ خود آپکے صوبہ کے تقریباً ہر ضلع کے علاوہ صوبجات ہند سے گذر کر دیگر ممالک اسلامیہ تک وسیع ہوچکا ہے۔ بایں ہمہ علم ودانش آپکی زندگی کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ آپ کو اپنے کمالات باطنی وزہد وریاضت کا اخفا جس سے زیادہ منظور نظر تھا، اور اس

باب میں اپنی بے تکلفی اور سادگی سے اکثر دراک ہستیوں کو بھی اپنی شخصیت کی شناخت سے غافل کر دیتے تھے، آپ صاحب وجد وحال عالم صوفی تھے، آپ کو اچھے کتب خانوں کی ہر جگہ تلاش رہتی تھی جب کسی شہر میں جاتے اور معلوم ہوتا کہ وہاں اچھا کتبخانہ ہے تو وقت نکال کر کتب خانہ دیکھنے تشریف لیجاتے اور بسا اوقات کچھ کتابوں کے اقتباس بھی کر لیتے۔ آپنے کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ خود بھی خرید کر جمع کیا اور ایک اچھے کتب خانہ کی بنیاد رکھی لیکن افسوس کہ کافی کتابیں تلف ہو گئیں۔ تاہم اسوقت بھی انکی خاصی تعداد موجود ہے۔ آپکی تصانیف ساٹھ ستر سے کم نہیں، لیکن یہ ضرور نہیں کہ ہر تصنیف چھپ بھی گئی ہو، مگر بیشتر چھپ گئی ہیں، آپ کو تصنیفی ذوق ایام طالب العلمی سے ہی تھا۔

آپ کی تصنیفیں حسب ذیل ہیں

(۱)	حواشی بر شرح ملا جامی ۳ جز	یہ ایام طالب العلمی کی کاوش ہے
(۲)	تعلیقات بر میبذی	یہ بھی طالب العلمی کی کاوش ہے
(۳)	رسالۂ منظوریہ	چند نحوی اعتراضات کے جواب
(۴)	مجموعۂ ابیات عربی	
(۵)	سفینۂ النجات (مطبوعۂ عظیم آباد)	ہر دو رسالے مناقب اہلبیت میں لکھے
(۶)	وسیلۂ نجات (مطبوعۂ لکھنؤ)	گئے ہیں۔
(۷)	صیانت الاحباب عن اہانۃ الاصحاب	
(۸)	کتاب المراثی	عربی مرثیوں کا مجموعہ
(۹)	رسالۂ فیوریہ	اسمیں بخار کے اسباب و علامات و معالجات ہیں۔
(۱۰)	طب یونانی و ڈاکٹری	ناتمام
(۱۱)	مجربات سلیمانی	یونانی و ڈاکٹری نسخوں کا ایک مجموعہ

(۱۲) رسالۂ ایصال ثواب بزبان اردو (مطبوعہ عظیم آباد)

(۱۳) درود و سلام بزبان فارسی " "

(۱۴) رسالۂ مدو و بزبان اردو (مطبوعہ کانپور)

(۱۵) رسالۂ حضوری تصوف اردو (مطبوعہ لکھنؤ)

(۱۶) نصرۃ الصوفیہ (عربی و فارسی میں) مسائل تصوف کے بیان میں

(۱۷) مجموعۂ کلام فارسی

(۱۸) عربی قصائد و غزلیات

(۱۹) شرح شجرۂ قادریہ

(۲۰) شجرۃ السعادۃ و سلسلۃ الکرامۃ سلاسل پیران کے بیان میں، نیز ایک اور رسالہ سلسلۃ الذہب کے نام سے شائع کیا گیا جو اسوقت موجود ہو لیکن اسے حضرت کے ایک خلیفہ نے اُنسے استفادہ کرکے شائع کیا۔

(۲۱) شرح قصیدۂ غوثیہ

(۲۲) کتاب الاشغال والاوراد ناتمام

(۲۳) تذکرہ بزرگان پھلواری

(۲۴) برکات الحرمین و فلاح الدارین

(۲۵) رسالۂ تقبیل و علم سینہ

(۲۶) شرح حدیث مسلسل بالاولیۃ

(۲۷) غزلیات اُردو

(۲۸) **عین التوحید**، تصوف میں وحدت الوجود ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے، اور اب اس مسئلہ پر عبور رکھنے والے علماء مفقود نظر آتے ہیں، حضرت نے اسی مسئلہ پر یہ رسالہ بزبان عربی تحریر فرمایا تھا اور صاف کرکے حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ مہاجر مکی کے حضور میں ارسال کیا تھا۔

(۲۹) **شمس المعارف**۔ یہ حضرت کے علمی و عرفانی مکاتیب کا مجموعہ ہے، پہلے یہ دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوا تھا، اب اس کے چار حصے کر دیے گئے ہیں، اسمیں مریدین و معتقدین نیز دیگر علماء کے نام خطوط ہیں جنہیں مختلف علمی روحانی مضامین بھرے پڑے ہیں شمس المعارف کی پہلی جلد جسوقت شائع ہوئی تھی، لسان العصر سید اکبر الہ آبادی علیہ الرحمہ نے اسے مطالعہ فرمانے کے بعد ایک قطعہ لکھ کر حضرت علیہ الرحمہ کے پاس روانہ فرمایا تھا، وہ قطعہ حضرت نے کسی کتاب کے درمیان رکھ دیا تھا پھر نہ جانے وہ کیا ہوا اس قطعہ کا ایک شعر جو ذہن میں محفوظ رہگیا حسب ذیل ہے۔

بدن کو کچھ سمجھ سکتے ہو "نشتر" اور شعاعوں سے　　مگر آسان نہیں تشریح استعداد روحانی

(۳۰) **جواہر خمسہ**۔ حضرت کے پانچ مواعظ حسنہ کا مجموعہ جسے حضرت کے ایک مرید خاص مولوی محمد اسحاق اڈیٹر العرفان نے بنگلور سے شائع کیا تھا۔

(۳۱) حضرت کے چند اہم مواعظ نواب محسن الملک مرحوم نے ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے شائع کئے تھے اور متعدد مواعظ رسالوں کی صورت میں دار العلوم ندوہ کی طرف سے شائع کئے گئے تھے ان دونوں اداروں کی روداد وں میں بہت سے مبسوط اور طویل مواعظ تمام و کمال درج ہیں۔

(۳۲) **ہدیۃ الواعظین**، اس رسالے میں حضرت نے وعظ گوئی کے طریقے اور اس کے آداب سے بحث کی ہے، اسے بھی ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ نے شائع کیا تھا۔

(۳۳) **مجموعہ قطعات تاریخ غیر مطبوعہ**۔ حضرت کو تاریخ گوئی کا خاص ذوق تھا۔

(۳۴) **رسالہ السماع**، حضرت نے یہ رسالہ جو کافی ضخیم ہے، غنا صوفیہ و مزامیر کے جواز میں لکھا ہے۔

اس خاص بحث میں ایسا مدلل و مبرہن رسالہ کسی زبان میں شائع نہیں ہوا ہو یہ رسالہ قلمی ہے) لیکن بہت سے علماء نے اس رسالے کا مطالعہ کیا ہو حضرت خود صاحب وجد و سماع تھے اور جو کچھ کرتے تھے، اس کے جواز کا پورا ثبوت رکھتے تھے، لیکن جو لوگ غنا و مزامیر کو تمام ذریعہ سمجھ کر اس سے احتیاط کرتے تھے، ان کی قدر کرتے تھے، اور ان کے اس پرہیز سے تعرض نہیں کرتے تھے حضرت نے یہ رسالہ صرف ان کے اعتراض کے جواب میں اور یہ ثابت کرنے کے لئے لکھا ہے کہ مختلف فیہ مسائل میں نکیر نہیں کی جاسکتی، یہ رسالہ نہایت عالمانہ شان سے لکھا گیا ہو، بایں ہمہ حضرت سماع کی کثرت کو ناپسند فرماتے تھے۔

(۳۵) امارت و طاقت تنفیذی مولانا نے مسئلۂ امارت پر بھی ایک اہم کتاب لکھی ہو جسمیں اس مسئلہ پر بہت سی غلط فہمیوں کا پردہ چاک کیا ہو، حضرت فرماتے تھے کہ امیر یا امام بغیر تنفیذی و مادی طاقت کے نہیں ہو سکتا، مولانا حکیم عبدالرؤف صاحب دانا پوری ثم کلکتوی صاحب اصح السیر نے ابتداءً اس سے اختلاف فرمایا اور اسپر مزید تشفی چاہی، حضرت نے اسپر ایک رسالہ بزبان عربی لکھ کر مولانا کے حوالہ کیا، بعد میں مولانا بھی حضرت کے ہمخیال ہو گئے، لیکن نہایت افسوس ہو کہ یہ رسالہ حضرت کے پاس سے کسی نے چوری کر لیا۔ امارت و طاقت تنفیذی کے مسئلہ میں اکابر دیوبند بھی مثل حضرت مولانا اشرف علی صاحب و مولانا عزیز الرحمٰن وغیرہ بھی آپکے ہمخیال ہیں

(۳۶) دو زکوٰۃ اموال ظاہرہ و باطنہ۔ اس رسالے میں فقہی و تاریخی حوالہ جات سے ثابت کیا گیا ہے کہ اموال باطنہ کی زکوٰۃ پر امام کا حق نہیں ہو، بلکہ مزکی خود اس کا منتظم ہے۔

(۳۷) خطبہ بنت ابی جہل۔ حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ کے متعلق بخاری نے مسور ابن مخرمہ سے روایت کی ہو کہ سیدہ خاتون جنت کی موجودگی میں آپ ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کرنیکے خواہشمند ہوئے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکی اطلاع ہوئی تو آپنے علی الاعلان فرمایا کہ

رسولؐ اللہ کی بیٹی اور عدو اللہ کی بیٹی ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، علیؓ ابو جہل کی بیٹی سے اگر نکاح کرنا چاہتے ہیں تو میری بیٹی کو طلاق دیدیں۔ جب امام علی علیہ السلام کو اس خفگی کا علم ہوا تو آپ نے ارادہ فسخ کر دیا۔ حضرت نے اس روایت پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ایسا واقعہ ہی کبھی نہیں ہوا۔ یہ رسالہ بھی غیر مطبوعہ ہے۔

(۳۸) ایک مختصر رسالہ اس بارہ میں بھی لکھا ہے کہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے قبل حرمتِ شراب، شراب استعمال کی تھی۔ یہ بالکل غلط روایت ہے، اس کا خلاصہ اخبار منادی میں شائع ہوا تھا۔

(۳۹) تطہیر اہل بیت۔ یہ حضرت کا سب سے آخری رسالہ ہے جو حضرت نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پہلے لکھا تھا، اور جو ابتک مسودہ کی شکل میں ہے، اسمیں اپنے خیال کے مطابق اس بات سے بحث کی ہے کہ آیت تطہیر کا مورد علیؓ فاطمہؓ حسنؓ حسینؓ ہیں۔

(۴۰) ان کتابوں کے علاوہ وہ رسالے لکھی ہیں، جن کا خاندان کے درود وظائف سے تعلق ہے۔ مثلاً کبریت احمر معروف حزب البحر کلاں، حزب البحر حبیبی، قصیدۂ غوثیہ، رحمت رحماں، تکبیر عاشقاں، دُعائے سیدری وغیرہ۔

(۴۱) حضرت کے بڑے صاحبزادے مولانا حسن میاں مرحوم نے جتنی تصنیفیں کیں، انمیں حضرت کی کاوش کو بہت بڑا دخل رہا۔ مولانا حسن میاں مرحوم کے چھوٹے بڑے پندرہ بیس رسالے ہیں، جن میں تذکرۂ ابو النجیب سہروردی، غم حسین، شہادت حسین، العشق، ترجمہ سفرنامۂ جاپان، علامہ عمدہ میلاد الرسولؐ، ذکر رسولؐ، سماع موتی وغیرہا قابل ذکر ہیں، حضرت کی تصانیف کی جو فہرست اوپر مندرج ہے، انمیں سے بعض سرے سے شائع ہی نہیں ہوئیں، اور بعض شائع ہوئیں تو ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں۔ حضرت عقیدۃً حنفی مشرب صوفی تھے۔ اعتزال کے خیالات سے متنفر اور ائمۂ اہلبیتؑ کے

بیحد مداح تھے۔

حضرتؒ اور ندوۃ العلماء حضرت نے قومیات میں اُسوقت سے دلچسپی لی تھی، جبکہ عام طور پر علماء کرام صرف درس و تدریس کے مشاغل میں منہمک تھے، اور قومی کارکن اسقدر تھوڑے تھے، جو انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے، اور اُمت مسلمہ میں احساس، بیداری و برتری پیدا کرنے کی عام تخیل سرے سے مفقود تھی، علماء کرام نے تعلیم جدید و قدیم کے درمیان ایک وسیع خلیج کھود رکھی تھی، خود علماء کرام کے درمیان باہمی رواداری کا نام و نشان تک نہیں تھا، شرک و بدعت، کفر والحاد، کا ایک دوسرے پر فتویٰ دینا معمولی کام تھا، نیز نظام تعلیم دینی بھی مدت دراز سے ایک فرسودہ اور عقیم تھا، شدید ضرورت تھی کہ ایسے علماء پیدا کئے جائیں جو مقتضیات زمانہ سے آگاہ ہوں، اور ورثۃ الانبیا کی یہ جماعت قومی کشتی کی ناخدا بنے، حضرت شاہ سلیمان صاحب صوفی علماء میں پہلے شخص تھے جن کو یہ احساس بیچین کر رہا تھا، حضرتؒ کے علاوہ دو چار علماء اور تھے جو اس جذبہ میں سرشار تھے، حُسن اتفاق کہ ایک موقع پر آپ حضرت مولانا احمد حسن صاحب کانپوری کے مدرسہ میں جلسہ دستاربندی کی شرکت کے لئے مدعو کئے گئے، حضرت مولانا محمد علی صاحب کانپوری ثم مونگیری بھی اس جلسہ میں مدعو تھے، اختتام جلسہ کے بعد حضرت مولانا محمد علی صاحب نے حضرت شاہ سلیمان صاحب کو صبح کی چاء پر مدعو کیا، اور مولاناؒ نے شاہ صاحبؒ سے مسلمانوں کی تعلیمی پستی، علماء کا جمود و غفلت، انکی باہمی جنگ و جدل پھر ان کی شیرازہ بندی اور اصلاح کی اہم ترین اور فوری ضرورت پر گفتگو فرمائی۔ حضرت شاہ صاحبؒ اُن تاثرات کو پہلے سے اپنے سینے میں سموئے ہوئے تھے نہایت مؤثر اور دلپذیر انداز میں اس اسکیم کی تائید کی اور مزید مشورہ یہ دیا کہ جلسہ دستاربندی کے سلسلہ میں جتنے علماء تشریف لائے ہیں سبھوں کو اکٹھا کرکے یہ چیز ان کے سامنے رکھی جائے اور ان سب کی رائیں معلوم کی جائیں، یہ رائے مولانا سید محمد علی صاحبؒ کو پسند آئی، اور ایسا ہی کیا گیا، چنانچہ سب علماء کی رائے سے یہ بات طے پائی کہ ایک نمایندہ جلسہ ان مقاصد کے اجراء

لہ یہ واقعہ جناب مولانا حکیم رشید النبی صاحب شہر طبیب پٹنہ کی زبانی معلوم ہوا تھا، حکیم صاحب بھی اس جلسہ میں مدعو تھے۔

کے لئے منعقد کیا جائے چنانچہ ۱۳۱۱ھ میں سب سے پہلا جلسہ کانپور محلہ طلاق محل میں ان دو ہستیوں (مولانا شاہ سلیمان و مولانا سید محمد علی صاحبان رحمہما اللہ) کی موجودگی میں ہوا جس کے صدر استاذ العلماء حضرت مولانا لطف اللہ صاحبؒ تھے، اور اسی جلسہ میں دار العلوم ندوہ کی بنیاد پڑی۔ ندوۃ العلماء کی ابتدائی تخیل سے لیکر آپ کے آخری دورِ حیات تک مولانا سید شاہ سلیمان صاحبؒ نے اُن کی خدمت کی، حضرت نے ندوۃ العلماء کے لئے سارے جنوبی و شمالی ہند میں دورے کئے، کافی مدت تک لکھنؤ کی اقامت اختیار کی۔ اصحاب حل و عقد کے مشورے سے شعبان ۱۳۱۴ھ میں مددگار ناظم امور متفرقات و دفتر ہوئے جبکہ غالباً مولانا سید محمد علی صاحبؒ حج کو تشریف لیگئے تھے، پھر ۱۹۰۳ء میں معتمد شعبۂ اشاعت الاسلام ہوئے اور کئی ماہ تک ندوۃ العلماء میں (جو اسوقت محلہ گولہ گنج میں تھا) اقامت فرمائی، اور اسکی جانب سے نشر و اشاعت کا کام انجام دیتے رہے۔ پھر مختلف حالات میں کبھی ہز ہائنس نواب صاحب رامپور، ہز ہائنس نواب صاحب بھاولپور کے یہاں وفود لے گئے، تو کبھی غریب مسلمانوں اور علماء و مشائخ میں دورے کئے۔ اور ان کے بچوں کو دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل کرایا۔ اور پورے جوشِ عمل سے ندوہ کی تشویق دلائی گویا حضرت کی ذات اور ندوۃ العلماء لازم و ملزوم تھے، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے اخبار صدق میں بالکل صحیح لکھاہے کہ" کانفرنس (آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس) کی کامیابی و مقبولیت کا ایک ذریعہ حضرت مولاناؒ کے مواعظ ہی ہوا کرتے تھے، یہی حال ندوہ کا تھا، ندوہ اور کانفرنس کے سالانہ جلسے اور حضرت مولاناؒ کے وعظ لازم و ملزوم تھے۔"

ندوۃ العلماء کا کوئی وفد اور کوئی اجلاس ایسا نہ تھا جسمیں حضرت کی شرکت لازمی نہ سمجھی جاتی ہو مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے مکاتیب (مطبوعۂ معارف پریس) اس کے شاہد عدل ہیں، ان کے مکاتیب بتاتے ہیں کہ جب وہ کسی وفد کی روانگی کے متعلق کوئی تجویز مرتب کرتے تو حضرت شاہ سلیمان صاحبؒ کی شرکت کو ایک لازمی اور طے شدہ حقیقت سمجھتے تھے، ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ حضرت کسی خواندگی ضرورت کی وجہ سے جا سکے تو علامہ

شبلی نعمانیؒ بذات خود حضرت کو لینے پھلواری شریف پہونچے۔

ایک عظیم الشان اخلاقی تائید حضرت شاہ سلیمان صاحبؒ کی شرکت ندوہ سے اس علمی ادارے کو ایک ایسی عظیم الشان اخلاقی تائید حاصل ہوئی جو خاص اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ ندوۃ العلماء کے خلاف ایک ایسی جماعت منظر عام پر آگئی تھی جس نے نیچریت وہابیت وغیرہ کا الزام لگا کر اسے عام نظروں سے گرا دینا چاہا تھا، بلکہ گرا دیا تھا لیکن حضرتؒ کا ندوہ کی تائید کرتے رہنا اس قسم کے پروپیگنڈے کی مجسم تردید ثابت ہوئی، حضرت اعتزال کے خیالات سے جس قدر متنفر تھے دنیا اس سے خوب واقف تھی، پھر صاحب وجد و حال صوفی تھے آپکا خاندان قدامت عقیدہ و تہذیب کی یادگار تھا، جب قوم کے سامنے حضرت ندوہ کی سپر بن کر پیش ہو جاتے تو نیچریت کا طوفان ختم ہو جاتا اور لوگ مطمئن ہو جاتے اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ حضرت کے ذاتی و خاندانی تعلقات کی وجہ سے دوسرے راسخ العقیدہ صوفیہ بھی ندوہ کے اجلاسوں میں شریک ہوئے۔ حضرت ہی کی تحریک سے بعض مجلس انتظامیہ کے رکن بنائے گئے، بعضوں نے مجلس استقبالیہ کی صدارت کی، بعضوں نے اپنی اولاد ندوہ میں تعلیم کے لئے بھیجیں، اسطرح ندوہ کو حضرت نے عوام میں مقبول بنایا۔

پانچ مرتبہ صدارت ۱۹۲۰ء کی تحریک ترک موالات سے پہلے علماء ہند کی سب سے بڑی یا غالباً تنہا جماعت یہی ندوہ تھا، قوم و حکومت دونوں پر اس کا اثر تھا، حضرت کی خدمات ندوہ کی مقبولیت کا اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہو کہ آپنے پانچ مرتبہ ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں کی صدارت فرمائی، آپ کی آخری صدارت ندوۃ العلماء کے سب سے شاندار اجلاس منعقدہ مدراس میں ہوئی جسمیں (سر عبد الرحیم سابق جسٹس مدراس ہائی کورٹ و موجودہ صدر سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی) مجلس استقبالیہ کے صدر تھے، حضرتؒ نے مسلسل تین چار ماہ مدراس میں صرف کرکے کام کو آگے بڑھایا اور ندوہ کو مدراس سے بہت بڑی مالی امداد دلوائی۔

آخری یادگار خدمت حضرت شاہ صاحبؒ پر جب ضعف پیری غالب ہو گیا اور مسلسل دورہ و سفر کرنے کے لائق نہ رہے، نیز رجحانات عامہ سیاسی اور جدید تحریکات کی طرف منعطف ہو گئے تو ایک خالص

تعلیمی و اصلاحی ادارہ کے لئے کسی جوش عمل کا مظاہرہ بہت دشوار تھا، لیکن ان حالات میں بھی آپ نے ندوہ کے مفاد کو ضائع نہ ہونے دیا، حضرتؒ لکھنؤ میں رانی قمر زمانی بیگم آف نانپارہ کے ہاں مقیم تھے، جو حضرت کو نہ فقط اپنا مرشد بلکہ اپنا باپ تصور کرتی تھیں، رانی صاحبہ کو کوئی اولاد نہ تھی، اس لئے ان کو اپنی جائداد کی بڑی فکر تھی، اور وہ کسی صحیح مصرف کی تلاش میں تھیں اور اپنی حیات میں ہی اس کا صحیح مصرف متعین کرکے وثیقہ تعمیل کر دینا چاہتی تھیں، حضرت سے انھوں نے اپنی رائے ظاہر کی حضرت نے انھیں دارالعلوم ندوہ کے نام وقف کر دینے کا مشورہ دیا، اور اپنا پورا اثر و رسوخ صرف کرکے انھیں اس کار خیر کے لئے تیار کر لیا، حضرت کئی ماہ وہاں مقیم رہے اور جب تک انھوں نے اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ ندوہ کے لئے وقف نہ کیا اور حضرت کو مطمئن نہ کر دیا، اسوقت تک وطن نہیں تشریف لائے، وثیقہ تیار کیا گیا، اور معززین شہر کی گواہیاں بھی ثبت ہو گئیں، صرف باضابطہ رجسٹری باقی تھی کہ رانی صاحبہ کا اچانک انتقال ہو گیا، حضرت وطن میں تھے، لیکن ساری خبریں مل رہی تھیں، رانی صاحبہ کے بعد سخت افراتفری ہوئی اور ہر طرف سے دعویدار اُمنڈ آئے، کوئی فریق بھی ندوہ کا خیرخواہ نہ تھا، نہ یہ چاہتا تھا کہ اتنی زیادہ آمدنی ندوہ کے حق لگ جائے، یہاں تک کہ رانی صاحبہ نے جو وثیقہ کیا تھا، وہ بھی غائب کرا دیا گیا، حضرتؒ نے ضعف پیری کے باوجود لکھنؤ کا سفر اختیار کیا اور حسب معمول رانی صاحبہ کی کوٹھی پر مقیم ہوئے، یہاں اب رانی صاحبہ موجود نہ تھیں، رانی صاحبہ کے متعدین میں بعض ایسے لوگ تھے جنھیں حضرت سے بیعت تھی، اور کوٹھی کے سب لوگوں پر حضرت کا روحانی اقتدار تھا، حضرت نے اپنے اثرات کو کام میں لا کر پہلے وثیقہ برآمد کرایا، پھر یہ وثیقہ ذمہ داران ندوہ کے ہاتھوں پہونچا دیا گیا، دوسری طرف اکثر ورثا کو اس بات کی طرف مائل کیا کہ وہ ندوہ کے حق میں مزاحمت نہ کریں، حضرت ان کاموں کی تکمیل کے بعد مکان واپس آئے، خیال تھا کہ اب مزاحمتوں کا سلسلہ بند ہو جائے گا، لیکن پھر بھی مزاحمتیں شروع ہو گئیں، اب اہل ندوہ کے لئے بجز عدالت کے دروازہ کے اور کوئی صورت وصول حق کی نہ تھی، ندوہ کی طرف سے مقدمہ دائر کیا گیا، اس مقدمہ میں

حضرت کی گواہی ناگزیر تھی، ضعف قویٰ کی وجہ سے اہل ندوہ نے حضرت کو تکلیف سفر نہ دی اور کمیشن کے ذریعے پھلواری شریف ہی میں اظہار لینے کی تجویز کی، صوبۂ بہار کے لئے وہ زمانہ قیامت صغریٰ کا تھا۔ زلزلے کے پیہم جھٹکے انسانی ہوش وحواس گم کر چکے تھے۔ خود حضرت کے مکان کا بیشتر حصہ منہدم یا خستہ وخراب ہوچکا تھا، ایسے موقع پر بھی حضرت بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ کمیشن کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہوگئے، کمیشن آیا اور دو دن تک مسلسل جرحیں ہوتی رہیں اور ہر دن آٹھ دس گھنٹے مسلسل یہ سلسلہ رہا حضرت کی گواہی اتنی مؤثر اور طاقتور رہی کہ فریقوں کو بالآخر ندوہ سے صلح کر لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا۔

اس کمیشن کی کامیاب واپسی کے بعد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوہ نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا کہ

"ندوہ جناب کے اس احسانِ عظیم سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔"

پھر تمام معاملات کے بحسن وخوبی انجام پا چکنے کے بعد جناب ناظم صاحب ممدوح نے اپنے ایک دوسرے مکتوب مؤرخہ ۱۰؍اپریل ۱۹۳۵ء میں تحریر فرمایا کہ:۔

"اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ حضرت کو صحت وتوانائی عطا فرمائے اور آپ کا سایہ ہم لوگوں کے سروں پر عرصۂ دراز تک قائم رکھے، مقدمۂ وقف کے حسب خواہ فیصلہ سے جس قدر مسرت جناب والا کو ہوئی ہو وہ اس خلوص اور سچی ہمدردی کے جذبہ کی بنا پر ہے جو جناب والا کو ابتدائے قیام ندوہ سے اب تک ہے، اور یہ خدمت جناب والا کی ندوہ کے ساتھ ایسی ہے جو ہمیشہ یادگار رہے گی، اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کار خیر کا ثواب دیتا رہے گا، ندوہ کو اس مقدمہ کے رو سے کم وبیش ۲۰ ہزار روپیہ سالانہ کی جائداد حاصل ہوئی۔"

ندوۃ العلماء کے علاوہ حضرت شاہ سلیمان صاحب ایجوکیشنل کانفرنس، حمایت الاسلام لاہور

ڈھاکہ یونیورسٹی وغیرہ کی بنیادی خدمت میں پیش پیش رہے۔ الغرض ساری عمر امت اسلامیہ کی خدمت میں بسر کی، وہ مسلمانان ہند کی تاریخ حاضرہ کے بنانے والوں میں تھے، وہ سب سے پہلے صوفی عالم تھے جن کی وقعت سرسید احمد خاں کے دل میں متمکن ہوئی اور انھوں نے اپنے اخبار تہذیب الاخلاق میں ان کے مواعظ شائع کئے، اور گو سرسید کے مذہبی خیالات سے وہ بالکل مختلف تھے لیکن تعلیم جدید کی ترویج میں وہ ان کے حامی تھے، آخر الامر پچاس سال کی لازوال خدمات کے بعد یہ عالم و واعظ شیریں مقال ۲۷ صفر ۱۳۵۴ھ روز جمعہ مطابق ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کی صبح کو چھ بجکر ۵۵ منٹ پر رفیق اعلیٰ سے جا ملا۔ اور شاہی مسجد پھلواری شریف (المعروف سنگی مسجد) کے شرقی دروازہ کے قریب سپرد خاک کر دیا گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اعلان

جن حضرات کا چندہ سالانہ رسالہ الندوہ ختم ہو گیا ہے۔ براہ کرم وہ اپنا چندہ سالانہ آخر جون ۱۹۴۲ء تک ذریعہ منی آڈر ارسال فرمائیں ورنہ جولائی کا پرچہ ذریعہ وی۔پی ارسال خدمت کیا جائیگا۔

"منیجر"

(نوٹ)

منی آڈر ارسال کرتے وقت کوپن پر پورا پتہ اور نمبر خریداری تحریر کرنا ضروری ہے۔

کارروائی جلسۂ انتظامیہ ندوۃ العلماء

منعقدہ ۲۶ اپریل ۱۹۴۲ء روز یکشنبہ وقت ۵ بجے سہ پہر
کوٹھی جناب منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس و معتمد مال ندوۃ العلماء

(از مولانا عبدالغفور صاحب نسر کندوی مددگار ناظم ندوۃ العلماء)

حاضرین جلسہ ۔ جناب منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس و معتمد مال ندوۃ العلماء، جناب ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء، جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی، جناب مولانا مسعود علی صاحب ندوی، جناب منشی محمد اظہر علی صاحب ایڈوکیٹ ایم ایل اے، جناب نواب زادہ سید شمس الحسن خاں صاحب بی اے ایل ایل بی، جناب مولانا عبدالماجد صاحب بی اے دریابادی، جناب شفاء الملک مولوی حکیم عبدالمعید صاحب جناب مولوی سید ظہور احمد صاحب ایڈوکیٹ، جناب مولوی سید نواب علی صاحب ایم اے، جناب منشی محمد احترام علی صاحب رئیس کاکوری، جناب مولوی محب اللہ صاحب ندوی۔

بتحریک ناظم صاحب ندوۃ العلماء و اتفاق جلسہ مولانا عبدالماجد صاحب بی اے، دریابادی اس جلسہ کے صدر منتخب ہوئے۔

(۱) کارروائی جلسہ انتظامیہ ندوۃ العلماء منعقدہ ۲۹ مارچ ۱۹۴۲ء حسب دفعہ ۲۹ ''ی'' دستور العمل ندوۃ العلماء بغرض تصدیق پیش کیگئی جس کی تصدیق کی گئی۔

(۲) الف۔ مجلس انتظامی ندوۃ العلماء اکابر جلسہ مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی رکن انتظامی ندوۃ العلماء و پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج و افسوس کا اظہار کرتا ہے اور اُن کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

(ب) مجلس انتظامی ندوۃ العلماء اکابر جلسہ خان بہادر الحاج مولوی ضیاء الدین محمد صاحب ناظم مدرسہ باقیات صالحات

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابو الحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبد السلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

Regd. No A-596.

طوفان تبسم

جن کے تعارف کی کوئی ضرورت نہیں ان

شوکت تھانوی

کے

بلند پایہ اور منتخب مزاحیہ مضامین کا چوتھا مجموعہ جس کا مقدمہ ہندوستان کے دوسرے ممتاز مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی سشن جج حیدرآباد دکن نے لکھا ہے اس مجموعہ کو مزاحیہ لٹریچر میں سب سے بلند درجہ اسلئے دیا جاتا ہے کہ اسکا ہر مضمون منتخب ہے اور شوکت تھانوی کے وہ تمام مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں جنھوں نے شوکت کو شوکت بنایا اور انکی شہرت میں چار چاند لگائے یہی وہ مجموعہ ہے جس کے اکثر مضامین کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتے اور جن کی ہر طرف مانگ ہے، مزاح کس کو کہتے ہیں اس کا اندازہ اس مجموعہ کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ شوکت کا مزاح مرد، عورت اور بوڑھے بچے سب کیلئے یکساں دلچسپ ہوتا ہے خصوصاً یہ مجموعہ تو ایسا ہے جس پر مصنف کو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے

پہلا ایڈیشن ختم

ہونے کے بعد دوسرا ایڈیشن مصنف کی نظرثانی اور جدید غیر مطبوعہ مضامین کے اضافہ کے بعد نہایت شاندار کتابت و طباعت کے ساتھ تیار ہو چکا ہے، اپنی لائبریری میں اس کے لئے جگہ نکال لے ۔۔۔۔۔ قیمت دو روپیہ عہ

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ

پبلشر حامد علی ندوی، پرنٹر بابو کے لال سکسینہ لازم نامی پریس لکھنؤ

جمادی الثانی و رجب المرجب ۱۳۶۱ھ مطابق جون جولائی ۱۹۴۲ء

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

ملک کے تمام علمی و دینی حلقوں میں یہ خبر انتہائی رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکی سابق شیخ الحدیث و مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء نے چند دن کی علالت کے بعد اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔ انتقال کے وقت عمر پچھتر سال کے قریب ہو گی لیکن قویٰ خاصے مضبوط تھے ان کی عام صحت کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ وفات کا حادثہ اسقدر جلد پیش آئیگا لیکن قلیل العلم انسان کا اندازہ ہی کیا ہوتا وہی ہوتا جو مشیت الٰہی میں مقدر تھا۔ اس سانحہ پر ہم مولانا مرحوم کے اعزہ خصوصاً ان کے قابل فخر بھائی مولانا محمود حسن صاحب مصنف معجم المصنفین اور فرزندان محترم مولانا سعد حسن صاحب اور مولانا اسعد حسن صاحب سے دلی ہمدردی ہے اور خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور مراتب عالیہ سے سرفراز فرمائے۔

مولانا مرحوم ٹونک کے ایک معزز ذی وجاہت اور مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولانا محمود حسن صاحب سے حاصل کی، اس کے بعد اس زمانہ کے ممتاز علمی مرکزوں کا رخ کیا، اور وقت کے مشہور اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس سلسلہ میں دہلی، رام پور، لاہور، کانپور اور بھوپال کے سفر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں لیکن طالب علمی کا زیادہ زمانہ لاہور اور بھوپال میں بسر ہوا لاہور میں مولانا غلام محمدؒ علیہ الرحمہ اس زمانہ میں فقہ و معقولات کے امام سمجھے جاتے تھے۔ مولانا مرحوم ان کی خدمت میں عرصہ تک رہے۔ آپنے یہاں صرف علوم ظاہری ہی کی تحصیل نہیں کی بلکہ اخلاق و عادات میں بھی مولانا غلام محمدؒ صاحب سے بہت متاثر ہوئے، اور ایسے کہ ساری زندگی اس کا اثر رہا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ پوری زندگی اسی رنگ میں ڈھل گئی، مولانا اکثر ان کا تذکرہ کرتے اور ان کی سادگی و زہد، مزاج

غیرت و خودداری اور اس کے ساتھ تواضع و انکسار کے پراثر واقعات سُنائے۔

حدیث کی تعلیم کے لئے پہلے دہلی آئے۔ اس زمانہ میں وہاں میاں نذیر حسین صاحب مرحوم کی بڑی شہرت تھی۔ مولانا مرحوم ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، لیکن یہاں کچھ زیادہ جی نہیں لگا، آخر تھوڑے عرصہ کے بعد بھوپال چلے گئے اور وہاں شیخ حسین ابن محسن الیمانی رحمہ اللہ کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور حدیث کی تمام کتابیں وہیں ختم کیں۔ شیخ صاحب اپنے زمانہ کے بے نظیر محدث اور تحقیق و وسعت نظر میں یگانۂ روزگار تھے، سلسلۂ سند بھی اتنا عالی تھا کہ صرف اُنیس واسطوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچ جاتا تھا۔ شیخ صاحب کی صحبت نے مولانا مرحوم کے ذوق علمی کو بہت بلند کر دیا۔ اور ان کی طبیعت میں تلاش و جستجو اور مطالعہ و تحقیق کا ایسا شوق پیدا کر دیا جس نے انھیں حدیث و رجال کا ایک متبحر عالم بنا دیا۔

مولانا میں اگر اظہار و نمائش کا ذرا بھی جذبہ ہوتا تو شہرت و ناموری کی بڑی سے بڑی مسند ان کیلئے کب کی خالی ہو چکی ہوتی۔ لیکن انکسار و تواضع نے کبھی اپنی عظمت کا احساس نہ ہونے دیا اور قناعت و گوشہ گیری ہمیشہ قدم گیر رہی۔ علمائے سلف کی طرح مدتوں متوکلانہ درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ بعد کو جب اہل و عیال کے جھمیلے بڑھے تو لوگوں کے اصرار سے ٹونک ہی کے ایک مدرسہ میں معمولی سا مشاہرہ قبول کر لیا اور زندگی کا بہترین حصہ وہیں گذار دیا۔ اس اثنا میں مختلف مقامات سے بلاوے آئے اور بڑی بڑی تنخواہیں پیش کی گئیں، لیکن صاحبزادے عبدالرحیم صاحب کی زندگی تک کسی اور طرف توجہ نہ کی۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء آپ کو بڑے اصرار سے ندوہ لائے۔

مولانا ۲۱ء میں پہلے پہل ندوہ تشریف لائے۔ حکیم صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد سخت دھچکا لگا۔ ۲۵ء میں مفتی محمد یوسف صاحب مرحوم کے انتقال نے طبیعت کو اور افسردہ کر دیا۔ اسی اثنا میں یہ درد انگیز واقعہ پیش آیا کہ بڑے صاحبزادے مولوی سعید حسن صاحب نے ۲۶ء میں انتقال کیا۔ اس حادثہ نے طبیعت کو بالکل ہی مردہ کر دیا، اور آپ ٹونک ہی میں رہ گئے۔ تقریباً تین برس کے بعد مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کے شدید اصرار سے پھر دارالعلوم تشریف لائے اور حدیث و تفسیر کی اعلیٰ کتابوں کا درس دینے لگے۔ ۳۱ء میں مولانا حفیظ اللہ صاحب کے بعد اہتمام کی ذمہ داری بھی سپرد ہوئی، جس کا سلسلہ ۴۰ء کے آغاز تک جاری رہا۔

ملازمت کی پابندیاں مولانا کے افتاد مزاج کے خلاف تھیں، دین و ملت کی خدمت کے خیال سے وہ ہر طرح کی مشکلیں جھیل سکتے تھے۔ اور اس راہ میں ایثار و قربانی کا سخت سے سخت امتحان دے سکتے تھے لیکن ملازمت کا تصور ان کے لئے سوہانِ روح تھا، ندوہ میں وہ سولہ برس رہے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ جب انھیں ملازمت کا خیال آجاتا تو بےچین ہو جاتے۔ ندوہ کے قیام کے آخری زمانہ میں یہ احساس بہت بڑھ گیا تھا۔ ذرا سی بات بھی مزاج اور خیالات کے خلاف ہوتی تو بہت ناگواری محسوس کرتے۔ اس زمانے میں اکثر پابرکاب رہتے۔ کچھ دن شاگردوں اور نیازمندوں کے خاطر قیام رہا۔ بالآخر ۴۳ء کے شروع میں طبیعت بالکل اُچاٹ ہو گئی، اور ٹونک روانہ ہو گئے۔ جہاں زندگی کے آخری ڈھائی سال پہلے کی طرح ملازمت کے تصور سے آزاد ہو کر درس و تدریس کے مبارک مشغلہ میں بسر ہوئے۔

مولانا تمام متداول علوم و فنون میں مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔ حدیث سے خاص ذوق تھا۔ مذہباً حنفی تھے اور سخت، امام صاحب سے انھیں والہانہ محبت تھی۔ لیکن انداز تحقیق خالص محدثانہ تھا۔ حنفی

مذہب کے ایک ایک جزیہ کو صحیح ثابت کرتے تھے۔ لیکن عام علماء احناف کی طرح تاویل و نکتہ آفرینی سے کام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ حنفیوں کی تائید میں ایسی صحیح اور مستند حدیثیں پیش کرتے تھے جو خود محدثین کے معیار پر پوری اُترتی تھیں۔ طریقہ یہ تھا کہ پہلے مخالف کے دلائل پوری قوت سے پیش کرتے پھر اس کے جواب میں مخالفین ہی کی مسلم روایتوں سے استدلال کرتے۔ کمال یہ تھا کہ یہ ساری مباحث صرف زبانی ہی نہیں بیان کرتے بلکہ طلباء کے سامنے حدیث، اصول حدیث اور اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر رکھ دیتے تھے۔ طلباء حوالہ کی کتابوں کو خود پڑھتے، پھر اس پر بحث کرتے۔ اس آزادانہ بحث و مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ طلباء اس مسئلہ کے متعلق علیٰ وجہ البصیرت ایک رائے قائم کرتے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ انھیں ماخذ سے براہ راست واقفیت ہو جاتی اور از خود کام کرنے کا سلیقہ پیدا ہو جاتا۔ کبھی کبھی طلبہ مولانا کی رہنمائی میں ان مسائل پر تحقیقی مقالے لکھتے۔ خود مولانا بھی بعض چیزیں املا کراتے۔ ان تحریروں کا مجموعہ اکثر طلباء کے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ خود مولانا کے پاس بھی بہت سے مسائل لکھے ہوئے موجود تھے جو اگر شائع ہو گئے تو حدیث کے طلبہ کے لئے بہت مفید ہوں گے۔ ہمیں اُمید ہو کہ مولانا کے متنسبین اس جانب خاص توجہ فرمائیں گے۔

علوم ظاہری میں اس کمال کے ساتھ باطنی فضائل میں بھی مولانا ایک خاص امتیازی درجہ رکھتے تھے شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے مُرید تھے اور صاحب اجازت تھے۔ تقریباً دو برس حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر رہے، مرشد نے جو طریقہ بتایا، ساری زندگی اُس پر گامزن رہے۔ ایک خاص نصیحت حاجی صاحب کی یہ تھی کہ امراء سے نہ ملنا، اس سے ایمان کو ضرر پہونچتا ہے۔ اس ہدایت پر اس شدت سے عمل کیا کہ ساری عمر کبھی کسی امیر کی طرف نظر نہیں کی بعض مواقع پر اس اصول کی پابندی سخت خطرات کا باعث تھی لیکن آپنے کبھی اس بارہ میں کمزوری نہیں دکھائی، مرتے دم تک اپنے مرشد کی ہدایت پر قائم رہے، اذکار و اشغال کی پابندی کا بھی یہی حال تھا

سفر و حضر ہر حال میں پابندی کے ساتھ ذکر و شغل کا سلسلہ جاری رہتا۔ عموماً تہجد کے وقت سے اشراق تک یہی سلسلہ رہتا۔ عمل کے اس تسلسل نے قلب کو منور کر دیا تھا۔ مولانا کشف و کرامات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے، بلکہ اس بارے میں بہت زیادہ اخفاء حال منظور رکھا، لیکن ان کے ساتھ رہنے والے کبھی کبھی ان حالات سے مطلع ہو ہی جاتے تھے، اسوقت نظر آتا تھا کہ مولانا کس مرتبہ کے مالک ہیں۔

ان تمام فضائل و مناقب کے باوجود ذاتی زندگی حد درجہ سادہ تھی، نمائش و اظہار کا تو ذکر ہی فضول ہے، عام رکھ رکھاؤ سے بھی زیادہ دلچسپی نہ تھی، خلوت و جلوت میں ہمیشہ سادگی اور بے تکلفی سے رہتے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سے اتنا جھک کر ملتے کہ دیکھنے والوں کو تعجب ہوتا۔ کرتہ، پائجامہ اور معمولی کپڑے کی ٹوپی، یہی بڑی سے بڑی پوشاک تھی، جاڑے ہوتے تو اوپر سے ایک شلوکا اور پہن لیتے۔ پیر میں دیسی جوتہ اور بس۔ سر پر عمامہ البتہ پابندی سے باندھتے بلکہ دوسروں کو بھی اسکی ترغیب دیتے۔ غذا عموماً سادی ہوتی تھی۔ البتہ مہمانوں کی خاطر بہتر سے بہتر انتظام کرتے۔ جو ملنے آتا بے کچھ کھائے پیے نہ جانے پاتا۔ فرمایا کرتے تھے کہ مَنْ دَخَلَ دَارًا وَلَمْ یَاکُلْ وَلَمْ یشرب فکانما زار القبور (جو شخص کسی گھر میں گیا پھر نہ کھایا نہ پیا تو گویا اس نے قبرستان کی زیارت کی) ضرورت ہوتی تو مہمانوں کو سفر خرچ بھی دیتے، لیکن یہ سارا تواضع و انکسار چھوٹوں اور برابر والوں کے ساتھ تھا۔ اونچے طبقہ کے لوگوں سے از خود ملنے سے عموماً احتراز کرتے اور فرماتے کہ متکبر کے ساتھ تکبر ہی تواضع ہے۔ بے تعلق لوگوں کے تحفے اور دعوتیں مشکل سے قبول کرتے۔ اگر کبھی کسی اجنبی جگہ پھنس جاتے تو دعوت کے جواب میں کسی نہ کسی بہانہ سے کچھ نہ کچھ رقم ضرور دیتے تھے۔

یہی وہ اخلاق تھے جن کی وجہ سے آج ایک عالم ان کی موت پر سوگوار ہے۔ علماء ماتم کناں ہیں کہ ایک بےنظیر محقق رحلت کر گیا، صلحاء غمگین ہیں کہ ایک مرد صالح اس جہان سے اٹھ گیا، عزیز رنجیدہ ہیں کہ

ایک شفیق و غمگسار کا سایہ باقی نہ رہا، دوست ملول ہیں کہ اخلاص و مودت کی محفلیں سونی ہو گئیں، طلبار گریاں ہیں کہ درس کی مسندیں اُجڑ گئیں۔ فقرار رو رہے ہیں کہ ایک درویش بے ریا چل بسا، عقیدتمندوں کو صدمہ ہو کہ ان کا مرکز عقیدت ختم ہو گیا، اور یہاں انسانیت کو ماتم ہے کہ انسان کامل کا ایک نمونہ دنیا سے رخصت ہو گیا سچ ہے موت العالم موت العالم (عالم کی موت عالم کی موت ہے)

ندوہ کے حلقہ میں ایک اور حادثہ بھی قابل ذکر ہے۔ مولوی سید ظہور احمد صاحب ایڈوکیٹ رُکن انتظامی ندوۃ العلماء نے جون کے آخر میں اچانک انتقال فرمایا۔ عمر ساٹھ سے متجاوز ہو گی لیکن صحت اچھی خاصی تھی۔ اِدھر کچھ عرصہ سے قلب کی شکایت ہو جایا کرتی تھی، یہی شکایت بالآخر موت کا باعث ہوئی۔ یہ حادثہ اسطرح اچانک پیش آیا کہ قریب کے لوگ بھی سنکر حیرت زدہ ہو گئے۔

مرحوم تقریباً چالیس برس سے پبلک زندگی میں شریک تھے۔ اس طویل مدت میں سیاسی، مذہبی تعمیری اور تعلیمی مختلف خدمتیں انجام دیں، مدتوں آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری رہے، مجالس قانون میں شریک ہوئے۔ بلدیاتی خدمتیں انجام دیں، قانونی واقفیت بہت اچھی تھی اور لکھنؤ کے مشہور وکلا میں شمار ہوتے تھے۔ ندوہ سے مرحوم کا بہت دیرینہ اور گہرا تعلق تھا، دار العلوم کے کاموں میں وہ آغاز کار ہی سے شریک تھے اسکی تمام ترقیاں ان کی نگاہوں کے سامنے ہوئیں۔ اس طویل عرصہ میں مشکل ہی سے کوئی ایسا مسئلہ پیش آیا ہوگا جو ان کے مشوروں سے محروم رہا ہو، خدا سے دُعا ہے کہ وہ مرحوم کی یہ خدمتیں قبول فرمائے اور انھیں اپنے دامنِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے اعزہ و احباب کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

علماء ربانی، انکا منصب اور اُنکے کام کی نوعیت

زیر نظر مضمون درحقیقت ایک سلسلۂ مضامین کا مقدمہ ہے جسمیں انشاء اللہ ان علماء حق اور مجاہدین کے کارنامے، انکی تبلیغی اور اصلاحی کوششوں کی رُوداد اور انکی سیرت و حالات پیش کئے جائیں گے جنھوں نے دین کی حفاظت، احیاء سنت اور علوم نبوت کی اشاعت میں اپنی زندگی صرف کر دی، اس سلسلہ میں سب سے پہلے انشاء اللہ مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ پیش ہوگا۔ (ابوالحسن علی)

علماء حق حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارث و جانشین ہیں۔ "العلماء ورثۃ الانبیاء" (صحیح بخاری)، ان کی وراثت اور نیابت اسی وقت صحیح اور مکمل ہوگی، جب ان کی زندگی کا مقصد اور انکی کوششوں کا مرکز وہی ہوگا جو انبیاء کرام کا تھا، وہ مقصد زندگی اور وہ مرکز سعی و عمل کیا ہے؟ دو لفظوں میں اقامت دین، یا ایک لفظ میں توحید! یعنی انسانوں کو اختیاراً اور عملاً اسی طرح سے اللہ کا "عبد" بنانا جیسا کہ وہ فطرتاً اور اضطراراً اس کے عبد ہیں، اللہ کی حکومت اور قانون کو انسانوں کے جسموں اور انکی متعلقہ زمین پر قائم کرنے کی کوشش کرنا جیسا کہ وہ زمین و آسمان پر قائم ہیں۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ۝ (انبیاء ۲۶)

اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر اسکو یہی حکم بھیجا کہ میرے سوا کسی کی بندگی نہیں پس میری ہی کی بندگی کرو

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝ (صف ۱۴)

وہ ہو جسنے اپنا رسول رہنمائی اور سچے دین کے ساتھ بھیجا، تاکہ اسکو سب دینوں (تمام قسم کے نظام اطاعت) پر غالب کرے، اگرچہ شرک کرنے والوں کو یہ ناگوار ہو۔

اس دین حق کے لئے ہر زمانہ میں چند موانع اور مزاحم ہوتے ہیں، جنہیں سے اکثر ان چار اقسام میں داخل ہیں

شرک ۔ یعنی غیر اللہ کو الٰہ بنا لینا، اللہ کے سوا کسی ہستی کو مافوق الطبیعی طور پر ضار اور نافع مان لینا اس کو کائنات میں متصرف اور مؤثر تسلیم کر لینا،

احتیاج و التجا (پناہ جوئی) اور خوف و رجا اس عقیدہ کے بالکل قدرتی اور طبعی نتائج ولوازم ہیں اور دعا و استعانت اور خضوع (جو عبادت کی حقیقت ہو) اس کے لازمی مظاہر ہیں۔

شرک، ایک مستقل دین اور ایک مکمل حکومت ہو، اس کا اور دین اللہ کا کسی ایک جسم یا دل و دماغ یا خطۂ زمین پر ایک ساتھ قائم ہونا ناممکن ہے۔ یہ غیر الٰہی دین جسم و نفس اور جسم و نفس سے خارج اتنی ہی جگہ گھیرتا ہے جتنی دین اللہ کو کم سے کم درکار ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (البقرہ ۲۰)

بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کے برابر اوروں کو بناتے ہیں، انکی محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

مشرکین نے کہا خدا کی قسم ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے جو تم کو (معبودوں کو) سارے جہانوں کے پروردگار کے برابر کرتے تھے۔

اسلئے جبتک زمین سے شرک کی تمام جڑیں اور اسکی باریک سے باریک رگیں بھی اُکھاڑ نہ دی جائیں اُسوقت تک دین اللہ کا پودہ لگ نہیں سکتا، اسلئے کہ یہ پودہ کسی ایسی زمین میں جڑ نہیں پکڑتا جسکی مٹی میں کسی اور درخت کی کوئی جڑ ہو، یا کوئی اور تخم ہو، اسکی شاخیں اسی وقت آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور یہ درخت اسی وقت پھلتا پھولتا ہو جب اسکی جڑ گہری اور مضبوط ہو۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا (ابراہیم ع ۴)

تم نے نہ دیکھا اللہ نے کیسی ایک مثال بیان کی پاکیزہ بات (کلمۂ طیبہ وغیرہ) ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہو اسکی جڑ مضبوط ہو اور اسکی شاخیں آسمان میں ہیں اپنا پھل

لاتا ہے ہر وقت اپنے رب کے حکم سے

یہ درخت کسی دوسرے درخت کے سایہ میں بڑھ نہیں سکتا، یہ جہاں رہے گا تنہا رہے گا، اسکے طبعی نشو ونما کے لئے لا اتنا ہی فضا چاہئے۔

اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ (زمر ع ۱) یاد رکھو اللہ ہی کی تنہا تابعداری ہے۔

پس جو لوگ دین اللہ کی فطرت اور اس کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں وہ اسکو کسی جگہ قائم کرنے کے لئے زمین کو پورے طور پر صاف اور ہموار کرتے ہیں، وہ شرک اور جاہلیت کی جڑیں اور رگیں چن چن کر نکالتے ہیں، اور ان کا ایک ایک بیج بن بن کر پھینکتے ہیں اور مٹی کو بالکل الٹ پلٹ دیتے ہیں، چاہے ان کو اس کام میں کتنی ہی دیر لگے اور کیسی ہی زحمت اٹھانی پڑے، اور چاہے ان کی دن رات کی اس کوشش اور عمر بھر کی اس جد وجہد کا حاصل حضرت نوحؑ کی طرح چند نفوس سے زیادہ نہ ہو، اور چاہے بعض پیغمبروں کی طرح ان کی ساری زندگی کا سرمایہ صرف ایک شخص ہو، لیکن وہ اس نتیجہ پر قانع اور اس کامیابی پر مسرور ہوتے ہیں، اور نتیجہ کے حصول میں کبھی عجلت اور بے صبری سے کام نہیں لیتے۔

کفر یعنی اللہ کے دین اور اس کی شریعت کا انکار، یہ انکار، اسکی حکومت سے بغاوت اور اس کے احکام سے سرتابی، خواہ کسی طریقہ اور علامت سے ظاہر ہو۔

اسمیں وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو اللہ اور رسولؐ کے احکام میں سے کسی حکم کو بھی یہ جان لینے کے بعد کہ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے، نہیں مانتے، یا زبان سے تو انکار نہیں کرتے، مگر جان بوجھ کر اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ایسے لوگ خواہ دوسرے احکام کے پابند ہوں، اس دائرہ سے خارج نہیں، اللہ تعالیٰ یہودیوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ

کیا کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو دوسرے حصہ کو نہیں مانتے، تو اسکی کیا سزا ہو جو تم میں سے

فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرہ ع ۱۰)

یہ کام کرتا ہو سوائے دنیا کی زندگی میں رسوائی کے اور قیامت کے دن وہ پہونچائے جائیں سخت سے سخت عذاب میں اور اللہ تمہاری کاموں سے بیخبر نہیں

صرف اللہ کی خداوندی اور حاکمیت کے اقرار سے طبعی طور پر خداوندی اور حاکمیت کے تمام دعویداروں کی خداوندی اور حاکمیت کا انکار ہو جاتا ہے۔ لیکن جو اشخاص خداوندان باطل کی خداوندی اور حاکمیت کا صاف صاف انکار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے یا دوسرے الفاظ میں انھوں نے اس قبلہ کی طرف منھ تو کر لیا ہو لیکن دوسرے قبلوں کی طرف ان سے پیٹھ بھی نہیں کیجاتی، دین الٰہی کے مقابلہ میں دنیا میں جو نظام حاکمیت قائم اور شریعت الٰہی کے مقابلہ میں جو قوانین نافذ ہیں انسے منحرف نہیں ہوا جاتا، وہ کبھی کبھی ان پر بھی عمل کر لیتے ہیں اور بوقت ضرورت ان کی طرف رجوع کر لیتے ہیں، وہ درحقیقت اسلام میں داخل نہیں ہوئے، ایمان باللہ کے لئے "کفر بالطاغوت"[1] ضروری ہو۔ اور اللہ نے اس کو ایمان پر مقدم کیا ہے۔

فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی (بقرہ ع ۳۴)

جو سرکش کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے اُس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا۔

اسلئے قرآن نے ایسے اشخاص کا دعوئی ایمان تسلیم نہیں کیا جو غیر الٰہی قوانین، ان کے نمایندوں اور ان کے مرکزوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان کو اپنا حَکَم اور ثالث بناتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ[2]

تم نے ان لوگوں کو نہ دیکھا، جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لائے جو آپکی طرف اُتارا گیا اور جو آپسے پہلے اُتارا گیا، چاہتے ہیں کہ قضیہ لیجائیں

---

[1] طاغوت ہر وہ ہستی ہو جسکی خدا کے مقابلہ میں اطاعت مطلق کیجائے (الطاغوت عبارۃ عن کل متعدٍ وکل معبود من دون اللہ امام راغب اصفہانیؒ) خواہ وہ شیطان، یا سلطان یا معمولی انسان، [2] یہ آیت ترمذی کی روایت کے مطابق اس منافق کے بارہ میں نازل ہوئی جسنے اپنے ایک مقدمہ میں (جس کا دوسرا فریق ایک یہودی تھا) مشہور یہودی رئیس اور عالم کعب بن الاشرف کو قاضی اور حَکَم بنایا تھا۔ (ترمذی کتاب التفسیر)

وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا ﴿۶۰﴾ (النساء ع ۹)

سرکش کی طرف، حالانکہ ان کو حکم ہو چکا ہو کہ اس کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہو کہ انکو بہکا کر دور جا ڈالے۔

اس کفر کی بو ان اشخاص سے بھی نہیں نکلی جو مسلمانوں کے دائرے میں آجانے کے بعد بھی "جاہلیت" سے منحرف اور عقائد و رسوم جاہلیت سے بے تعلق نہ ہو سکے! ان کے دلوں سے ابھی تک ان چیزوں کی نفرت اور کراہت نہیں گئی اور ان کاموں کی تحقیر نہیں نکلی، جن کو جاہلیت بُرا سمجھتی ہے، ان سے نفرت اور انکی تحقیر کرتی ہو، خواہ وہ اللہ کے دین میں پسندیدہ اور مستحب ہوں، اور اللہ کے رسُولؐ کی محبوب سنّت ہوں،

اسی طرح ان کے دلوں سے ابھی تک ان اعمال و اخلاق اور رسُوم و عادات کی محبت اور عزت دُور نہیں ہوئی جو اہل جاہلیت کے نزدیک محبوب و معزز ہیں، خواہ وہ اللہ کی شریعت میں مکروہ اور حقیر ہوں۔

اسی طرح جن کے دلوں سے ابھی تک جاہلی حمیت اور عصبیت دُور نہیں ہوئی، اور ان کا عمل جاہلیت عرب (اور درحقیقت ہر جاہلیت) کے اس مقبول و مسلم اصول پر ہو کہ "اُنصر اخاک ظالمًا او مظلومًا" اپنے بھائی کی ہر حال میں مدد کرو خواہ ظالم ہو خواہ مظلوم، اس سے زیادہ نازک بات یہ ہو کہ اسلام کو اختیار کر لینے کے بعد بھی، یا مسلمان کہلانے کے باوجود بھی حسن و قبح کا معیار وہی ہو جو جاہلیت میں ہوتا ہو! اشیا کی قیمت وہی ہو جو جاہلیت نے قائم کر دی ہو، زندگی کی انھیں قدروں اور انھیں معیاروں کی وقعت ہو جو جاہلیت تسلیم کرتی ہے۔

اسلام کی صحت کی دلیل یہ ہو کہ کفر اور اس کے پورے ماحول، اس کے تمام متعلقات، اسکی تمام خصوصیات اور شعائر سے نفرت پیدا ہو جائے، اور اسکی طرف واپسی اور اسمیں مبتلا ہو جانے کے تصور سے آدمی کو تکلیف ہو۔ اور ایمان کی پختگی یہ ہے کہ وہ کفر کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کے مقابلہ میں موت کو زیادہ پسند کرتا ہو۔ بخاری کی حدیث ہے۔

ثلث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان ان یکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما وان یحب المرء لا یحبہ الا للہ وان یکرہ ان یعود فی الکفر کما یکرہ ان یقذف فی النار

تین باتیں جس شخص میں ہونگی اس کو ایمان کی حلاوت محسوس ہوگی، ایک یہ کہ اللہ اور اسکا رسولؐ ان کے ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں، دوسرے یہ کہ کسی دوسرے انسان سے صرف اللہ ہی کے لئے محبت ہو تیسرے یہ کہ کفر میں جانا اسکے لئے اتنا ہی ناگوار ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا۔

صحابہ کرام کی کیفیت یہی تھی، ان کو اپنے زمانۂ سابق (جاہلیت) سے شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی، ان کے نزدیک "جاہلیت" سے بڑھ کر کوئی توہین نہ تھی، وہ جب اپنے اسلام لانے سے پہلے کے زمانہ کا تذکرہ کرتے تو نہایت شرمندگی اور نفرت کے ساتھ، اس زمانہ کی تمام باتوں، اعمال واخلاق اور کفر و فسق اور اللہ کی نافرمانی سے ان کو نہ صرف شرعی اور عقلی، بلکہ طبعی کراہت تھی، اللہ تعالیٰ انکی صفت اسطرح بیان کرتا ہے۔

وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَکَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ (حجرات ع ۱)

لیکن اللہ نے تمہارے دل میں ایمان کی محبت ڈالدی اور اسکو کھبا دیا، تمہارے دلوں میں اور نفرت ڈالدی تمہارے دلمیں کفر اور گناہ نافرمانی کی

جاہلیت کی ایک علامت یہ ہو کہ جب اللہ ورسولؐ کا کوئی حکم سنایا جائے تو قدیم رسم ورواج اور باپ دادا کے طور طریق کا نام لیا جائے اور اللہ ورسولؐ کے مقابلہ میں گذشتہ زمانہ اور پرانے دستور کی سند پیش کی جائے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ آبَاءَنَا اَوَلَوْ کَانَ آبَاؤُھُمْ

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس حکم کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہو تو کہتے ہیں نہیں ہم تو اسی

لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ ۝ (البقرہ ع ۲۱)

راستہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے، اگرچہ ان کے باپ دادے نہ سمجھتے ہوں کچھ بھی اور نہ جانتے ہوں سیدھی راہ

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (زخرف ع ۲)

بلکہ کہتے ہیں کہ ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر اور ہم انھیں کے نقش قدم پر ٹھیک چل رہے ہیں۔

اللہ کے حکم اور وحی کے مقابلہ میں اپنے باپ دادا کے عمل اور اپنی خواہش و مرضی کی پیروی کرنا خاص جاہلی دین ہے۔

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ہود ع ۸)

انھوں نے کہا اے شعیب کیا تمہاری نماز نے تم کو یہ سکھایا ہو کہ ہم چھوڑ دیں جنکو ہمارے باپ دادا پوجتے رہے یا ہم چھوڑ دیں جو ہم اپنے مالوں میں اپنی من مانی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

پس ایسے تمام لوگ جاہلیت سے نکل کر اسلام میں پورے طور پر داخل نہیں ہوئے، جو اللہ کے مقابلہ میں ہر چیز سے دستبردار نہیں ہوئے، اور جنھوں نے اپنے تئیں مکمل طور پر اللہ کے حوالے نہیں کیا، یہ مکمل دستبرداری اور تسلیم کامل وہ اسلام ہو جس کا حضرت ابراہیم کو حکم ہوا، اور انھوں نے اس کو قبول کیا۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (بقرہ ع ۱۶)

جب (ابراہیم سے) ان کے رب نے کہا کہ اپنے رب کے حوالے ہو جاؤ اور اسکی مکمل تابعداری کرو، انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے تئیں ساری جہان کے پروردگار کے حوالے کر دیا۔

اور جس کا تمام مسلمانوں کو حکم ہے۔

فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا (حج ع ۵) — تمہارا معبود و حاکم ایک ہی معبود و حاکم ہے، پس اسی کے حوالے ہو جاؤ اور مکمل تابعدار بنجاؤ۔

اگر یہ نہیں ہو تو گویا اللہ سے جنگ ہو۔ اس لئے اس مکمل اسلام کو ایک جگہ اللہ نے سلم کہا ہے یعنی یہ اللہ سے صلح ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ [1] (البقرہ ع ۲۵) — اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ صلح و اسلام میں پورے پورے اور شیطان کے قدموں پر مت چلو بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

یاد رہے کہ جاہلیت سے مراد صرف بعثت نبوی کے قبل کی عرب کی زندگی ہی نہیں ہو بلکہ ہر وہ غیر اسلامی زندگی اور نظام ہے جس کا ماخذ وحی و نبوت اور کتاب الٰہی و سنت انبیاء نہ ہو، اور جو اسلام کے مسائل و احکام زندگی سے مطابقت نہ رکھتا ہو، خواہ وہ عرب کی جاہلیت ہو، یا ایران کی مزدکیت یا ہندوستان کی برہمنیت، یا مصر کی فرعونیت، یا ترکوں کی طورانیت، یا موجودہ مغربی تمدن، یا مسلمان قوم کی غیر شرعی زندگی اور ان کے مخالف شریعت رسوم و عادات، اخلاق و آداب اور میلانات و جذبات، خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، ماضی ہوں یا حال۔

کفر، صرف ایک سلبی چیز نہیں ہو، بلکہ ایک ایجابی اور مثبت چیز بھی ہو، وہ صرف دین اللہ کے انکار کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک مذہبی و اخلاقی نظام اور مستقل دین ہے، جسمیں اپنے فرائض و واجبات

---

[1] مفسرین نے اس آیت کی شان نزول یہ بیان کی ہو کہ بعض مسلمانوں کو ایسی چیزوں کے کھانے پینے میں تامل ہوا جو ان کے قدیم مذہب میں ان کے لئے جائز نہ تھیں اور جن کے استعمال کے وہ عادی نہ تھے، یہ آیت اگرچہ عام اصول تفسیر کے مطابق کچھ اسی واقعہ سے مخصوص نہیں اور نہایت پر معانی اور جامع آیت ہو جو تمام احکام اسلام پر مشتمل ہو لیکن اس سے اس پہلو کی بھی وضاحت ہوتی ہے جس کو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔

بھی ہیں اور مکروہات و محرمات بھی، اسلئے یہ دونوں دین ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اور ایک انسان ایک وقت میں ان دونوں کا وفادار نہیں ہو سکتا۔

انبیاء کرام کفر کی پوری بیخکنی کرتے ہیں، وہ کفر کے ساتھ کسی رواداری اور مصالحت کے روادار نہیں ہوتے، کفر کے پہچان لینے کا بھی ان کو بڑا ملکہ ہوتا ہے اور اس بارے میں ان کی نگاہ بڑی دُور رس اور باریک بین ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اس بارہ میں پوری حکمت اور عزیمت عطا فرماتا ہو ان کی خداداد فراست اور بصیرت پر اعتماد کئے بغیر چارہ نہیں، دین کی حفاظت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ کفر و اسلام کی جو سرحدیں انھوں نے قائم کر دی ہیں اور ان کے جو نشانات مقرر کر دیئے ہیں انکی حفاظت کی جائے، ایمیں ذرا تساہل اور رواداری دین کو اتنا مسخ کر کے رکھدیتی ہو جتنا یہودی، عیسائی اور ہندوستان کے مذاہب مسخ ہو گئے۔

انبیاء کے صحیح جانشین بھی اس بارے میں انھیں کی فراست اور عزیمت رکھتے ہیں، وہ کفر کا ایک ایک نشان مٹاتے ہیں اور جاہلیت کا ایک ایک داغ دھوتے ہیں، کفر کا ادراک کرنے میں انکی حس عوام سے بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ کفر جس لباس میں اور جس صورت میں ظاہر ہو وہ اسکو پہچان لیتے ہیں اور اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں، کہیں ہندوستان جیسے ملک میں بیواؤں کے نکاح ثانی کو حرام سمجھنے اور اس سے شدید نفرت رکھنے میں ان کو کفر کی بو محسوس ہوتی ہے اور وہ اسکو رواج دینے اور اس سنت کو زندہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات اس پر اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ کہیں قانون شریعت پر رواج کو ترجیح دینا اور بہنوں کو میراث نہ دینے پر اصرار کرنا، ان کو کفر معلوم ہوتا ہے، اور وہ ایسے لوگوں کی مخالفت اور ان کا مقاطعہ فرض سمجھتے ہیں، کبھی اللہ و رسولؐ کا صاف صریح حکم سُن لینے کے بعد اس کو نہ ماننا اور غیر الٰہی عدالت اور غیر الٰہی قانون کے دامن میں پناہ لینا اور غیر اسلامی احکام و قوانین نافذ کرنا ان کو اسلام سے خروج کے مرادف معلوم ہوتا ہے اور وہ

مجبوری کی حالت میں وہاں سے ہجرت کر جاتے ہیں۔ کبھی کسی نومسلم کے یا ایسے مسلمانوں کے جو ہندوؤں کی صحبت میں رہتے ہوں اور ان سے متأثر ہوں، گائے کا گوشت کھانے سے احتراز کرنے میں اور اس سے نفرت کرنے میں ان کو ایمان کی کمزوری، اور ان کے قدیم مذہب یا غیر مسلموں کی صحبت کا اثر نظر آتا ہے کبھی بعض حالات و مقامات میں ایک سنت یا فعل جائز و مستحب کو وہ واجب اور شعار اسلامی سمجھنے لگتے ہیں، اور ان کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے کہ "ذبح بقر در ہندوستان از اعظم شعائر اسلام است"[1] کبھی وہ غیر مسلموں کے رسوم و عادات اور ان کی تہذیب اور وضع و لباس اختیار کرنے اور ان سے تشبہ پیدا کرنے کی شد و مد سے مخالفت کرتے ہیں اور کبھی ان کی مذہبی تقریبات اور تہواروں میں شرکت کی ممانعت کرتے ہیں۔

غرض کفر یا کفر کی محبت یا اُسکی اعانت جس لباس اور جس صورت میں جلوہ گر ہو اور اسکی روح جس قالب میں بھی ظاہر ہو وہ اس کو فوراً بھانپ لیتے ہیں، ان کو اسمیں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا اور اسکی مخالفت کرنے میں کوئی مصلحت ان کے لئے رُکاوٹ نہیں بنتی، وہ کفر کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

ان کے زمانہ کے کوتاہ نظر یا رند مشرب و صلح کل جو دیر و حرم، کعبہ و بتخانہ میں فرق کرنا ہی کفر سمجھتے ہیں، ان کی تضحیک کرتے ہیں، اور تحقیر کے ساتھ ان کو فقیہ شہر، محتسب، واعظ، اور "خدائی فوجدار" کا لقب دیتے ہیں، لیکن وہ اپنا کام پوری اطمینان و استقلال کے ساتھ کرتے رہتے ہیں، اور کوئی شبہ نہیں کہ پیغمبروں کے دین کی حفاظت ہر زمانے میں انھیں لوگوں نے کی ہے، اور آج اسلام یہودیت و عیسائیت اور ہندویت سے ممتاز شکل میں جو نظر آتا ہے وہ انھیں کی ہمت و استقامت

---

[1] مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی رح

اور تعمق کا نتیجہ ہے، جزاہم اللہ عن الاسلام و ولیہ و نبیہ خیر الجزاء

بدعت ۔ کسی ایسی چیز کو جس کو اللہ و رسولؐ نے دین میں شامل نہیں کیا ہو اور اسکا حکم نہیں دیا۔ دین میں شامل کر لینا اور اس کا ایک جز بنا دینا، اس کو ثواب اور تقرب الی اللہ کیلئے کرنا، اور اسکی کسی خود ساختہ یا اصطلاحی شکل اور وضع کئے ہوئے شرائط و آداب کی اسی طرح پابندی کرنا جس طرح ایک شرعی حکم کی پابندی کی جاتی ہو، بدعت ہے۔

شرک و کفر (جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہو) اگر مستقل دین ہیں تو بدعت مستقل شریعت ہو، اور شرک و کفر اگر اسلام کے مقابلہ میں خارج کی چیزیں ہیں، تو بدعت دین الٰہی کے اندر شریعت انسانی کی تشکیل ہو جو اندر اندر نشو و نما پاتی رہتی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات (اگر اس کو آزادی کے ساتھ نشو و نما پانے کا موقع دیا جائے) اصل شریعت سے دو چند سہ چند ہو جاتی ہو اور رفتہ رفتہ شریعت الٰہی کی ساری جگہ اور انسان کے سارے وقت کو گھیر لیتی ہے۔ اس شریعت کی فقہ الگ ہو، اس کے فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات مستقل ہیں اور بعض اوقات تعداد میں شریعت الٰہی کے احکام سے کہیں زیادہ۔

بدعت سب سے پہلے اس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے کہ تشریع (قانون سازی) اللہ کا حق ہو کسی چیز کو قانونی حیثیت دینا، اسکی پابندی ضروری قرار دینا یہ منصب صرف شارع (اللہ) کا ہو، انسانی قانون سازی، اسی منصب الٰہی کے خلاف بغاوت ہو، اسی لئے قانون ساز انسان کو قرآن "طاغوت" کہتا ہے۔

يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ

لیکن کسی چیز کو دین و شرع قرار دینا اور اس کو کسی خاص شکل اور شرائط کے ساتھ قربت خداوندی اور اجر و ثواب کا ذریعہ قرار دینا تو اس سے بھی بڑھ کر بات ہو، یہ تو شریعت سازی ہوئی، اور قرآن کہتا ہے کہ دین و شرع قرار دینا اللہ ہی کا کام ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي　　تمہارے لئے دین کی وہی راہ مقرر کی جسکا حضرت نوحؑ کو

اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ (شوریٰ ۲۶) حکم دیا تھا، اور ہم نے آپکی طرف حکم بھیجا۔

اہل عرب نے جب اپنی طرف سے تحلیل و تحریم کا کام شروع کیا اور مستقل احکام جاری کئے تو قرآن نے انپر یہی جرح کی،

اَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوْا لَهُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللّٰهُ

کیا ان کے کچھ شریک ہیں جنھوں نے ان کے لئے ایسا دین بنایا جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا تھا۔

یہ اللہ کی اجازت کے بغیر دینی قانون سازی کیا تھی، اس کی تفصیل ملاحظہ ہو

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ

(انعام ۶ ۱۶)

اور انھوں نے کہا کہ یہ مویشی اور کھیتی ممنوع ہے اسکو صرف وہی کھائیں گے جنکو ہم چاہیں اپنے خیال کے مطابق، اور یہ مویشی ہیں جنکی پیٹھ پر چڑھنا منع ہے، اور کچھ مویشی جنکے ذبح پر اللہ کا نام نہیں لیتے، اللہ پر جھوٹ باندھتے ہوئے، اللہ ان کے اس جھوٹ کی ان کو سزا دے گا۔

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ط

(انعام ۶ ۱۶)

اور انھوں نے کہا کہ ان مویشیوں کے جو کچھ پیٹ میں ہے وہ ہمارے مردوں ہی کے کھانے کے لئے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں کے لئے حرام ہے اور اگر مردہ ہو تو اسمیں سب شریک ہیں، اللہ انکو ایسی باتیں بنانے کی سزا دے گا، وہ حکمت والا اور خبردار ہے۔

عرب کے ان شریعت سازوں کا یہ جرم جس کو قرآن "افترا" کہتا ہو کیا تھا؟ یہی کہ انھوں نے

بلا کسی آسمانی سند اور وحی کے محض اپنے اتفاق رائے اور اصطلاح سے ایک چیز کو ایک کے لئے حلال اور دوسرے کے لئے حرام کر دیا اور اس کے ایسے قواعد و احکام اور اصول و ضوابط مقرر کئے جن کا کوئی آسمانی ماخذ نہ تھا، اور پھر انکی ایسی پابندی کی اور دوسروں سے کرائی جیسی پیغمبروں کی شریعتوں اور احکام الٰہی کی ہوتی ہے کہ اگر کوئی اس کے خلاف کرے تو سخت گنہگار سمجھا جائے اور ملزم اور ملعون ہو۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی جرم قرآن نے بیان کیا ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ ع ۵) — انھوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو اللہ کو چھوڑ کر خدا ٹھیرا لیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے عدی بن حاتم کے سامنے اس آیت کی یہی تفسیر کی کہ عیسائی علماء و مشائخ نے جس چیز کو ان کے لئے حلال یا حرام قرار دیدیا انھوں نے بے چون و چرا اس کو مان لیا اور ان کو مستقل شارع قرار دیدیا۔

درحقیقت تحلیل و تحریم میں اور کسی چیز کو بلا دلیل شرعی فرض و واجب قرار دینے اور کسی خاص شکل اور آداب و شرائط کے ساتھ کار ثواب اور ذریعۂ تقرب الی اللہ قرار دینے میں کوئی اصولی فرق نہیں، دونوں "شرع مالم یاذن به اللہ" کے حکم میں آتے ہیں۔

بدعت ا دوسری جس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے یہ ہے کہ شریعت مکمل ہو چکی ہو، جس کا تعین ہونا تھا اس کا تعین ہو گیا، ایک انسان کی نجات کے لئے جتنے اعمال ضروری ہیں اور تقرب الی اللہ کے لئے جتنے وسائل تھے ان سب کی وضاحت کر دی گئی، اور دین کی ٹکسال بند کر دی گئی، اب جو نیا سکہ اس کی طرف منسوب کیا جائے گا وہ جعلی ہوگا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (مائدہ ع ۱) — میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو بطور دین کے تمہارے لئے پسند کیا۔

تکمیل نعمت کے یہ خلاف ہو کہ دین و شریعت کا ایک بڑا حصہ مشتبہ اور غیر متعین چھوڑ دیا جائے اور صدیوں تک مسلمان اس کے دریافت سے غافل اور اس کے ثواب سے محروم رہیں خصوصاً خیر القرون کے وہ لوگ جو وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ کے مخاطب اول تھے اور پھر صدیوں کے بعد اس کا انکشاف اور تعین ہو۔

اس شریعت میں جو شخص بھی کوئی نیا اضافہ کرتا ہو اور کسی خارج از دین بات کو دین کا جز قرار دیتا ہو کسی ایسی چیز کا اہتمام کرتا ہے جس کا اللہ کے رسولؐ نے اہتمام نہیں کیا، یا تقرب الی اللہ کے کسی نئے ذریعہ کا انکشاف کرتا ہو وہ گویا زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ دین میں یہ کمی رہ گئی تھی اسکو اب پورا کیا جا رہا ہے، اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ رسالت پر بڑا الزام ہے جن کو حکم تھا کہ

یَا اَیُّہَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ (مائدہ ۶۔۱۰)

اے پیغمبر پہونچا دو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اُتارا گیا اور اگر ایسا نہ کیا تو تم نے اسکا پیغام نہیں پہونچایا۔

امام مالکؒ نے کیا خوب فرمایا۔

من ابتدع فی الاسلام بدعۃ یراہا حسنۃ فقد زعم اَنَّ محمداً صلی اللہ علیہ وسلم خان الرسالۃ فان اللہ سبحانہ یقول اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ فما لم یکن یومئذٍ دینا فلا یکون الیوم دینا

جس نے اسلام میں کوئی بدعت پیدا کی اور اسکو وہ اچھا سمجھتا ہو وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے (نعوذ باللہ) پیغام پہونچانے میں خیانت کی اسلئے کہ اللہ فرماتا ہے کہ میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ پس جو بات عہد رسالت میں دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔

شریعت منزل من اللہ کی ایک خصوصیت اسکی سہولت اور اس کا ہر ایک کے لئے ہر زمانہ میں قابل عمل ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم و خبیر ہے اس کو انسانوں کی فطری کمزوری، ان کے مصالح اور ان کے مختلف

و متفاوت حالات کا پورا علم ہے، اس کے ساتھ وہ رؤف و رحیم (بیحد مہربان اور شفیق) بھی ہے، اس علم محیط اور اس شفقت بے پایاں کی بنا پر اس نے انسانوں کے لئے اپنے پیغمبروں کے ذریعے نہایت آسان شریعت نازل کی، احکام شریعت میں ان کی کمزوریوں، مشکلات اور کوتاہیوں کا پورا لحاظ رکھا اور ان کی قوت وقت اور وسعت اور زمان و مکان کا پورا لحاظ فرماتے ہوئے انکے لئے ایک عالمگیر اور ابدی قانون مقرر فرمایا اس کا ارشاد ہے،

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ ع ۴۰)	اللہ کسی کو اسکی گنجائش سے بڑھ کر مجبور نہیں کرتا
يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (نساء ع ۵)	اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے بار کو ہلکا کرے، اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔
يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ ع ۲۳)	اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے، تم پر دشواری نہیں چاہتا۔
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (حج ع ۱۰)	تم پر اللہ نے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ ع ۱۶)	تمہارے پاس تمھیں میں سے ایک رسول آیا جس پر تمہاری تکلیف شاق ہے، تمہاری اسکو بڑی فکر ہے ایمان والوں پر نہایت شفیق و مہربان ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شریعت کے متعلق فرمایا۔

بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ	مجھے نہایت سیدھے سادے آسان دین کیساتھ بھیجا گیا
ان ہذا الدین یسر	بیشک یہ دین آسان ہے

امت کی مشقت کا آپ کو اتنا خیال تھا کہ فرمایا۔

لولا ان اشق علی امتی لامرتہم بالسواک عند کل صلوٰۃ — اگر مجھے اپنی امت کی تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنا فرض قرار دیدیتا

لیکن دین کی یہ سہولت اور خدا کی طرف سے اس بات کی ضمانت اسی وقت تک ہو جبتک کہ اللہ شارع ہے اور شریعت اسی کی ہو، لیکن جب انسان شارع بنجائے اور وہ شریعت الٰہی میں مداخلت اور اضافہ شروع کر دے تو پھر دین کی سہولت باقی نہیں رہ سکتی۔ نہ انسان کا علم محیط ہو نہ وہ مختلف انسانوں کی ضروریات، مصالح اور زمان و مکان کے اختلافات کا لحاظ رکھ سکتا ہے، نہ اس کو اپنے بنی نوع پر وہ شفقت ہو سکتی ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو ہو، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو دین خالص ہونے کی صورت میں ہر ایک کے لئے قابل عمل اور بالکل سہل ہوتا ہے وہ ان بدعات کی آمیزشوں اور وقتاً فوقتاً اضافوں کے بعد سقدر دشوار پیچیدار اور طویل ہوجاتا ہے کہ اسپر پورے طور پر عمل کرنا رفتہ رفتہ ناممکن ہوتا چلا جاتا ہو، لوگوں کو گریز اور حیلہ جوئیوں کی عادت پڑجاتی ہے اور بہت سے لوگ ایسے مذہب کا قلادہ اپنی گردن سے اُتار دیتے ہیں۔ مذاہب کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترک مذہب کی کثرت نوبت اور الحاد و لامذہبیت کا آغاز عموماً ان لاانتہاہی بدعات کے بعد ہوا، جنکی پابندی ایک متوسط درجہ کے انسان کے لئے تقریبًا ناممکن ہوگئی تھی اور آدمی ان کا پابند رہکر کسی اور کام کا نہیں رہ سکتا تھا۔ قرون وسطیٰ میں بھی علم وعقل کی بغاوت کلیسا کے اسی مذہبی نظام کے خلاف تھی جس سے اصل مسیحی مذہب کو ... کی نسبت بھی نہ تھی۔

یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہو کہ الٰہی دین و شریعت کی ایک خصوصیت ان کی عالمگیر یکسانی ہو، یہ یکسانی زمانوں کے لحاظ سے بھی ہو اور مکانوں کے لحاظ سے بھی، اللہ چونکہ رب المشرقین و رب المغربین ہے، وہ زمان و مکان کے حدود و قیود سے بالاتر ہے، اسلئے اس کی شریعت میں کامل یکسانی پائی جاتی ہے اسکی آخری شریعت جس کی تکمیل آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو چکی ہو آفتاب کی طرح

سب کے لئے ایک اور زمین و آسمان کی طرح سب کے لئے یکساں ہے، اسکی شکل جو قرن اول میں تھی وہی شکل چودھویں صدی ہجری میں بھی ہے، وہ جیسی اور جتنی مشرق والوں کے لئے ہے ویسی ہی اور اتنی ہی مغرب والوں کے لئے بھی، جو قواعد و احکام عبادت کے جو اشکال اور تقرب الی اللہ کی جو متعین شکلیں اہل عرب کے لئے تھیں وہی اہل ہندوستان کے لئے بھی، اسی لئے اگر دنیا کے کسی حصہ کا کوئی مسلمان باشندہ دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں چلا جائے تو اس کو فرائض اسلام کے ادا کرنے میں اور مسجد میں عبادت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ نہ اس کے لئے کسی مقامی ہدایت نامہ اور رہبر کی ضرورت ہوگی، اس کو دینی حیثیت سے کوئی اجنبیت اور مسافرت محسوس نہیں ہوگی، علاوہ مقتدی ہونے کے وہ اگر صاحب علم ہے تو ہر جگہ امام بن سکتا ہے، اور ہر جگہ فتویٰ دے سکتا ہے۔

لیکن بدعات کا یہ خاصہ نہیں، انمیں یکسانی اور وحدت نہیں ہوتی، انمیں زمان و مکان کا بڑا اثر ہوتا ہے، وہ ہر جگہ کے مقامی سانچہ اور ملکی یا شہری ٹکسال سے ڈھل کر نکلتی ہیں، اور خاص تاریخی و مقامی اسباب اور ماحول میں بنتی ہیں، ان کو تمام عالم اسلامی میں رواج نہیں دیا جا سکتا، نہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو ان کا علم ہونا ضروری ہے۔ علم ہونے کے بعد یہ ضروری نہیں کہ وہ سب ان کو قبول کرلیں، اسلئے ہندوستان کی بدعات مصر کی بدعات سے مختلف ہیں، اور ایران و شام کی بدعات میں کوئی اشتراک نہیں، ملکوں سے گذر کر بعض اوقات شہر شہر کی بدعات مختلف ہوتی ہیں، ایک شہر کے مسلمانوں کو دوسرے شہر کی مخصوص بدعات کا علم نہیں ہوتا، یہ بات بڑھتے بڑھتے محلوں اور گھروں تک پہونچ سکتی ہے اور گھر گھر کا دین مختلف ہو سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تمام دوسری شریعتوں اور مذاہب کا عبرتناک انجام تھا، یہودیت اور عیسائیت مسخ شدہ اور محرف شکل میں موجود تھی، اسلئے آپنے شریعت اسلامی کو اپنی حقیقی شکل اور اصلی مقدار میں رکھنے کی پوری کوشش فرمائی، اور اسکے لئے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کیں آپنے اپنے جانشینوں کو بدعت سے بچنے اور سنت کی حفاظت کی بڑی تاکید سے تلقین کی، آپنے فرمایا۔

من احدث فی امرنا ہذا مالیس منہ فہو رد — جو ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرے جو اس میں داخل نہیں تھی تو وہ بات مسترد ہے۔

ایاکم والبدعۃ فان کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار — بدعت سے ہمیشہ بچو، اسلئے کہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہوگی۔

اور یہ حکیمانہ پیشگوئی بھی فرمائی۔

ما احدث قوم بدعۃ الا رفع مثلہا من السنۃ[1] — جب کچھ لوگ دین میں کوئی نئی بات پیدا کرتے ہیں تو اس کے بقدر کوئی سنت اٹھ جاتی ہے۔

آپکے براہ راست جانشین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس وصیت کی پوری تعمیل کی اور بدعات کے بارے میں کسی قسم کی رواداری اور کمزوری روا نہیں رکھی، ان کے انکار بدعات کے واقعات ملاحظہ ہوں اگر کوئی شخص بدعات کے حقیقی مفاسد اور محافظت شریعت کی حکمت و اسرار سے واقف نہ ہو تو انکو تشدد اور غلو پر محمول کرے گا، لیکن اگر کوئی شخص مذاہب کی تاریخ سے واقف ہو تو وہ ان حضرات کی تفقہ اور حکمت دین کی داد دیگا، کہ اگر دوسری ہی نسل میں مذہب کی شکل کی حفاظت نہ کی جاتی تو وہ باقی نہیں رہ سکتا تھا۔

صحابہ کرام کے بعد ائمہ و فقہا اسلام نے اعلیٰ درجہ کے فہم دین اور ایسی عزیمت و استقامت کا ثبوت دیا جو انبیاء کرام کے جانشینوں کے شایان شان ہے، انھوں نے ہمیشہ اپنے زمانہ کی بدعات کی سختی سے مخالفت کی، مبتدعین کا علمی و عملی مقاطعہ کیا، اسلام کے معاشرہ اور دینی حلقوں میں ان بدعات کو مقبول اور ان کے علمبرداروں کو دینی اور بادقار بننے سے روکنے کی کوشش کی اور ان کو اہل علم کی نگاہوں سے

---

[1] اس فرمان نبوی کی اگر شرح دیکھنا ہو تو مکتوبات امام ربانی (مکتوب ۱۸۶ بنام خواجہ عبد الرحمن، ص ۱۹۱ و ص ۱۹۲ (احمدی) و ص ۲۵۵) جلد اول بطور خاص ملاحظہ ہو یا ان لوگوں کی عملی زندگی میں جو بدعات میں مبتلا ہیں۔

ہمیشہ کے لئے گرا دیا۔

بالخصوص فقہا حنفیہ نے جو شدید احتساب کیا اور جس باریک بینی اور نکتہ فہمی کے ساتھ اپنے زمانہ کے بعض بظاہر معمولی مبتدعانہ اعمال و رسوم کی مخالفت کی اور شریعت کی حفاظت اور سنت و بدعت کے امتیاز کیلئے جو حکیمانہ انتظامات اور فقہی احتیاطیں کیں وہ انکی اصول دین سے گہری واقفیت اور ان کے تفقہ کی بہترین مثالیں ہیں۔

جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ بدعات عوام اور خوش عقیدہ شائقین دین کے لئے کیسی مقناطیسی کشش رکھتی ہیں اور کس سرعت کے ساتھ رواج و مقبولیت حاصل کر لیتی ہیں وہ ان علماء اسلام کی ہمت و دلیری اور کامیابی کی داد دیں گے، جنکی کوششوں اور اظہار حق سے بعض بعض بدعات کا بالکل سد باب ہو گیا اور اب انکا نقشہ کی بعض کتابوں یا تمدن کی بعض تاریخوں میں ذکر آتا ہے، بعض بدعات جو باقی رہ گئیں ان کا بدعت ہونا کبھی مشتبہ نہیں رہا اور ایک جماعت ہمیشہ انکی مخالفت کرتی رہی اور اب بھی کرتی ہے۔

ان مخالفین بدعت اور حاملین لواء سنت کو اپنے زمانہ کے عوام یا خواص کالعوام سے اسی طرح جامد اور روایت پرست وغیرہ کے خطابات ملے جس طرح ہر زمانہ کے مذاق عام اور رواج عام کے خلاف کہنے والوں اور کرنے والوں کو ملا کرتے ہیں۔ ما یقال لک الا ما قد قیل للرسل من قبلک

غفلت ، دین الٰہی سے انحراف کا ایک عام سبب غفلت ہے، اللہ سے بے تعلقی اور اسکے احکام و فرائض کی طرف سے بے توجہی کا سبب ہمیشہ بغاوت و کفر ہی نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اوقات دنیا پرستی اور مادیت ہوتی ہے، عزت و جاہ کا سودا، دولت کا عشق اور معاش میں سراپا انہماک آدمی کو معاد سے بالکل غافل کر دیتا ہے، مادیت کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ سرے سے نجات کا خیال، رضائے الٰہی کے حصول کا شوق، اور اس کے عذاب کا خوف دل سے بالکل نکل جاتا ہو، اور کھانے پینے اور پہننے کے سوا دنیا میں کوئی فکر باقی نہیں رہتی، خدا سے غافل لوگوں کی صحبت اور گناہوں اور عیش میں انہماک دل کو ایسا مردہ کر دیتا ہے کہ دینی اور اخلاقی حس

باطل ہو جاتی ہے۔ نیک و بد اور حلال و حرام کی تمیز جاتی رہتی ہے، ایسے غافل اپنے اخلاق و اعمال، سیرت و کردار، معاشرت و آداب اور وضع و صورت میں کافروں اور اللہ کے باغیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں رہتے۔ شراب کے بے تکلف دور چلتے ہیں، منہیات و محرمات کا آزادی سے ارتکاب کیا جاتا ہے، جرائم اور فسق و فجور میں نئی نئی ایجادات کی جاتی ہیں اور انمیں ایسی ذہانت اور ہنر مندی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ برائی اُمتیں ان کے سامنے مات ہو جاتی ہیں۔ شرع و دین کی کوئی حرمت باقی نہیں رہتی، ایسی خدا فراموشی اور خود فراموشی طاری ہو جاتی ہے کہ بھول کر بھی خدا یاد نہیں آتا اور اپنا بھی حقیقی ہوش نہیں رہتا۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ (حشر ع ۳) — ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا اللہ نے ان کو خود فراموش بنا دیا۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کا حال اللہ نے اس آیت میں بیان کیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ (یونس ع ۱) — بے شک جو لوگ ہم سے ملنے کی اُمید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر مگن اور مطمئن ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔

نتیجۃً و عملاً ایسے غفلت شعار اور آخرت فراموش، منکرین آخرت اور اللہ و رسولؐ سے بغاوت کرنے والوں سے ممتاز نہیں ہوتے پیغمبروں کی دعوت کے لئے ان کا وجود بھی اسی قدر بے سود اور بعض اوقات سنگ راہ ہوتا ہے جسطرح مکذبین و منکرین کا، اور بعض اوقات یہ مدعیانِ اسلام، اسلام کے خلاف حجت اور تبلیغ اسلام کی راہ میں رُکاوٹ بنتے ہیں۔ پھر اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات یہ ہوتی ہے کہ یہ غافلین یا منافقین اپنی کثرت یا دنیاوی لیاقت یا کوششوں یا محض وراثت سے مسلمانوں کی سنگلاخ پر قابض ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں کی "امامت" ان کے ہاتھ میں آجاتی ہے یا مسلمانوں کی زندگی میں اتنا رُسوخ اور اثر پیدا کر لیتے ہیں کہ ان کے اخلاق و اعمال عوام کے لئے نمونہ بن جاتے ہیں اور انکی عظمت

اور رفتہ رفتہ دل و دماغ میں جاگزیں ہو جاتی ہے، اسوقت ان "اکابر مجرمین" کی وجہ سے غفلت و خدا فراموشی اور غیر اسلامی زندگی کا ایسا دور دورہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی عملداری میں "جاہلیت" کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور بعض اوقات جب اس طرز زندگی کو کچھ زیادہ مدت گذر جاتی ہو تو اسی کا نام "اسلامی تہذیب و تمدن" پڑ جاتا ہے جس کی مخالفت "غیر اسلامی تمدن" سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔

ان تمام حالات میں پیغمبروں کے جانشینوں کو کام کرنا پڑتا ہے، شاید انسانوں کی کوئی جماعت اتنی مشغول اور فرائض و ذمہ داریوں سے اتنی گرانبار نہیں جتنی نائبان رسولؐ اور علما و مصلحین اسلام کی جماعت ہو، جسمانی امراض کے طبیبوں کو بھی کبھی آرام اور فرصت کا موقع میسر آجاتا ہوگا، لیکن ان اطبار روح کے لئے کوئی موسم اعتدال اور صحت کا نہیں، بہت سی جماعتیں ایسی ہیں کہ جب انکی اپنی حکومت قائم ہو جاتی ہو تو ان کی جدوجہد ختم ہو جاتی ہے اور ان کا مقصود حاصل ہو جاتا ہو لیکن علماء حق اور "قوامین للہ شہداء بالقسط" (اللہ کی طرف سے منتظم اور انصاف کے گواہ) کی جماعت کا کام بعض مرتبہ مسلمانوں کی حکومت میں ختم ہونے کے بجائے کچھ بڑھ ہی جاتا ہو، کچھ چیزیں ہیں جو حکومت و طاقت اور دولت و فراغت ہی کے زمانے میں پیدا ہوتی ہیں، اور علماء اسلام ہی کا فرض ہوتا ہو کہ ان کی نگرانی کریں وہ اپنے فریضۂ احتساب نگرانی اخلاق اور دینی رہنمائی کے منصب سے سبکدوش نہیں ہوتے، اسوقت بھی ان کا جہاد اور ان کی جدوجہد جاری رہتی ہو، کہیں مسلمانوں کی مسرفانہ زندگی پر روک ٹوک کر رہے ہیں، کہیں سامان عیش و غفلت پر ان کی طرف سے قدغن ہے، کہیں حیدری کی شراب کو گرفتار کیا ہو اور اسکو انڈیل رہے ہیں، کہیں باجوں اور موسیقی کے آلات کو توڑ رہے ہیں، کہیں مردوں کے لئے ریشم کے لباس، اور سونے چاندی کے برتنوں کے استعمال پر چیں بہ جبیں ہیں، کہیں بے حیائی اور مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط پر معترض ہیں، کہیں حاموں کی بے قاعدگیوں اور بداخلاقیوں کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں کہیں لپنے زمانہ کے خلاف اخلاق اور خلاف شرع باتوں اور رعادتوں کے خلاف وعظ کہہ رہے ہیں۔

کہیں غیر مسلموں اور عجمیوں کے عادات و خصوصیات اختیار کرنے پر ان کی طرف سے مخالفت ہو کبھی مسجدوں کے صحن اور مدرسوں کے ایوانوں میں حدیث کا درس دے رہے ہیں اور قال اللہ اور قال الرسول کی صدا بلند کر رہے ہیں، کبھی خانقاہوں میں یا اپنے گھروں اور مسجدوں میں بیٹھے ہوئے دلوں کا زنگ دور کر رہے ہیں اللہ کی محبت اور طاعت کا شوق پیدا کر رہے ہیں، امراض قلب حسد، تکبر، حرص دنیا اور دوسری نفسانی اور روحانی امراض کا علاج کر رہے ہیں کبھی منبر پر کھڑے ہوئے جہاد کا شوق دلا رہے ہیں اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت یا اسلامی فتوحات کے لئے آمادہ کر رہے ہیں، پوری اسلامی تاریخ میں آپ کو زندہ اور ربانی علماء جو حکومت وقت کے دامن سے وابستہ نہیں تھے یا حقیر جھگڑوں میں مشغول نہیں تھے انھیں مشاغل میں منہمک نظر آئیں گے، اور مسلمانوں کا کوئی دور حکومت ان علماء حق اور ان کی جدوجہد سے خالی نہیں رہا۔

بنی اُمیہ کا دور اور مسلمانوں کا شاہانہ عہد ہو، بظاہر مسلمانوں کو تمام کاموں سے فرصت ہو گئی ہے مگر علماء کو فرصت نہیں، حضرت حسن بصریؒ کی مجلس وعظ گرم ہو جس میں اپنے زمانہ کے منکرات و بدعات کے خلاف تقریر ہو رہی ہو، اپنے زمانہ کی معاشرت نظام اور اہل حکومت کی بے دینی پر تنقید ہو، نفاق کی علامات اور منافقین کے اوصاف وسیع پیرایہ میں بیان ہو رہے ہیں اور موجودہ زندگی پر ان کو منطبق کیا جارہا ہے خشیت الٰہی اور آخرت کا بیان ہے جس سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئی ہیں اور روتے روتے حاضرین کی ہچکیاں بندھ گئی ہیں، سورۂ فرقان کے آخری رکوع وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا کی تفسیر ہو رہی ہےؔ[1] اور صحابہ کرامؓ کے تہجد کے حالات اور واقعات اس طرح بیان کئے جارہے ہیں کہ اس مبارک دور کی تصویر کھنچ گئی ہے، اور صحابہؓ چلتے پھرتے نظر آرہے ہیں، لوگ مجلس سے توبہ کر کے اٹھتے ہیں اور سیکڑوں آدمیوں کی اصلاح حال ہو رہی ہے۔

بنی عباس کا دور ہو اور امام احمد بن حنبلؒ، شاہ وقت کے ذوق و رجحان اور مسلک کے خلاف

---

[1] کتاب قیام اللیل محمد بن نصر مروزی؀

مذہب اعتزال کی صاف صاف تردید کر رہے ہیں اور بدعات کا رد اور سنت کا اعلان کرتے ہیں، علم کلام اور فلسفہ کے بڑھتے ہوئے رجحان کے مقابلہ میں خالص سنت اور عقائد سلف کی تبلیغ فرما رہے ہیں اور یہ سب اس جرأت اور اطمینان کے ساتھ کہ گویا مامون و معتصم کی حکومت نہیں ہے بلکہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی خلافت ہے۔

بغداد اپنے اوج پر اور بغداد کی تہذیب، دولت اور بے فکری اور آزادی عروج پر ہے، ہر طرف عیش و غفلت کا سمندر رواں ہے، کرخ و رصافہ کے میدانوں میں اور مسجدوں کے سامنے میلے لگے ہوئے ہیں بازاروں میں بڑی چہل پہل ہے لیکن سیکڑوں آدمی ان تمام دلچسپیوں اور تفریحات سے آنکھ بند کئے ایک طرف چلے جا رہے ہیں آج جمعہ کا دن ہے، محدث ابن جوزی کا وعظ ہے، وعظ ہو رہا ہے، سیکڑوں آدمی تائب اور بیسیوں غیر مسلم مسلمان ہو رہے ہیں، لوگ خلاف شرع امور سے توبہ کر رہے ہیں۔

ایک طرف اسی پر شور اور ہنگامہ زا بغداد میں نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا درس وعظ اور روحانی فیض جاری ہے جس سے عرب و عجم کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، بڑے بڑے امرا اور شاہزادے اپنے عیش و دولت کو خیرباد کہکر زہد و فقر کی زندگی اختیار کرتے ہیں، بڑے بڑے سرکش اور نشۂ دولت میں مخمور تائب ہوتے ہیں، خلافت عباسی کے عین دار الخلافہ میں اور خلیفۂ بغداد کی حکومت کے بالکل مقابل اس درویش کی روحانی اور دینی حکومت قائم ہے جس کا سکہ عرب و عجم پر رواں ہے۔

بعد کے تمام عہدوں میں اور حکومت اسلامی کے تمام اطراف و اکناف میں سلاطین و امراء کے بالمقابل اور تمام دوسری دلچسپیوں دعوتوں اور تحریکوں اور مشاغل کے ساتھ علماء حق کی یہ کوششیں اور ان کے مرکز، مساجد، مدارس، خانقاہیں، مجالس وعظ اور باضابطہ و بے ضابطہ احتساب جاری رہا[1]۔

---

[1] ہندوستان کے لئے اسکی تفصیل سب سے زیادہ والد مرحوم مولانا سید عبد الحیؒ کی عظیم الشان عربی تصنیف نزہۃ الخواطر کی آٹھ جلدوں میں ملیگی، جو ہندوستان کے مسلمان مشاہیر و اعیان اور علماء کی سب سے بڑی تاریخ ہے، اور افسوس ہے کہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

علما حق کا یہی بدقسمت یا خوش قسمت گروہ ہے جس کو مسلمان بادشاہوں اور ان کے کارکنان حکومت کے ہاتھوں (جبکہ دوسروں کو سیم وزر کی تھیلیاں اور عہدوں کے پروانے ملتے تھے) دار ورسن اور تازیانے کے انعامات ملے۔ اسی گروہ کے کتنے افراد کو ایک مسلمان حاکم (حجاج) کے ہاتھوں شہادت کا سُرخ خلعت ملا پھر اسی گروہ کے ایک مقتدر فرد (حضرت امام ابوحنیفہؒ) کو امیرالمومنین منصور عباسی کے ہاتھوں زہر کا جام نوش کرنا پڑا، پھر اسی گروہ کے دوسرے امام (حضرت امام احمد بن حنبلؒ) کو سب سے بڑے روشن خیال مسلمان بادشاہ (مامون) کے زمانہ میں پابجولاں اور اسیر زنداں ہونا پڑا، اور اس کے جانشین (معتصم) کے ہاتھوں تازیانے کھانے پڑے۔

آخر زمانے میں بھی کیسے کیسے عادل و دادگر مسلمان فرمانرواؤں کے ہاتھوں کیسے کیسے جلیل القدر علماء پر بیداد ہوئی، جہانگیر کی زنجیر عدل مشہور ہے مگر حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے پاؤں میں بھی زنجیر پڑی اور ان کو اپنے اظہار حق کے صلہ میں گوالیار کے قلعہ میں محبوس ہونا پڑا۔

ان کارناموں اور خدمات کے علاوہ (جو حاملین دین اور محافظین شریعت کے فرائض منصبی ہیں) جن کو ہم اس حیثیت سے دفاعی کہہ سکتے ہیں کہ وہ شرک و کفر، بدعت اور غفلت کے مقابلہ میں اسلام کی حفاظت کی کوششیں ہیں مگر یہ درحقیقت اسلام کی مستقل دعوت و تبلیغ اور دین کی مسلسل جد و جہد ہے جو قیامت تک جاری رہے گی۔

لا یزال طائفۃ من اُمتی ظاہرین علی الحق	میری اُمت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر علانیہ قائم
لا یضرہم من خذلہم (او کما قال)	رہے گا کسی کے مدد نہ کرنے سے اسکو کچھ نقصان نہ ہوگا
الجہاد ماض الیٰ یوم القیٰمۃ	جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔

لیکن ان کے علاوہ دو اور خدمتیں ہیں جو ہر زمانہ کے علماء کے ذمہ ہیں اور علماء ربانی ان کو انجام دیتے رہے ہیں۔

۱۔ اسلامی فتوحات سے کمتر اور مبلغین، صلحا، وصوفیہ، اور بعض مسلمانوں کے اخلاق اور محبت کے اثر سے غیر مسلم ان کے زیر اثر ممالک میں لاکھوں آدمیوں نے اسلام قبول کیا، اور پوری پوری برادریاں اور بڑے بڑے خاندان اسلام میں داخل ہو گئے، لیکن ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ کیا جا سکا اور ان پر اسلام کی تعلیمات کا کوئی اثر نہ پڑ سکا، یا اگر ان پر یہ اثر پڑا تو ان کی بعد کی نسلوں میں یہ اثر باقی نہ رہ سکا، اور رفتہ رفتہ اس کے سوا ان کو کچھ یاد نہ رہا کہ ہمارے باپ دادا مسلمان تھے، اور انھوں نے کسی زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا، اور دو ایک اسلامی نام اور کلمۂ طیبہ کے الفاظ کے ان کے پاس اسلام کا کوئی نشان باقی نہ رہا، کچھ دنوں کی اور بے توجہی کے بعد اسلامی نام بھی باقی نہ رہے اور کلمۂ طیبہ بھی سیکڑوں میں سے چند کے سوا کسی کو یاد نہ رہا مگر اپنے مسلمان ہونے کا اعتراف باقی رہا، پھر وہ بھی مٹنے لگا، اور اس وقت باقاعدہ ان کا ارتداد عمل میں آنے لگا۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں خاص حلقہ کے باہر اسلام کی بنیاد ہمیشہ کمزور رہی، اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں، تقریباً ہر بڑے شہر سے کچھ فاصلہ پر اور ہندوستان کے تمام اطراف میں لاکھوں کی تعداد میں ایسی مسلمان قومیں اور برادریاں موجود ہیں جن کو اسلام سے کچھ تعلق باقی نہیں رہا، دیہاتوں کی بڑی مسلمان آبادی ایسی ہے جو نئے سرے سے تبلیغ اسلام کی محتاج ہے، انمیں سے بکثرت ایسے مسلمان ہیں، جو ہنوز عہد جاہلیت میں ہیں، اور ان کو بعثت نبوی کی خبر بھی نہیں۔ وہ اسلام سے اتنے بیخبر ہیں، جتنے دیہاتوں کے غیر مسلم، فرائض و احکام اسلام کا ذکر چھوڑ کر بعض بڑے شہروں کے اطراف و نواح میں ایسے مسلمان ملتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی سے بھی واقف نہیں

بعض علماء ربانی نے اپنے زمانہ میں ان علاقوں اور دیہاتی رقبوں کی طرف توجہ کی اور بعض مسلمان قوموں اور برادریوں کو از سر نو مسلمان بنایا۔ انمیں تبلیغی دورے کئے، وعظ و نصیحت، اختلاط آمد و رفت اور اپنے اخلاق و تالیف قلب سے ان کے دل مٹھی میں لے، ان کو مرید کر کے انکو توحید اور

اتباع سنت کے راستہ پر لگایا، شرک و بدعت سے تائب کیا، جاہلانہ رسمیں، غیر مسلموں کی وضع و صورت اور کفر و جاہلیت کے شعار چھڑائے، انمیں اخلاق و انسانیت پیدا کی، پابند فرائض اور خوش اوقات بنایا۔ علم کا شوق دلایا اور تعلیم کو رائج کیا، اور انہیں سے لائق افراد کو چھانٹ کر اور اپنے پاس رکھ کر ان کی تربیت و تعلیم کی، پھر ان سے اپنی قوم اور دوسری جماعتوں کی تبلیغ و اصلاح کا کام لیا۔ یہ تبلیغی کام جو انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے طریق کار سے سب سے زیادہ ظاہری مشابہت رکھتا ہے ان کے دوسرے کارناموں کے مقابلہ میں کسی طرح کم اہم نہیں۔

(۲) قرآن و حدیث اسلام کی طاقت کا اصلی سرچشمہ ہیں، جن سے ہمیشہ طاقت اور روشنی حاصل کی جاسکتی ہو اور جن کے ذریعہ سے ہر زمانہ میں مسلمانوں کے کمزور سے کمزور ڈھانچہ میں رُوح پھونکی جاسکتی ہو۔ شرک و کفر، بدعت و غفلت کے خلاف سب سے کارگر حربہ قرآن و حدیث کا علم اور ان کی اشاعت ہو، ان کا صحیح علم اور ان کی روشنی جسقدر پھیلتی جائے گی، کفر و جہالت کی تاریکیاں دور ہوتی جائیں گی، اس لئے ہزار تبلیغوں کی ایک تبلیغ ان کی نشر و اشاعت ہو۔

انبیاء کرام کی بڑی خصوصیت ان کی ہم آہنگی اور یک آہنگی ہو یعنی وہ سب ایک بات کہتے ہیں اور ایک ہی بات کہتے رہتے ہیں، وہ کیا

یٰقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ (ہود)	اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو، تمہارا معبود اسکے سوا کوئی نہیں

ان کے جانشینوں کی بھی یہی خصوصیت ہوتی ہو کہ ان کی تمام کوششوں اور ان کی زندگی کے متنوع مشاغل کا ہدف بھی ایک ہوتا ہو وہ "دعوت الی اللہ" ہے، درس و تدریس، وعظ و تقریر، تبلیغ و تذکیر تصنیف و تالیف، سلوک و تصوف، بیعت و ارشاد سب سے غرض، خلق خدا کو اللہ کی طرف بلانا، اللہ سے ملانا اور اللہ ہی کا بنانا ہوتا ہو۔ ان کے مشاغل متنوع اور مختلف ہو سکتے ہیں مگر سب کا مرکز اور مقصد ایک

ہوتا ہے، وہ بہت کچھ کہتے ہیں، مگر درحقیقت ایک ہی بات کہتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں۔

فطرت کا سرودِ ازلی اسکے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

حضرت نوحؑ کی طرح وہ بھی ان مشاغل اور مختلف طرق تبلیغ کی طرف اشارہ کرکے کہہ سکتے ہیں

رَبِّ اِنِّی دَعَوْتُ قَوْمِی لَیْلًا وَّ نَهَارًا — اے رب میں بلاتا رہا اپنی قوم کو رات اور دن
ثُمَّ اِنِّی دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا — پھر میں نے ان کو بلایا برملا
ثُمَّ اِنِّی اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا — پھر میں نے ان کو کھول کر اور چھپ کر کہا چکے سے

وعظ، یہ درس اور یہ انفرادی و اجتماعی کوششیں، یہ ظاہر و مخفی تدبیریں، یہ تذکیر و تزکیہ اور یہ توجہات اور انفاس قدسیہ، اعلان و اسرار ہی کی شکلیں ہیں۔

عربی مدارس کا نیا نظام [1]

از جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی

سنہ ۱۳۱۱ھ جو ندوۃ العلماء کے قیام کا پہلا برس ہے ہمارے علمی مرکزوں میں جمود و سکون کا زمانہ ہے جو روش قائم ہو چکی تھی اور جس طرز کی طبیعتیں عادی ہو چکی تھیں اُس سے تجاوز محال عادی بن چکا تھا سال مذکور کے اجلاس میں ایک اسلامی ریاست کے فرشادہ عالم نے شرکت اجلاس میں اس بنا پر انکار فرمایا تھا کہ وہاں نشست کرسیوں پر تھی جو پرچہ یہ معذرت لیکر آیا تھا اُس کو گویا آج میری آنکھیں پڑھ رہی ہیں۔

سنہ ۱۳۴۳ھ جس میں یہ اجلاس منعقد ہو رہا ہے مذکورۂ بالا مرکزوں میں حرکت کی معرکہ آرائیاں دیکھ چکا ہے۔

اصلاح نصاب و رفع نزاع کو اپنے مقاصد میں داخل کرنے سے ندوۃ العلماء کا مقصد یہی تھا کہ برباد کن مشاغل سے توجہ کو ہٹا کر ضروری اُمور کی جانب مائل کرے، نصاب میں ایسی ترمیمیں کی جائیں جن کے ذریعہ سے حالیہ ضرورتوں کے پورا ہونے کا سامان ہو۔

یہ مقاصد سنہ ۱۳۱۱ھ میں ضروری تھے۔ سنہ ۱۳۴۳ھ میں حوادث و واقعات کے تجربہ نے انکو زیادہ ضروری بنا دیا ہے۔

حضرات! سیاسی معاملات ندوۃ العلماء کی بحث سے خارج رہے ہیں، مگر واقعات جو ہماری تعلیم پر مؤثر ہوں، اُن سے قطع نظر ممکن نہیں۔ واقعات مختلف حیثیتیں رکھتے ہیں بعض سیاسی ہیں بعض تعلیمی بعض مذہبی۔ ایک ہی واقعہ سے ریاست تعلیم، مذہب کو یکساں حق کے ساتھ بحث کرنیکا اختیار ہے بحث کے پہلو البتہ مختلف ہوں گے، اسی بنیاد پر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ گذشتہ واقعات نے کس طرح ندوۃ العلماء

---

[1] از خطبہ صدارت اجلاس نوزدہم ندوۃ العلماء

کی کوششوں کو مرتبۂ ضروری سے ترقی دیکر زیادہ ضروری کے درجہ کو پہونچا دیا ہو، اور کس طرح ثابت کیا ہے کہ ہمارے لابُد مقاصد کے لحاظ سے نصاب تعلیمی کی جامع و مانع اصلاح لازم ہے۔ ندوۃ العلمار نے ابتدا سے اس امر پر زور دیا ہو کہ نصاب تعلیم سے منطق وغیرہ فنون کی غیرضروری کتابیں خارج کرکے ضروری علوم کے اضافہ اور ترقی کے واسطے وقت نکالا جائے تعلیم کا مفہوم خاص خاص کتابوں کے الفاظ افہام اور تفہیم تک محدود نہ رہے بلکہ علوم کی تعلیم پیش نظر ہو، طلبار کے دل علوم کا گنجینہ بنیں نہ الفاظ وحواشی وشرح کے دفینہ، نصاب میں ایسے فنون کا اضافہ ہو جن سے بنی نوع انسانی اور ممالک اسلامی کا علم صحیح دماغوں میں راسخ ہو، مثلاً تاریخ وجغرافیہ، غیرضروری کتابوں کے حذف وسقوط سے جو وقت وفرصت حاصل ہو وہ علوم دینیہ خصوصًا کلام مجید پر زیادہ توجہ کرنے میں مصروف ہو، ادب عربی پر زیادہ زور دیا جائے۔

حالیہ واقعات نے ثابت کیا کہ کسقدر شدید ضروری یہ مقاصد تھے، علمار میں دینی استقامت مردم شناسی اور واقعات عالم پر حاوی ہوکر صحیح رائے قائم کرنے کی کیسی ضرورت ہو۔ ادب عربی کی تعلیم مسلمانوں کی ضرورت کے دائرہ سے نکل کر دنیا کی ضروریات میں شامل ہوگئی، ایشیا اور افریقہ کے ماورا آج یورپ وامریکہ اس کے انصرام میں پوری کوشش سے مصروف ہیں، کاش اس ملک نے ۱۳۱۱ھ میں ندوۃ العلمار کی دعوت پر توجہ کی ہوتی۔ تنگ نظری اور ذاتی اغراض کا نشانہ یہ مجلس نہ بنی ہوتی بتیس ۳۲ برس کی فرصت تیاری اور حصول قابلیت میں صرف ہوئی ہوتی تو آج وہ دردناک منظر ہمارے سامنے نہ ہوتے جن کے اثر سے دل شق ہیں اور نگاہیں نیچی، میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ ۱۳۱۱ھ جمود وسکون کا زمانہ تھا جب ہر ایک حرکت ممنوع تھی، ہر تغیر ناجائز، عربی مدارس میں واقعات عالم کا ذکر ردا دیکھنا اخبار بینی نادرست تھی اس کے تیس برس کے بعد عالم میں واقعات کے سیلاب آتے ہیں جو عربی مدارس کی حدود سے بھی ٹکراتے ہیں، نہ صرف ٹکراتے ہیں بلکہ پیہم امواج کی ٹکروں سے ان کی ہستی کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ مجبورًا ان کے ساکنین کو درسگاہیں چھوڑنی پڑتی ہیں۔ حدود درسگاہ سے باہر

قدم نکلتے ہی دنیا دیکھتی ہو کہ یہ قدسی گروہ دوسروں کے قابو میں تھا بجائے اس کے اس طوفاں خیز سمندر میں جہاز کے ناخدا ہوتے دوسروں کی ناخدائی پر قانع ہو کر خود مسافر بن بیٹھے۔ ایسے جہازوں کا آفتوں کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانا لازم تھا، ہوا۔ اور پھر ہوا، نہ دین کی خبر رہی اور نہ علما کی یہ ۱۳۴۲ھ جب اس عالم میں قدم زن ہوا تو اس نے یہ مقولہ وردِ زبان پایا ؎

رفت آن غارتِ دین از بزمِ اے ہوش ہا

تا بہ بینم کہ چہا بر سرِ ایماں رفتہ است

اسکی تفصیل دفتر طلب ہی، لیکن وہ دفتر ابھی آنکھوں کے سامنے کھلا ہوا ہو، لہذا حوالۂ گزش کرنے کی حاجت نہیں، معہذا اس موقع پر تفصیل بھی مقصود نہیں۔ اجمالی ذکر کافی ہے۔

دیکھنا یہ ہو کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا، اس لئے کہ کوئی نظامِ عمل پیشِ نظر نہ تھا۔ فی الوقت نظامِ عمل مرتب کرنے کی قابلیت نہ نصابِ تعلیم نے پیدا کی اور نہ حوادث نے مہلت دی۔ ضرورتِ عمل کے احساس پر حوادث نے مجبور کیا۔ نظامِ عمل کی ترتیب جس قابلیت کی داعی تھی وہ مفقود تھی، لامحالہ دوسری عالم قوتوں کے حوالے اپنے آپ کو کر بیٹھے۔ جب پیشوا پیرو بن جائیں گے نتیجہ ہلاکت ہوگا۔

حضرات! اسلام اول روز سے علم و عمل کی جامعیت لیکر اس عالم میں آیا ہے۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک علم و عمل کا مجموعہ تھی۔ تیئیس ۲۳ برس کی قوتِ عمل کی مثال اولوالعزم رسولوں کی پاک زندگانیاں پیش نہیں فرما سکیں تا بہ دیگراں چہ رسد

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی دہ سالہ خلافت کے عملی کارناموں کا پلّہ ایک ملک اور قوم کی کامیاب تاریخ کے مقابلہ میں بھی گراں ہی، شخصی کامیابیاں ان کی گرد بھی نہیں پا سکتیں۔

خلافتِ راشدہ کے بعد جب حکومت و فرمانروائی کا مرکزِ ثقل نقطۂ حق سے متجاوز ہو گیا عدلِ حقیقی کی جگہ جور و ظلم نے لیلی، علمائے ربانی اُس کی ہمدمی و رفاقت سے کنارہ کش ہو گئے اور خلافتِ راشدہ کے

اہم ترفرض حفاظت دین کو اپنا شعار بنالیا. ظاہر ہے کہ یہ کوششیں اسی حد تک کامیاب ہوسکتی تھیں جہاں تک شخصی قوت کام دے سکتی تھی. ایک خلیفۂ راشد کی سعی کا مقابلہ ممکن نہ تھا یہ انھیں بزرگوں کی سعی مشکور کا نتیجہ ہو کہ باوجود صدہا تغیرات اور معاندین کی گوناگوں کوششوں اور تدبیروں کے دین حق آج بھی اپنی اصلی روح افزا صورت میں جلوہ فرما ہے. رضی اللہ عنہم اجمعین. لیکن اس عام کنارہ کشی کے ساتھ ہر دور میں بعض علماء ربانی ایسے بھی ہوئے جنھوں نے باوجود اپنی اعلیٰ شان و تقویٰ و ثقاہت کے خلفاء و سلاطین کی مصاحبت و رفاقت اختیار فرمائی ہے اور اس کے ذریعے سے علم کی، دین کی، حکومت کی اور خود فرمانرواؤں کی ذات کی خیرخواہی کا حق ادا کیا ہے. اور اسطرح گویا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض کفایہ کو ادا کر کے تمام امت کی خدمت کی ہو. اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ان بزرگوں کے نفوس طیبہ کی روشنی درباروں میں نہ ہوتی تو پھر حکومت سے اسلامی شان بالکلیہ رخصت ہو جاتی. اور ظلمت و تاریکی کا ہر چہار طرف دور دورہ ہوتا. اس موقع پر یہ خیال دل سے محو نہیں کیا جا سکتا کہ کاش خلافت کا دعوے رکھنے والے فرمانروا علوم اسلامیہ کے ماہر ہوتے اور ہر ولی عہد کے لئے ان علوم کا سیکھنا لازم ہوتا تو یہ فرمانروا اپنے احکام کے نفوذ اور قوت میں وہ اثر پاتے جو خلافت راشدہ کا ایک نمونہ ہوتا اور اس بے علمی کی وجہ سے جو کشمکش حکومت اور دین میں رہی وہ پیش نہ آتی. بنی امیہ کی بیباکیوں اور مظالم کی تاریکی میں دیکھو وہ سوا دو برس کا دور خلافت راشدہ کی صورت میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی سے اس خاندان کی تاریخ کو نصیب ہوا. اس قلیل مدت میں فراست ایمانی کی قوت عدل و انصاف کو وسیع خلافت کے چاروں حدود میں لے پہونچی، ظلم کی جگہ عدل تھا. پامالی حقوق کی جگہ حق رسی. یہی اثر یہ نتیجہ تھا حضرت کے کمال علم و تقویٰ کا. ہر فرمانروا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نہیں ہوسکتا تھا. تاہم حکومت و علم دین کی جامعیت بہت کچھ ان کو صراط مستقیم پر قائم رکھ سکتی تھی.

یہ تو جملۂ معترضہ تھا، کہنا یہ ہو کہ علماء ربانی کا ایک گروہ علم و تقویٰ کی جلالت شان کے ساتھ

دربار وں کا رفیق رہا ہو۔ بنی اُمیہ کی حکومت میں حضرت امام زہری عبدالملک کے زمانہ سے لیکر یزید بن عبدالملک کے عہد تک خلفار کی رفاقت میں رہے (ولم یزل مع عبدالملک ثم مع الهشام بن عبدالملک واستقضاه یزید بن عبدالملک مرآۃ الجنان ۱۲۴ھ) امام شعبی عبدالملک کے دربار میں تھے، قیصر روم کے دربار میں سفیر ہو کر گئے تو قیصران کی دانشمندی و فہم سے حیرت زدہ ہو کر بول اُٹھا کہ جس قوم میں ایسا شخص موجود ہو اس کو دوسرے شخص کا خلیفہ بنانا روا نہیں۔ حجاج بن یوسف اور عبدالملک سے جو معرکے امام ممدوح کو بیرون دربار پیش آئے وہ بتاتے ہیں کہ دربار کی نزاکتوں پر وہ پوری طرح حاوی تھے۔ امام رجاء بن حیوۃ کی دربار سلیمان بن عبدالملک میں رسائی نہ ہوتی تو دنیا کو حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کی سعادت حاصل نہ ہوتی! امام اعظمؒ نے عہدۂ قضا کی اہلیت اور اسی بنا پر اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اُن کے شاگرد رشید امام ابو یوسفؒ خلافت ہارونی کے رُکن رکین بنے۔ امام یحییٰ بن اکثم کے اثر نے مامون الرشید کی جو رہنمائی کی وہ تاریخ کے صفحات میں مذکور ہو۔ علیٰ ہذا القیاس یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ حافظ ابن ماکولا اور ابن حزم پانچویں صدی میں وزارت کے بار خطیر کے ساتھ ائمہ رجال و حدیث میں بلند پایہ رکھتے تھے اور ان کی ثقاہت و تقویٰ پر علمار کا اتفاق ہو۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ العزیز خلافت عباسیہ کی جانب سے سفیر بنکر دربار میں تشریف لیگئے۔ امام رازیؒ کا دست امداد غوری کی فتح ہندوستان میں تھا۔ خلاصہ یہ کہ علمار ربانی میں ایک گروہ صدیوں تک ایسا رہا ہے جو معاملات دنیاوی کا رہنما اور مصلح رہا اور اسمیں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ ان بزرگوں کی سعی و مشاورت نے مسلمانوں کے معاملات کو بہت کچھ تباہی سے بچایا۔

علمار ربانی کی معاملات دنیاوی سے کنارہ کشی اور فرمانرواؤں کا ان کے مشورہ سے محروم رہجانا عالم اسلامی کے واسطے مصیبت عظمیٰ تھی اسمیں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ کنارہ کشی خود علمار کے حق میں بھی اس پہلو سے کچھ مفید نہیں ہوئی کہ دنیا کے معاملات سمجھنے اور ان کے حل و عقد کا ملکہ رفتہ رفتہ افسردہ ہو کر رہ گیا۔

عامۃ المسلمین اپنے معاملات میں ان کی رہنمائی سے محروم ہو گئے نتیجہ ظاہر ہے آج صدیوں سے مسلمانوں میں

دو گروہ ہیں۔ دیندار اور دُنیا دار۔ اسلام یہ تقسیم لیکر نہیں آیا تھا، ایک مسلم کی دنیا اس کے دین سے اور دین اس کی دُنیا سے علٰحدہ نہیں ہو حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ظہور انبیاء علیہم السلام کے اس طبقے میں ہوا جو جامع نبوت اور حکومت تھے۔ مثل حضرت موسیٰ و حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہم السلام خلافت راشدہ کے دور میں سب سے بڑی دنیا دار اور سب سے بڑی دیندار شخصیت ایک ہی ہوتی رہی یعنی خلیفۂ وقت عشرۂ مبشرہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں غالب تعداد ایسے بزرگوں کی ہو جو دولت و معاملت میں ممتاز تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی تجارت حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت سعد بن وقاصؓ کا تمول و تجمل مشہور ہے۔ وادیِ عقیق کا قصر و ایوان اس بیان کے شاہد عدل ہیں۔ فقہ حنفی نے تمول اور دولت کے آغوش میں پشتوں تک پرورش پائی ہو حضرت حماد کے فضائل میں سخاوت و احتشام بھی شامل ہو۔ رمضان مبارک میں پانسو روزہ دار اُن کے دسترخوان پر روزہ افطار کرتے تھے۔ امام اعظمؒ کی سخاوت کی وسعت مشہور روزگار ہے۔ چار سو روپیہ کی قیمت کی چادر ان کے مبارک شانوں پر رہی ہے۔ امام ابی یوسف کا تجمل و احتشام محتاج بیان نہیں۔

العلماء ورثۃ الانبیاء نے جو شریف ورثہ علماء کو سونپا معاملات دنیا اس سے علٰحدہ نہ تھے اسلئے کہ ختم نبوت میں حکومت نبوت سے علٰحدہ نہ تھی۔ یہ ورثہ چاہتا تھا کہ حکومت کی رہنمائی میں علماء ربانی کا حصّہ ہو صدیوں تک ایسا ہی رہا ہے لیکن پھر موقوف بھی ہو گیا۔ واقعات اُمّہ اور مشکلات پر غلبہ اس ورثہ شریف کا لازمہ تھا۔ سفاک حجاج بن عبدالملک اور سلیمان بن عبدالملک کے مزاج پر قابو آسان نہ تھا مگر امام شعبی اور رجاء بن حیوۃ نے اس مشکل کو سہل کر دیا۔

اس بے تعلقی کا ذمہ دار یا نتیجہ ہمارا قدیم عربی نصاب تعلیم بڑی حد تک ہو۔ دورِ اجتہاد گذر جانے کے بعد اور چھٹی صدی ہجری کے بعد تمامتر توجہ کتابوں پر آکر ٹھہر گئی، متن کی شرح، شرح کے حاشیے، حاشیہ کے تعلیقات مظہر کمال ہیں۔ میں اس کمال کا منکر نہیں الحمدللہ ماننے والا ہوں کفش بردار ہوں، کہنا یہ ہو کہ

اس تعلیم و تربیت اور کنارہ کشی نے دماغوں کو معاملات سے عملاً بے لگاؤ کر دیا۔ شعبوں کی بے تعلقی نے بیگانہ بنا دیا، رہنمائی بجائے عملی نفوذ و قوت کے صرف تحریری یا تقریری رہ گئی۔ دنیاداری اور دینداری میں خلیج حائل ہوئی اور بُعد بڑھتا گیا۔ بُعد کے ساتھ بیگانگی کا آج جو عالم ہے عیاں ہے۔ عیاں را چہ بیاں۔

حضرات! معاملات کی رہنمائی صرف بیان معاملات سے ختم نہیں ہو جاتی، چاہتی ہے کہ خود معاملات میں در آکر عملی مشکلیں حل کی جائیں اہل معاملہ کو حل مشکلات میں عملی مدد بہم پہنچائی جائے۔ ہر معاملہ فہمی موقوف ہے تجربۂ معاملات پر۔

معاملات کا تجربہ ذہن میں دلیری اور نفوذ پیدا کرتا ہے۔ یہ دلیری باعث ہوتی ہے دوسروں پر غلبہ اور فتح کی، جب آپ غالب آکر رہنمائی کریں گے کامیاب رہیں گے۔ عمل اور تجربہ کا نہ ہونا سبب ہوتا ہے جھجک اور بے تعلقی کا۔ یہی جھجک اور بے تعلقی مشکلات کے وقت طبیعتوں میں کبیدگی اور رمیدگی پیدا کر دیتی ہے۔ اس رمیدگی نے وہ مناظرے دکھائے ہیں جن سے رسمی مناظرے کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور جن کا افق تکفیر سے جا ملتا ہے۔ عدالت کے فیصلوں نے جو صورت فقہ حنفی کے عمل کی بنا دی ہے وہ دردناک داستان ہے۔ بعض نامور مسلمانوں کی قانونی تصانیف اغلاط سے اس قدر مملو ہیں کہ صحت نامہ اصل کتاب سے بڑھ جاتا ہے کیا علمائے کرام فیصلہ فرمائیں گے کہ ہر واقعہ لائق ان کی توجہ کا محتاج نہیں ہے طریقۂ توجہ وہی ہے جو موصوف الصدر سلف الصالحین ہم کو بتا گئے ہیں یعنی معاملات پر حاوی اور قادر ہو کر رہنما بنیں۔

حاوی اور قادر بننے کے لئے ضرور ہے کہ طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم دونوں میں اصلاح کامل ہو جس سے معاملہ فہم، معاملات عالم سے باخبر علماء پیدا ہوں جو عملی زندگی میں داخل ہو کر اپنی قوت فہم و فراست اور معاملہ دانی کا سکہ اہل معاملہ اور کاروباری دنیا کے دلوں پر بٹھا دیں۔ جب یہ سکہ چلے تو ہدایت و رہنمائی اس کا نشان ہو اور دین کا بول عالم میں بالا ہو جائے۔

حضرات! میرے خطبے کا بالائی حصہ ان ضروریات مقاصد کے متعلق تھا جو ابتدائے قیام ندوۃ العلما کے باعث ہوئے۔ حال میں ایک جدید ضرورت پیدا ہوئی ہے جو ندوۃ العلماء کی تحریک کو بہت زیادہ اہم اور ضروری ثابت کرتی ہے۔ جنگ عظیم کے بعد جو تغیرات سیاسی کرۂ ارض کی حکومت اور تعلقات میں پیدا ہوئے ہیں، عیاں ہیں۔ ممالک اسلامیہ میں بھی عظیم تغیرات پیدا ہوئے۔ یہ تمام ممالک تقریباً وہی ہیں جنکی مادری زبان عربی اور زندگی اسلامی ہے۔ ان کے گوناگوں تعلقات کی وجہ سے امریکہ اور یورپ میں عربی علوم کی تحصیل و خدمت کی تحریک پوری قوت اور تنظیم کے ساتھ قائم ہوگئی ہے، کثرت سے قدیم نادر کتابیں طبع و شائع ہو رہی ہیں، عربی کے مدارس قائم ہوئے ہیں اور بہ تعداد کثیر طلباء علوم عربیہ کی تحصیل میں مصروف ہیں۔ عربی میں جدید تصانیف ہو رہی ہیں۔ ممالک مذکورالصدر کے غیر مسلم باشندے اپنے اپنے وجود کو نمایاں اور بلند کرنے میں مصروف ہیں۔ غرض ہر طرف علوم عربیہ میں تفوق اور غیر مسلم اثرات کو قوی تر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے چونکہ یہ باقاعدہ اور منظم کوشش زندہ اقوام کی ہے لہذا بظاہر اسباب سالہا سال تک پوری قوت کے ساتھ جاری رہے گی۔

ہماری بے پروائی و غفلت ظاہر ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ حریف اس میدان میں بھی ہم سے بازی لے جائیں گے۔ معاملات فقہ کا جو حشر ہو چکا اور عرض کر چکا ہوں۔ اس سیلاب میں قرآن و حدیث وغیرہ علوم دینیہ کا بھی خدانخواستہ یہی حشر ہونا ہے۔ یہی لیل و نہار رہے تو اسلامی علوم حریفوں کے قبضۂ قدرت میں ہوں گے اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ ہمارے مسلمان طالب علم قرآن کریم اور صحیح بخاری وغیرہ کا درس لینے یورپ اور امریکہ جائیں گے وہاں سے جو کچھ پڑھ کر آئیں گے وہ ظاہر ہے۔ حریفوں کی طرف سے عربی کتابوں کی تصانیف کے انبار لگ جائیں گے جن کی ظاہری خوبیوں کا شمار نہ ہوگا۔ عربی داں ان کو پڑھیں گے اور تباہ ہو جائیں گے۔ اسطرح جو چند حجرے ہوا اور روشنی کے منفذوں کو بند کرکے محفوظ خیال کئے گئے تھے وہ بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ مذکورۂ بالا تحریک معمولی نہیں، بہت غور طلب اور نتیجہ خیز ہے اس کا مقابلہ اگر ہو سکتا ہے

تو اس طرز تعلیم سے جس کی کوشش ندوۃ العلما گذشتہ ایک ثلث صدی کے عرصے سے کر رہا ہے اور ایسے ہی وسیع الخیال ضروریات زمانہ سے باخبر اور واقف علما اور طلبا جدید حریفوں سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ جیسے کہ ندوۃ العلما اپنے دار العلوم سے پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے خود دار العلوم ندوۃ العلما کو جدید ساز و سامان درکار ہو گا وسیع اور عالی شان کتب خانہ جید اساتذۂ یورپ کے علمی السنہ کی تعلیم کا وسیع پیمانہ پر اہتمام تحقیقات کے شائق طلبا جو ممالک غیر کا سفر کریں اور تحقیقاتی وظائف و مصارف سے مدد یاب ہوں۔ خود اپنا عظیم الشان مطبع ۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است
تو بدیں آرزو مرا برساں

(نوٹ)

براہ کرم اپنا نمبر خریداری نوٹ فرما لیجئے اور ہر وقت خط و کتابت و ترسیل زر نمبر کا حوالہ ضرور دیا کیجئے تاکہ تعمیل ارشاد میں دشواری نہ ہو۔

"منیجر"

کتبخانہ ندوۃ العلماء کے بعض اہم مخطوطات

(بسلسلہ ۱۰ اپریل)

از مولوی محمد انور صاحب ندوی

نمبرشمار	نمبرکتاب	نام کتاب مع مصنف	وجوہ ندرت
۱۹	۴۹۴	مدینۃ العلوم للازنیقی	مصنف کا پورا نام نہ معلوم ہو سکا، کتاب پر صرف للازنیقی لکھا ہوا ہے ۸۹۴ھ کی تصنیف ہے اور ۱۲۵۶ھ میں نقل ہوئی۔ ہندوستان کے مشہور کتبخانوں (آصفیہ، رامپور اور کتبخانہ خدابخش) کی فہرستیں اس کتاب کے ذکر سے خاموش ہیں، کاتب کا نام زین الدین احمد المعروف محمد محسن بن فخر الدین احمد خاں ہے مفتاح السعادہ مؤلفہ علامہ طاش کبری زادہ مطبوعہ دکن اور مدینۃ العلوم میں باعتبار مضامین لفظ بلفظ اتحاد ہے لیکن نام میں مختلف ہیں، اور دونوں کے مصنف بھی دو ہیں، جیسا کہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے ابجد العلوم ص ۲۸۹ و ۳۴۳ میں لکھا ہے، بادی النظر میں ایک ہی کتاب کے دو نام معلوم ہوتے ہیں مفتاح السعادہ چھپ چکی ہے لیکن مدینۃ العلوم کے نام سے ابھی تک کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی ہے۔
۲۰	۵۰۷	الافق المبین للعلامہ السید محمد باقر ابن شمس الدین الملقب بداماد المتوفی ۱۰۴۱ھ	۱۰۳۰ھ کی تصنیف ہے، کتاب پر سنہ تحریر درج نہیں ہے، البتہ اپنی ظاہری صورت سے گیارھوین صدی کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔

نمبر شمار	نمبر کتاب	نام کتاب مع مصنف	وجوہ ندرت
۲۱	۶۵۰/۱و۲	رُباعیات سحابی جلد اوّل و دوم سحابی استرآبادی المتوفی سنہ ۱۰۱۰ھ	رُباعیات کا یہ نسخہ علامہ شبلی کا عطیہ ہو جس کو علامہ مرحوم نے کسی نادر نسخہ سے خود اپنی نگرانی میں نقل کرایا تھا۔ خط نستعلیق اور نہایت پاکیزہ ہے۔ حاشیہ پر جابجا پنسل سے رُباعیات کے موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جو علامہ مرحوم ہی کے قلم کی تحریر معلوم ہوتی ہے مصنف اور اسکی رُباعیات پر پچھلے سال عالی جناب مولانا نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر یار جنگ کا ایک مضمون رسالہ "معارف" اعظم گڈھ میں شائع ہو چکا ہے جس میں رُباعیات کے اس نسخہ کا بھی ذکر آیا ہے۔
۲۱	۱۰۹/۲	شرح تہذیب السنن ابی داؤد للمنذری الابن قیم الجوزیۃ المتوفی ۷۵۱ھ	کتاب ابتک، کامل طبع نہیں ہوئی ہو، یہ نسخہ کسی قدیم الخط نسخہ سے منقول ہے جابجا صفحات بیاض چھوڑ دیے گئے ہیں، کتاب فل اسکیپ سائز کے تین سو پچاس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ خط نسخ ہے، لیکن صاف ہو اس کا کامل نسخہ بروایت مخدومی مولٰنا شاہ حلیم عطا صاحب استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلما مولوی شمس الحق صاحب مرحوم مولف عون المعبود کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

نمبر شمار	نمبر کتاب	نام کتاب مع مصنف	وجوہ ندرت
۲۲	۱۲۶	التخویف من النار والتعریف بحال دار البوار للعلامہ زین الدین ابی الفرج عبدالرحمٰن بن احمد بن رجب البغدادی الحنبلی المتوفی ۷۹۵ھ	کاتب کا نام عبداللہ بن محمدؐ ہے اور سنہ تحریر ۱۲۹۵ھ ہے، کتاب ابتک طبع نہیں ہوئی ہو' نسخہ ناقص ہے۔
۲۳	۲۸۵ تا ۲۸۸	شاہنامہ مصوّر ہر چہار دفتر (فارسی) محسن بن اسحٰق فردوسی المتوفی ۴۱۱ھ	خط نہایت پاکیزہ اور جداول رنگین و مطلا ہیں۔ سرورق پر حافظ محمود خاں کی مہر ہے۔
۲۴	۴۱۵	مجموعۂ رسائل و قصائد و غزلیات (فارسی) شاہ نعمت اللہ دہلویؒ المتوفی ۹۲۵ھ	خط نہایت پاکیزہ اور نستعلیق اور جداول مطلا ہیں۔ یہ نسخہ علامہ شبلی مرحوم کا عطیہ ہے جو موصوف کو ان کے دادا جناب منشی حسن علی صاحب مرحوم سے وراثۃً ملا تھا، فارسی کا یہ دیوان اپنی چند معلوم و مشہور خصوصیات کے باعث بڑی اہمیت رکھتا ہو اور جہاں تک معلوم ہے ابھی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے۔
۲۵	۳۱۳۰	روضۃ الافکار والافہام للشیخ حسین بن غنام الاحسائی	یہ کتاب محمد بن عبدالوہاب النجدی کے سوانح و حالات اور انکی مشہور عالم تحریک وہابیت اور اس سے متعلق مباحثانہ و مناظرانہ معرکوں کی بیان و تفصیل پر مشتمل ہو فل اسکیپ سائز کے دو سو چونسٹھ صفحات پر پھیلی ہوئی ہو خط نستعلیق اور سواد تحریر دیدہ زیب ہی، ابھی تک چھپی نہیں ہو، سنہ کتابت ۱۲۹۶ھ ہے

(باقی آئندہ)

حالات ندوہ

تعطیل گرما کے بعد حسب اعلان یکم جولائی کو دار العلوم کھل گیا۔ جنگی حالات کی بنا پر ابکی طلبا کی آمد نسبتاً کم ہے۔ گو ابھی یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن فرط تعلق کی بنا پر دور دراز کے لوگ اپنے بچوں کو بھیجنے میں متأمل ہیں، بہرحال پھر بھی بہت کافی طلبہ آگئے ہیں اور تعلیم پوری توجہ سے شروع ہوگئی ہے۔

آجکل تعلیم کو زیادہ سے زیادہ بہتر اور مؤثر بنانے کی جانب بڑی توجہ کی جارہی ہے، اساتذہ طلبہ، نگراں ہائے دار الاقامہ اور دائرہ اہتمام وانصرام سب مل جل کر ترقی و سربلندی کی تدبیروں میں مصروف ہیں اور پورے اتفاق و تعاون اور یکدلی و یکجہتی سے ندوہ کے مقاصد کی تکمیل میں کوشاں ہیں، اگر اسی انداز میں کام ہوتا رہا تو انشاء اللہ تعالیٰ ندوہ آئندہ ترقی کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کریگا۔

طلبہ کی مختلف انجمنوں اور سوسائٹیوں کا ذکر ان صفحات میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے جس سے قارئین کرام کو اندازہ ہے کہ وہ تعلیمی، تربیتی اور انتظامی کوششوں میں منتظمین کے ساتھ دوش بدوش شریک ہیں۔ حضرات اساتذہ بھی اس جدوجہد میں شریک تھے، لیکن اُن کی کوششیں انفرادی حیثیت رکھتی تھیں۔ مقام مسرت ہے کہ ابکی ان کاموں نے بھی اجتماعی شکل اختیار کی اور مہتمم صاحب دار العلوم نے انتظام و مشورہ میں مجلس اساتذہ کو بھی شریک کرلیا۔ ان فرائض کی انجام دہی کے لئے اساتذہ کی جانب سے مختلف کمیٹیاں بن گئی ہیں جو پوری سرگرمی سے دار العلوم کے مقاصد کی تکمیل میں کوشاں ہیں۔ یہ دار العلوم کے نئے دور کا آغاز ہے اور یکجہتی وہم آہنگی کی یہ فضا ایک شاندار مستقبل کا پیش خیمہ ہوگی۔

طلبا قدیم کی مجلس منتظمہ کے سہ ماہی جلسہ کا زمانہ آگیا ہے، وسط جولائی میں شاید یہ جلسہ ہو جاتا. لیکن دفعتاً مولوی حامد علی صاحب ناظم انجمن طلبا قدیم علیل ہو گئے، ہاتھ میں پہلے معمولی سا دانہ تھا، جس نے بڑھتے بڑھتے کاربنکل کی شکل اختیار کی اور آپریشن کی نوبت آئی، اب آرام ہو رہا ہے۔ اُمید ہے کہ انشاء اللہ چند دن میں زخم بالکل مندمل ہو جائے گا، اس کے بعد جلسہ کے متعلق انتظامات شروع ہو سکیں گے.

تعطیل کی وجہ سے الندوہ کے کارکن بھی کچھ منتشر رہے اس بنا پر اپریل اور مئی کے رسالے بہت تاخیر سے شائع ہوئے۔ اب یہ تاخیر اس حد تک پہونچ چکی ہو کہ اشاعت کو وقت پر لانے کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ جون اور جولائی کے رسالے یکجا شائع کئے جائیں چنانچہ یہی ہو رہا ہو یہ پرچہ آپ کو اس مہینے کے آخر تک انشاء اللہ مل جائے گا، اس کے بعد آئندہ سے رسالہ حسب معمول مہینے کی بیس تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔
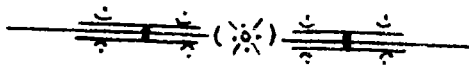
ندویوں اور ندوہ کے قدیم طالب علموں کو یہ سُن کر رنج ہوگا کہ مولانا شبلی مدظلہ نقیبہ دارالعلوم کی صحت ادھر کچھ عرصہ سے خراب ہے گرمیوں سے ضعف بصارت کی شکایت پیدا ہو گئی ہے اب اس درمیان ایک تکلیف دہ پھوڑا نکل آیا ہے جس کے متعلق ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ کاربنکل ہے علاج توجہ سے ہو رہا ہے خدا جلد شفا بخشے۔

Regd. No. A-596.

اس صدی کی بہترین تالیف

کامیاب زندگی بسر کرنے کا دستور العمل

طلسمِ عمل (یا) حسنِ معاشرت

مؤلفہ جناب مجتبیٰ حسن صاحب بی اے، جونپور

عملی نفسیات پر ایک مفید اور معرکۃ الآرا کتاب ہے بہترین دل و دماغ کے عمل اور تدبیروں کا نچوڑ

اردو میں آجتک اس اچھوتے اور کارآمد موضوع پر کوئی کتاب نہیں نکلی

کشمیر اور میسور کی ریاستوں نے اسکول اور کالج کے کتب خانوں اور تقسیم انعام کیلئے منظور کر لیا ہے

لوگوں کو مسخر اور گرویدہ کرنے، کاروبار و پیشہ میں خاطر خواہ ترقی اور منافع حاصل کرنے، اپنی شخصیت کو وزن دار اور اپنی باتوں کو جادو اثر بنانے، نام و نمود، عزت، شہرت، دولت، ثروت، سربلندی حاصل کرنیکے راز اس کتاب میں پوشیدہ ہیں۔ اقتصادی بدحالی اور روزگار کی پریشانی کا آسان حل، طلبا کے لئے معلومات کا بیش بہا خزانہ، پبلک زندگی بسر کرنے والوں اور مصلحان اخلاق کے لئے مشعلِ ہدایت۔

ہندوستان کے سربرآوردہ رسائل اور اخبارات، ممتاز لیڈران قوم، تعلیمی اداروں کے صدر اور علم دوست احباب نے اس پر بہترین الفاظ میں تبصرہ کیا ہے اور اسکے افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے نصاب تعلیم میں داخل کئے جانے کی ہدایت کی ہے۔ اس صدی کے مطبوعات میں اس سے زیادہ مفید اور کارآمد کتاب شائع نہیں ہوئی جو ہر فرقہ ہر قوم اور ہر پیشہ کے لئے یکساں مفید ہو۔

حجم ۲۵۶ صفحات، مجلد معمولی عہ مجلد خاص عا

ملنے کا پتہ :- صدیق بک ڈپو لکھنؤ

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہو

مرتبہ

سید ابوالحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبدالسلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۳ شعبان المعظم ۱۳۶۱ھ مطابق اگست ۱۹۴۲ء نمبر ۸

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر منیجر رسالۂ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے

شذرات

الندوہ کی کسی گذشتہ اشاعت میں درس قرآن مجید کا ذکر آیا تھا اور ترجمہ کے سلسلہ میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ اوسط درجہ کا اردوداں زیادہ سے زیادہ دس دن میں عربی زبان میں اتنی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ شروع کر سکے، اسطرح ڈیڑھ مہینہ میں سورۂ بقرہ ختم ہو جاتی ہے جس کے بعد آسانی سے پانچ یا چھ مہینہ میں پورے قرآن مجید کا ترجمہ ضروری تشریحات کے ساتھ ختم ہو سکتا ہے۔ ترجمہ میں چونکہ عربی زبان کے اصول و قواعد کا خیال رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ادب و انشاء کا کام بھی ہوتا رہتا ہے اس لئے قرآن مجید ختم کرتے کرتے اتنی اچھی خاصی عربی آجاتی ہے کہ حدیث، فقہ، اور تاریخ کی بے اعراب کتابیں آسانی سے پڑھی اور سمجھی جا سکتی ہیں۔ ہمارا یہ بیان شاید بہتوں کے نزدیک مبالغہ آمیز ہو اور غالباً انھیں اسے باور کرنے میں تأمل ہو لیکن ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں اور آج پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ دس بارہ برس کے مسلسل تجربے کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہونچے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ جہاں بھی تجربہ کیا جائیگا، انشاءاللہ تعالیٰ ایسے ہی حیرت انگیز نتائج نکلیں گے۔

اس سلسلہ میں ہماری پہلی تحریر پڑھکر بعض لوگوں نے ہمیں خطوط لکھے اور طریق درس کی تفصیلات دریافت کیں، انفرادی طور پر ہم ان خطوط کا جواب دے چکے ہیں، اور طریق کار کی تفصیلات سے لوگوں کو مطلع کر چکے ہیں، لیکن اس بارے میں عملی رہنمائی کی ضرورت ہے، بعض دوستوں کا خیال ہے کہ فی الحال کم از کم لکھنؤ میں ایک اس قسم کا حلقۂ درس قائم کیا جائے ہم اس تجویز پر غور کر رہے ہیں، اگر حالات سازگار رہے تو انشاءاللہ عنقریب عملی کام شروع ہو جائے گا، جو لوگ اسطرح قرآن مجید پڑھنا چاہتے ہوں وہ اس بارے میں راقم الحروف یا مولانا ابوالحسن علی صاحب سے خط و کتابت کریں جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ آنا چاہئے

جمیعۃ العلماء کے گذشتہ اجلاس میں اصلاح نصاب کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا تھا اور اس سلسلہ میں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدیر برہان کی تحریک اور مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تائید سے ایک تجویز بھی منظور ہوئی تھی، معلوم نہیں اس معاملہ میں اب تک کیا ہوا ہے اور آئندہ کیا تجاویز پیش نظر ہیں لیکن ہمیں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کے جوش و خلوص سے خاص توقعات ہیں اور اُمید ہے کہ جو تجویز ان کی جد و جہد سے جمیعۃ العلماء کے کھلے اجلاس میں منظور ہو چکی ہے وہ انشاء اللہ ایک دن عمل کا قالب بھی اختیار کرے گی، مولانا محمد طیب صاحب کی تائید اس تجویز کی کامیابی کے لئے ایک مبارک فال ہے۔

موجودہ تعلیم کی بے حاصلی کا احساس اب عام ہوتا جا رہا ہے، اور یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اگر دینی اور ملی پہلوؤں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی خالص دنیاوی نقطۂ نظر سے اس تعلیم کا یہ حال ہے کہ اس طویل عرصہ میں "اُس نے کوئی بڑا سائنس داں، ریاضی داں، طبیعات کا ماہر، علم ہیئت کا ماہر، اور کوئی بڑا فلسفی نہیں پیدا کیا، ملک ہنوز تمام تخیلات اور ارتقائی کیفیات کے لئے غیر ملکوں کا محتاج ہے، یہ تعلیم کوئی ایسا سماج بھی پیدا نہ کر سکی جو ملک کو ایک شیرازہ میں منسلک کر کے قومیت کی لڑی میں پرو دیتا، نہ یہ تعلیم اخلاق حسنہ پیدا کرنے کے لئے کافی ہے نہ روح کی تنظیم کرنے کے لئے"[1]۔

یہ صورت حال بہت زیادہ قابل توجہ ہے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو اس جانب خاص طور پر غور کرنا ہے، ضرورت ہے کہ ان کے سارے تعلیمی نظام کا پورے طور سے جائزہ لیا جائے، تعلیم و تربیت کے ماہر کامل غور و خوض کے بعد آئندہ نظام تعلیم کا ایسا خاکہ مرتب کریں جو مسلمانوں کے حال کو ان کے ماضی سے اس طرح

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ ہو)

[1] خطبۂ استقبالیہ ڈاکٹر نجم الدین صاحب جعفری ایجوکیشنل کانفرنس الہ آباد

حضرت مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ

سید ابو الحسن علی ندوی

خاندان امیر کبیر شیخ الاسلام سید قطب الدین محمد بن احمد المدنی (م ۶۷۷ھ مدفون کڑہ) کی اولاد میں جو ہندوستان کے حسنی سادات کے مورث اعلیٰ ہیں، گیارھویں صدی ہجری کی ابتداء میں قصبہ نصیر آباد جائس (ضلع رائے بریلی) میں سید محمد فضیل اور سید محمد اسحٰق دو نامور بھائی تھے۔ جو علم و عمل زہد و تقویٰ اور اتباع سنت میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔

حضرت سید محمد فضیل کے صاحبزادہ حضرت سید شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو حضرت سید آدم بنوریؒ (خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ) کے اکابر خلفاء میں سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت خاص، پیروی سنت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اتباع شریعت میں یگانۂ روزگار تھے۔[1] آپکی اولاد میں کثرت سے علماء و مشائخ پیدا ہوئے جنمیں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سب سے زیادہ نامور ہیں۔

حضرت سید محمد اسحٰق کے صاحبزادے دیوان سید خواجہ احمد رح تھے۔ جو ایک متبحر عالم، صاحب افتا و تدریس اور شیخ الطریقت تھے، علوم ظاہری میں شیخ محب اللہ الہ آبادی کے شاگرد تھے۔ آپکے چچازاد بھائی حضرت شاہ علم اللہؒ نے آپ ہی سے پڑھا تھا، شاہ صاحب ہی کی تحریک سے (جب وہ حضرت سید آدم بنوریؒ کے فیض سے مستفیض ہو کر آئے) آپ بھی سید آدم بنوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت سید ہندوستان سے ہجرت کر کے حرمین تشریف لیجا رہے تھے اور بارش کی زیادتی کی وجہ سے گوالیار میں مقیم تھے، دیوان سید خواجہ احمدؒ صاحب نے وہیں بیعت کی۔ اور تھوڑے دنوں میں کمالات باطنی حاصل کر کے خلافت سے سرفراز ہوئے اور وطن واپس آگئے، جہاں طالبین کی

---

[1] سید شاہ علم اللہ صاحبؒ کے حالات و اخلاق کے لئے ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہید باب اول سید صاحب کا خاندان

تعلیم و تربیت میں مشغول رہکر ترسٹھ سال کی عمر میں ۱۲۶۰ھ میں وفات پائی[1]۔

دیوان سید خواجہ احمد صاحبؒ کی پانچویں پشت میں سید محمد یٰسین ہیں، جو باوجود ملازمت شاہی کے ایک صاحب دل اور درویش سیرت بزرگ تھے۔ آپ حضرت سید شاہ نجم الہدیٰؒ کے خلیفہ تھے جو حضرت سید محمد عدل عرف شاہ لعل صاحب کے خلیفہ مولوی محمد یحییٰ جائسیؒ کے واسطے سے حضرت سید شاہ علم اللہؒ کے سلسلۂ نقشبندیہ میں داخل تھے، سید محمد یٰسین صاحب نے ۱۲۶۳ھ میں وفات پائی، آپ کے دو صاحبزادے تھے، سید محمد صاحب اور حضرت سید خواجہ احمدؒ۔

ولادت اور ابتدائی حالات

مولوی سید محمد علی صاحب اپنی کتاب "تخت طاؤس" میں لکھتے ہیں کہ حضرت سید احمد شہید نے جب جمادی الثانی ۱۲۴۱ھ میں جہاد کے لئے وطن سے ہجرت کا ارادہ فرمایا اور آپکے مریدین و معتقدین کو اطلاع ہوئی تو وہ جوق جوق آپکی آخری ملاقات اور زیارت کے لئے اپنے اپنے شہروں سے دائرہ حضرت شاہ علم اللہؒ رائے بریلی میں حاضر ہوئے، اسی غرض کے لئے آپکے بہت سے اعزہ اور اہل خاندان، مرد اور عورت قصبۂ نصیر آباد سے بھی آئے (جو سید صاحبؒ کا قدیم، آبائی وطن اور آپکے خاندان کا دوسرا مسکن تھا) ایک مہینہ آپکی خدمت بابرکت میں حاضر رہکر انھوں نے رخصت چاہی، سید صاحب نے اجازت دی، رخصت ہوتے وقت سید محمد علی صاحب کی اہلیہ نے عرض کیا کہ میری حقیقی بہن (زوجۂ سید محمد یٰسین صاحب) کا ایک پیغام ہے جو میں پہونچاتی ہوں۔ انھوں نے عرض کیا ہے کہ میرا بچہ محمد طٰہٰ تین سال کی عمر میں جاتا رہا، اس کا غم ابھی تک تازہ ہے، میری گذارش ہے کہ جناب دعا فرمائیں کہ صحت و تندرستی کی اولاد ہو، فرزند رشید ہو اور سعادتمند ہو، حضرت نے اپنے معمول کے مطابق کچھ دیر خاموش اور مراقب ہوکر فرمایا کہ انشاء اللہ فرزند ہوگا، جب وہ پیدا ہو تو اس کا نام اس کے جد امجد حضرت دیوان خواجہ احمدؒ کے نام پر رکھا جائے انشاء اللہ وہ فضل و کمال اور علوم دینی میں

---

[1] سیرت السادات

بعض اعتبار سے اپنے جدِ امجد سے سبقت لیجائے گا۔

انھوں نے یہ خواب بھی بیان کیا کہ میں نے ایامِ حمل کی ابتدا میں دیکھا کہ ماہِ کامل اپنی جگہ سے جست لگا کر میرے منھ میں چلا گیا اور اس کے روپوش ہونے سے تمام دُنیا میں تاریکی پھیل گئی، کچھ دیر کے بعد وہ باہر آگیا اور اپنی جگہ پہونچ گیا حضرت نے اسکی یہ تعبیر دی کہ اس بچہ کی ولادت سے اسکی پیشانی کا نور چار دانگ عالم میں پھیل جائے گا اور مومنین اور بعض مبتدعین کے قلوب کو منور کردے گا، جہالت کی جو تاریکی اسوقت پھیلی ہوگی اسکی روشنی سے کافور ہو جائے گی، اس کے ہاتھ اور زبان سے دین کی تازگی اور ترقی ہوگی۔

یہ بشارت سن کر وہ اپنے گھر آئیں اور اپنی بہن کو یہ مژدہ سنایا انھوں نے سجدۂ شکر کیا، عجیب ماجرا ہے کہ ۰ رجمادی الثانی ۱۲۴۱ھ کو دوشنبہ کے دن (جس روز حضرت سید احمدؒ شہیدؒ نے ہجرت فرمائی) صبح کے وقت طلوعِ آفتاب سے پہلے حضرت سید خواجہ احمدؒ صاحب کی ولادت ہوئی اور اسی روز شام کو بعد عصر حضرت سید صاحب نے ہجرت کے لئے رائے بریلی سے کوچ فرمایا

تعلیم آپنے درسی کتابیں مختصرات سے متوسطات مختصر المعانی وغیرہ تک اپنے عزیز بزرگ مولانا سید محمد نصیرآبادیؒ سے پڑھیں. جو اساتذۂ لکھنؤ اور پھر حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے شاگرد رشید اور حضرت سید احمدؒ شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ و مجاز تھے[1]۔

۱۲۵۴ھ میں چودہ[2] سال کی عمر میں آپکے والد محترم آپکو مولانا سخاوت علی جونپوری (خلیفۂ حضرت سید احمد شہیدؒ) کی خدمت میں باندہ لیگئے جہاں آپ نواب ذوالفقار علی خاں بہادر والی باندہ کی طرف سے ریاست کے مفتی اور مدرسہ کے مہتمم تھے اور درس دیا کرتے تھے، آپکے والد آپکو مولانا سخاوت علی صاحب کے سپرد کرکے چلے آئے. تین سال آپ باندہ میں مولانا کی خدمت میں رہکر علوم کی تحصیل کرتے رہے. مولانا جب باندہ سے

---

[1] تسلیۃ الاکرمین تذکرۂ مولانا السید خواجہ احمدؒ مخطوطہ کتبخانۂ ریاست ٹونک [2] تسلیۃ الاکرمین اور نزہۃ الخواطر جلد ۰

اپنے وطن جونپور تشریف لائے تو آپ بھی ساتھ آئے۔ پھر جب مولانا دوبارہ باندہ تشریف لیگئے تو آپ بھی ہمرکاب تھے۔ ڈیڑھ دو سال مزید قیام فرما کر علوم کی تکمیل کی، اور ۱۲۵۹ھ میں انیس سال کی عمر میں آپنے تعلیم سے فراغت حاصل کی۔

چونکہ مولانا سخاوت علی صاحبؒ آپکے ایسے خاص استاد اور مربی تھے جنکی شاگردی پر آپ کو ہمیشہ فخر رہا اور آپکی ذہنی و اخلاقی و علمی تربیت اور مسلک و خیالات میں مولانا سخاوت علی صاحب کا سب سے بڑا دخل اور سب سے زیادہ اثر تھا، اور ہمیشہ قائم رہا اسلئے اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہو کہ مولانا سخاوت علی صاحب کی شخصیت اور ان کے مسلک و ذوق کا اندازہ ہو جائے کہ اس زمانے میں استاد نہ صرف معلم ہوتا تھا، بلکہ مربی، اور ایک طرح کا شیخ اور امام بھی۔

مولانا سخاوت علی صاحب کو مولانا اسمٰعیل شہید دہلویؒ اور مولانا عبدالحی بڑہانوی سے تلمذ کی نسبت اور حدیث کی سند حاصل تھی، علوم عقلی و نقلی کی تکمیل مولانا احمداللہ انامی تلمیذ حضرت شاہ اسحٰق صاحب دہلویؒ سے کی تھی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت تھی۔ اور آپکے خاص لوگوں میں تھے۔ سید صاحب مولانا کی درخواست پر ان کے وطن منڈیاہو ضلع جونپور بھی تشریف لیگئے تھے، آخر وقت تک سید صاحب کے مسلک و طریق پر قائم رہے، نہایت متقی پرہیزگار اور متبع سنت بزرگ تھے۔ آپکے ذریعہ سے قدیم جاہلانہ رسوم کا ابطال اور مذہبی شعائر کا اجرا بہت ہوا، وعظ و تلقین سے ہمیشہ رد بدعات اور اتباع سنت کی ترویج و اشاعت میں کوشاں رہے، فتویٰ مدلل لکھتے تھے۔ اقوال فقہا میں سے ہمیشہ اس قول پر فتویٰ دیتے تھے جسکی تائید قرآن و سنت صحیحہ سے ملتی تھی، مولانا کا یہ فیض ہو کہ ابتک جونپور میں کوئی سُنی تعزیہ داری نہیں کرتا، تمام عمر اول وقت پر مسجد میں باجماعت نماز کا خاص اہتمام تھا، عصر کی نماز ہمیشہ ایک مثل پر اور فجر کی نماز قرأت طویلہ کے ساتھ غلس میں پڑھتے تھے

آخر عمر میں ہندوستان کے مشہور ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے چھ ماہ قبل مولانا امیر علی صاحب شہید کی

شہادت کے بعد ہجرت کرکے مکۂ معظمہ چلے گئے، وہاں بھی درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا ۱۳۲۱ھ میں وہیں انتقال فرمایا۔[1]

آپنے مولانا سخاوت علی صاحبؒ کی خدمت میں تمام علوم معقول ومنقول کی تکمیل کی، فراغت کے بعد خاندان کے بزرگوں کے اصرار سے وطن واپس تشریف لائے، ۱۴ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لئے جانے سے پہلے آپکا نکاح ہوگیا تھا، واپسی پر نہایت سادگی کے ساتھ رخصتی کی رسم ادا ہوئی، جس میں خلافِ شرع امور اور فضول مراسم سے پورا اجتناب کیا گیا۔

بیعت وسلوک　پہلا سلسلہ:۔ آپنے سب سے پہلے حضرت شاہ یار محمدؒ صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی جو حضرت سید شاہ نجم الہدیٰ نصیرآبادیؒ کے خلیفۂ اعظم تھے، حضرت سید نجم الہدیٰ عارف کامل مولانا محمد یحییٰ جائسیؒ کے خلیفہ تھے، اور وہ حضرت سید محمدؒ عدل عرف شاہ لعل صاحبؒ کے اور وہ اپنے والدِ محترم حضرت سید محمدؒ کے اور وہ اپنے والدِ محترم حضرت سید شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اور وہ حضرت سید آدم بنوریؒ کے اور وہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے۔ یہ سلسلہ حضرت شاہ علم اللہؒ کی خصوصیات اوران کے فیض کا بہترین حامل تھا۔ حضرت سید محمدؒ اپنے والد حضرت شاہ علم اللہؒ کے سب سے چھوٹے اور محبوب ترین فرزند اوران کے خاص تربیت یافتہ اور گویا ان کے ترجمان حال اور لسان مقال تھے فرماتے ہیں کہ حضرت والد ماجد نے آخر عمر میں جب کمال اتباع نبویؐ اور مشابہت محمدیؐ میں تحریر و کتابت بھی چھوڑ دی تو مجھے ارشاد ہوا کہ فوائد خطوط آنجناب کی طرف سے میں لکھا کروں، چنانچہ اسکی وجہ سے سایہ کی طرح ساتھ رہتا، اور جو کچھ ارشاد ہوتا اس کو قلمبند کرتا، آخر میں حضرت والد نے لوگوں سے ملاقات بہت کم کردی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر مشتمل ایک تحریر لکھوائی، جب کوئی ملنے آتا تو مجھے حکم ہوتا کہ میں جا کر سنا دوں، خواص میں سے جس کو میں اہل سمجھتا اس کے متعلق عرض کرتا اور آپ باہر

---

[1] ماخوذ از تحریر مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی جونپوری حفید مولانا سخاوت علی صاحبؒ، مندرج سیرت سید احمد شہید

تشریف لاتے اور ملاقات کرتے۔

حضرت سید محمدؒ صورت و سیرت میں اپنے والد بزرگوار سے سب سے زیادہ مشابہ تھے، اور استغنا، توکل، اتباع شریعت اور اظہار حق اور امر بالمعروف میں والد ماجد کے قدم بقدم، مولانا سید محمد نعمان (عم حقیقی حضرت سید احمد شہیدؒ) اپنی کتاب اعلام الہدیٰ میں لکھتے ہیں، کہ "ایک مرتبہ ناظم صوبۂ الہ آباد[1] مہتہ دیابہادر ناگر کا لشکر رائے بریلی میں وارد ہوا، ناظم حضرت کی خانقاہ میں خود آیا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت سید اسوقت مکان میں تشریف رکھتے تھے، کسی کی زبانی کہلوا دیا کہ اگر ناظم صاحب کا آنا اسوقت ہوا ہوتا جب یہ فقیر مسجد میں بیٹھا ہوا تھا تو فقیر ملاقات کر لیتا اور امر بالمعروف کا کلمہ کہکر اور اسلام کی دعوت دیکر اپنے حق سے ادا ہو جاتا، اب تو اسلام کی تمنا کے بغیر اپنے حجرے اور مسجد سے نکلنا اور آپکی ملاقات کے لئے باہر آنا ہماری شریعت میں روا نہیں، اگر اسلام قبول کریں تو شوق سے آئیں، میں ملاقات کروں گا، اور دوستی اور محبت سے پیش آؤں گا، ورنہ میری طرف سے معذرت قبول ہو۔ باقی یہ فقیر تمام بندگان خدا کے حق میں دعائے خیر کرتا رہتا ہے۔"

لطف یہ کہ ناظم مذکور اپنی معقولیت و لیاقت کی وجہ سے ناراض نہیں ہوا، اور بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ کہا کہ سید صاحب اپنے فرض امر بالمعروف اور دعوت اسلام سے سبکدوش ہو گئے، میں اپنی کم نصیبی سے اس دولت سے محروم ہوں، یہ کہکر وہ واپس آیا اور اپنے مصاحبوں سے کہا کہ ایسا بے نیاز اور متوکل بزرگ اس زمانے میں نہ دیکھنے میں آیا نہ سننے میں، بزرگان و مشائخ تو امرا اور ناظموں پر اثر ڈالنے اور ان کو اپنا بنانے کے لئے کیسے کیسے وظیفے اور عمل اور تدبیریں کرتے ہیں پھر شہر کے قریب کچھ مواضعات کا پروانہ لکھ کر حضرت کی خدمت میں بھیجا اور عرض کیا کہ میں بادشاہ کا نائب ہوں اور مجھے حکم ہے کہ سادات کرام مشائخ علماء اور درویشان عالی مقام کو تلاش اور دریافت کر کے ان کے لائق ان کی خدمت کروں، اسلئے یہ درحقیقت بادشاہ

---

[1] اس زمانہ کی حیثیت اور اصطلاح کے مطابق صوبہ کا گورنر

کی طرف سے نذر ہو، جناب مجھ گنہگار اور غیر مسلم کو درمیان میں تصور نہ فرمائیں اور اسکو قبول کریں۔

حضرت سید محمدؒ کے صاحبزادے حضرت سید محمد عدل عرف شاہ لعل صاحبؒ اپنے والد کے خاص تربیت یافتہ اور وقت کے جلیل القدر مشائخ نقشبندیہ میں سے تھے، قوت نسبت معرفت و علو مقامات، اتباع سنت، زہد، ورع ایثار و استغنا اور تربیت سلوک میں دُور دُور مشہور تھے، اودھ میں آپ ہی کی ذات طالبین و سالکین کا سب سے بڑا مرکز و مرجع تھی۔ ۱۲ رمضان المبارک ۱۲۹۲ھ کو وفات ہوئی۔ مُریدین و مستفیدین میں مولانا انوار الحق فرنگی محلی، مولانا ذوالفقار علی دیوی، قاضی عبدالکریم جوراسی، مولانا احمدی کرسوی، شاہ محمد یحییٰ جائسی مولانا سید محمد نعمان نصیر آبادی جیسے مشاہیر علماء و مشائخ ہیں۔

مولانا خواجہ احمدؒ صاحب اس سلسلہ میں دو واسطوں سے داخل ہیں، ایک شاہ یار محمدؒ صاحب کے ذریعہ، دوسرے خود اپنے والد محترم سید محمد یٰسین صاحب کے ذریعہ، دونوں حضرات، حضرت سید نجم الہدیٰؒ کے خلیفہ تھے۔

دوسرا سلسلہ:۔ اس کے بعد آپ نے اپنے استاد اور بھائی حضرت مولانا سید محمد بن اعلیٰ نصیر آبادی کے ہاتھ پر بھی بیعت کی جو حضرت امیر المومنین سید احمدؒ شہیدؒ کے خلیفہ تھے، مولانا سید محمدؒ صاحب نے آپکو حضرت سید صاحب کے پانچوں سلسلے قادریہ چشتیہ نقشبندیہ مجددیہ اور محمدیہ (سید صاحب کا خاص طریقہ) میں خلافت عطا کی۔

مولانا بیان فرماتے تھے کہ پیر و مرشد اور برادر بزرگ مولانا سید محمدؒ صاحب فرماتے تھے کہ میں نے جب حضرت سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تو سید صاحب نے مجھے خلافت عطا فرمانے کا ارادہ کیا میں نے عرض کیا کہ میں اس بار کا متحمل نہ ہوسکوں گا، فرمایا، اس کو قبول کرلو، ہمارے اور تمہارے درمیان ایک وسیلہ پیدا ہوگا جو اس بار کا متحمل اور اس دولت کا سزاوار ہوگا۔[1]

تیسرا سلسلہ:۔ اپنے اُستاد و شیخ مولانا سید محمدؒ کی وفات کے بعد جب آپ ۱۲۸۰ھ میں حج کیلئے

[1] مہر جہانتاب از مولوی حکیم سید فخر الدین صاحبؒ۔

مکہ مکرمہ گئے تو وہاں حضرت مولانا محمد یعقوبؒ مہاجر مکہ (نواسۂ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ) سے طرق اربعہ میں خلافت واجازت حاصل کی اور چھ مہینہ ان کی خدمت میں ٹھیر کر ان کے علوم وکمالات سے اور اور فیوض سے مالا مال ہوئے اور اعمال مشائخ کی اجازتیں، سند حدیث اور خرقۂ خلافت اور ملبوس خاص کا عطیہ حاصل کیا۔

اس طرح آپ صرف مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے ایک واسطہ سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے سلسلہ میں داخل ہیں۔

حج اور مولانا محمد یعقوب صاحب سے استفادہ مولانا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ۱۲۷۸ھ میں حج کو گئے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب دہلویؒ اپنے برادر بزرگ سند العلماء والمحدثین استاذ الہند حضرت مولانا محمد اسحٰق صاحبؒ کے ساتھ ۱۲۵۸ھ میں ہندوستان سے مکہ مکرمہ ہجرت کر گئے تھے، حضرت مولانا محمد اسحٰق صاحبؒ نے ۱۲۶۲ھ میں انتقال فرمایا، لیکن حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ۱۲۸۱ھ تک ایک عالم کو فیض پہونچاتے رہے۔ مولانا خواجہ احمد صاحبؒ مولانا دہلوی کی خدمت میں چھ مہینے مقیم رہے، اس خاندان سے قدیم علمی و دینی تعلقات اور آخری اور سب سے محکم حضرت سید احمد شہیدؒ بریلوی کے تعلق اور تعارف کی بنا پر پھر استعداد و اہلیت اور سعادت فطری کی وجہ سے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے مولانا خواجہ احمد صاحبؒ کی بڑی پذیرائی فرمائی اور ان کی طرف خاص توجہ مبذول کی، مولانا خواجہ احمد صاحبؒ فرماتے تھے کہ تمام علوم ظاہری و باطنی کی سند مجھے اسی مرکز رشد و ہدایت سے حاصل ہوئی، اور میں نے جو کچھ پایا یہیں سے پایا، تمام کیفیتوں کا حصول اور زیارت حرمین شریفین کے شرف کا ادراک بھی انھیں کی توجہ کا ثمرہ ہے۔

آپ کے خلیفہ اور بھتیجے مولوی حکیم سید فخرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہر جہانتاب میں لکھتے ہیں کہ حضرت جب اپنے استاد و شیخ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا تذکرہ فرماتے تو آپ پر ایک ذوق و وجد

طاری ہو جاتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ آپ اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہیں، اکثر ان کا ذکر کرتے وقت آپکی آنکھیں پر آب ہو جاتیں اور فرماتے کہ اسکی حسرت ہو کہ آپ کی زیارت کا دوبارہ شرف حاصل نہ ہوا، اور آپ کی وفات ہو گئی۔

ایک مرتبہ ذکر کرتے وقت آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا کہ جب میں نے مدینۂ طیبہ زادہا اللہ شرفاً کا عزم کیا تو روزانہ دلائل الخیرات کا ایک دور کرتا تھا جب زیارت قبر نبویؐ سے مشرف ہوا تو قبر نبویؐ کے سامنے بیٹھ کر دلائل الخیرات پڑھتا اُسوقت ایسی کیفیت حاصل ہوتی کہ وطن کی واپسی کا عزم فسخ کردینے کا جی چاہتا اور وہیں پیوند خاک ہو جانے کی آرزو ہوتی، ایک مرتبہ دُرود شریف پڑھتے ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وجلال اور آپ کی نسبت پدری کا ایسا جوش ہوا کہ میں نے چشم بصیرت سے دیکھا کہ خود بدولت واقبال رونق بخش ہیں، یہاں تک کہ ایک روز اثنا اقرأت دلائل الخیرات میں یہی کیفیت ظاہر ہوئی اور یہ آواز کان میں پہونچی کہ تمہارا آنا مقبول ہوا، اس مژدۂ جانفزا سے میرا مردہ دل وہاں تازہ ہو گیا۔

آپ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا اکثر اپنی مجلس میں ذکر فرماتے اور رکھ رکھ کر ان یادگار صحبتوں کو یاد کرتے، ایک مرتبہ فرمایا کہ مولانا کا حکم تھا کہ جب آؤ تو مجھے اپنی آمد کی اطلاع کردو، میں فوراً باہر آجاؤں گا لیکن بعض مرتبہ میں تعمیل حکم کے لئے اطلاع کر دیتا اور بعض مرتبہ انتظار میں بیٹھا رہتا جب آپ مکان سے برآمد ہوتے تو فرماتے کہ تم نے اطلاع کیوں نہیں کی، میں عرض کرتا کہ اس خیال سے اطلاع نہیں کی کہ حضرت کسی کام میں لگے، میری وجہ سے کام چھوڑ کر باہر تشریف لانا پڑے گا۔ فرماتے کہ نہیں اطلاع کر دیا کرو، اگر کسی ضروری کام میں ہوں گا تو کہلوا دوں گا ورنہ باہر آجاؤں گا۔

فرماتے تھے کہ جب حضرت شیخ حرم محترم میں داخل ہونے لگتے تو میں چاہتا کہ نعلین مبارک اُٹھالوں، یا کہیں حفاظت سے رکھدوں، لیکن آپ اس کو پسند نہ فرماتے اور اس کام کو کسی اور خادم

کے سپرد کردیتے حضرت شیخ کبرسنی کے باوجود اور متعدد خدمتگاروں اور نیازمندوں کے ہوتے ہوئے
بھی کسی سے اپنے کسی کام کے لئے نہ فرماتے اور اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے، ایک مرتبہ حرم سے واپس آتے
ہوئے، آپنے ایک تربوز اور کچھ اور چیزیں خریدیں، میں نے چاہا کہ تربوز اپنے ہاتھ میں لیلوں لیکن آپنے
کسی طرح اس کو منظور نہ کیا اور سب چیزیں اپنے ہاتھ میں لیکر آئے۔

تبلیغ و اصلاح مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت و مقبولیت کا سب سے بڑا ثبوت اور آپکی زندہ جاوید
کرامت وہ دینی اصلاح اور تغیر ہے جو آپ کی ذات سے رونما ہوا۔ جب سے آپ علم حاصل کرکے آئے دم واپسیں
تک آپ ہدایت وارشاد ہی میں مشغول رہے اور آپنے اپنی زندگی کا کوئی دن یہاں تک کہ مرض موت کا
کوئی لمحہ بھی ضائع نہیں کیا، اسی کے لئے آپنے شہروں اور دیہاتوں کے سفر اور دورے فرمائے، اسی
کے لئے آپ لوگوں سے بیعت اور عہد و پیمان لیتے تھے، اسی کے لئے مریدین کی تعلیم و تربیت تھی، اور
اور اسی کے لئے وعظ و تقریر، اودھ اور صوبہ متحدہ کے مشرقی حصہ میں مدت دراز سے جہالت و ضلالت
کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی، اور یہ خطہ علماء و مصلحین کی ہدایت و توجہ اور اہل اللہ کے انفاس و برکات سے
عرصۂ دراز سے محروم چلا آرہا تھا، اس مردم خیز سرزمین میں بلاشبہ بڑے بڑے مجتہدانہ قابلیت کے علماء
غیر فانی مصنف، جہاں استاد عالم و معلم، بادشاہوں کے مخدوم خادم علم، صاحب دل درویش و صوفی،
صاحب اسرار و حقائق عارف اور صاحب مقامات و کرامات سالک و مجذوب پیدا ہوئے، لیکن
یہاں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان کی کوئی نظیر نہیں ملتی، جس کی کوشش و برکت سے دہلی اور سہارنپور
کے اطراف و نواح دارالاسلام کا نمونہ بن گئے۔ اودھ کے ایک عالم کا مرتب کیا ہوا نصاب درس ساری
ہندوستان میں رائج ہے، اور اسطرح یہاں کے علم کا سکہ مشرق و مغرب میں رواں ہے، لیکن اس عالم
کے وطن ہی میں اور اس کے گرد و پیش کوئی متشرع زندگی اور دینداری کے آثار نہیں نقشبندیوں کے
ایک پرجوش خاندان نے (جس کے بزرگوں کا ذکر اس مضمون کی ابتداء میں ہوا ہے)، البتہ

اپنے حلقہ میں بڑی اصلاح کی اور بالخصوص احترامِ شریعت اور اتباعِ سنت کا علم بلند اور تقریباً دو صدیوں تک سنت وشریعت کی شمع روشن رکھی، اور پھر آخر میں اس کے ایک فرد حضرت سید احمد شہیدؒ نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا، علما اور مصلحین کے ایک گروہ عظیم کے ساتھ اودھ کے قصبات شہروں اور دیہاتوں کا دورہ کیا، شرک وکفر اور بدعات کے خلاف لسانی اور عملی جہاد کیا، اور ہزاروں آدمیوں کو اسلام کے صحیح راستہ پر لگا دیا[1]۔ لیکن سفرِ ہجرت وجہاد پیش آجانے کی وجہ سے اس کام کی تکمیل نہ ہو سکی۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جتنا اثر یوپی کے مغربی اور مشرقی حصہ پر ہوا، وہ وسطی حصہ اور اودھ پر نہیں ہوا، اور یہ دوآبہ آپ کے دریائے فیض سے اتنا سیراب نہ ہو سکا جتنا سہارنپور اور اس کے نواح یا جونپور اور اس کے اطراف ہیں۔

اودھ کے ان مخصوص حالات اور یہاں کی دینی ویرانی اور بے رونقی اور بدعات کی کثرت کے کچھ تاریخی اسباب ہیں، انہیں سے تین سبب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

پہلا اور سب سے بڑا سبب اودھ کی سلطنت ہے، محمد شاہ کے عہد میں اودھ کی صوبہ داری برہان الملک نواب سعادت خاں محمد امین نیشاپوری کے حصہ میں آئی، جو اپنی نسل اور تہذیب کے اعتبار سے ایرانی اور مذہباً شیعہ تھے، ان کے داماد صفدر جنگ منصور علی خاں ان کے جانشین ہوئے اور انھیں کی اولاد میں سلطنت آخر تک رہی یہاں تک کہ واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ سے انگریزوں نے حاصل کی، اس خاندان کو اودھ پر سوا سو برس سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع ملا، ہندوستان کی دینی واصلاحی تاریخ میں یہ عہد بڑا اہم ہے، اس کے آغاز میں دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنے علوم اور فیوض سے ایک عالم کو فیضیاب کر رہے تھے، شاہ صاحبؒ نے ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی جو نواب شجاع الدولہ کی وزارت (اودھ) کا زمانہ ہے، شاہ عبد العزیز صاحبؒ آصف الدولہ اور

[1] ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہیدؒ

نواب سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر کے معاصر ہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے معاصر لکھنؤ میں مولانا سید دلدار علی نصیر آبادی مجتہد تھے، جنھوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے شیعوں میں جمعہ و جماعت قائم کی، ان کے زمانۂ اجتہاد میں مذہب شیعہ کی بڑی اشاعت و ترویج ہوئی۔ نواب آصف الدولہ کو بھی اس سے بڑی دلچسپی تھی، بکثرت شرفاء اور متعدد خاندان سادات نے مذہب شیعہ اختیار کر لیا۔ آخر میں امجد علی شاہ (م ۱۲۶۳ھ) (والد واجد علی شاہ) کو اپنے مذہب کی اشاعت سے خاص شغف تھا۔ اور انھوں نے اسمیں بڑا حصہ لیا۔

شیعیت کے ساتھ تشیع کی بھی بڑی اشاعت ہوئی، اودھ کے مسلمانوں میں شیعوں کے خیالات و عقائد بکثرت مقبول ہو گئے، اور ان کی معاشرت میں ان کے رسوم بے تکلف داخل ہو گئے۔ سنیوں میں تعزیہ داری اور مجلس خوانی کا رواج بھی یہاں کی خصوصیات میں سے ہے، بدعات اور بعض مشرکانہ اعمال کی بھی جو کثرت ہے وہ شاید دوسرے مقامات پر نہ ہوگی۔ پھر اس سب کے علاوہ ایک عام دینی بے رونقی ہے جو پورے اودھ میں پائی جاتی ہے، لکھنؤ جیسے بڑے شہر میں جو سو برس سے زائد مدت تک مسلمانوں کا دارالسلطنت رہ چکا ہے، جامع مسجد کا نہ ہونا، اور دوسرے شہروں میں بھی بڑی اور وسیع مسجدوں کی کمی اور ان کی بے رونقی، اودھ کی خصوصیات اور یہاں کی سلطنت کے آثار میں سے ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ عقائد و اعمال کی اصلاح، اتباع سنت کا ذوق و ولولہ، تبلیغ دین اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جوش اور حقیقی روحانیت اور صحیح دینی رنگ قرآن و حدیث سے پیدا ہوتا ہے، انھیں کے مطالعہ سے شریعت و غیر شریعت، سنت و بدعت اور اپنے زمانہ اور خیر القرون کا فرق معلوم ہوتا ہے منطق و فلسفہ اور علوم ادبیہ اور ریاضیہ کا نہ یہ موضوع ہے اور نہ ان کو ان باتوں سے سروکار، ان کے مطالعہ اور درس و تدریس اور انمیں انہماک کرنے سے نہ ان مسائل کی اہمیت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ دینی اصلاح و تغیر کا شوق و جوش، اور نہ بے دینی یا خلاف دین امور پر بے چینی اور

بیقراری پیدا ہو سکتی ہو۔ اودھ کے علما کو انھیں علوم عقلیہ میں انہماک تھا، اور انمیں سے بعض کو ان علوم میں درجۂ امامت واجتہاد حاصل تھا لیکن علماء اودھ کی طویل فہرست میں مرزا حسن علی لکھنوی مولانا سید قطب الہدیٰ رائے بریلوی اور شکل سے دو ایک افراد کو چھوڑ کر (جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان کے شاگرد تھے اور وہاں سے حدیث کا ذوق لیکر آئے تھے) ایسے لوگ نہیں ملتے جنھوں نے حدیث سے پورا اشتغال کیا ہو اور ان کی زندگی اسکی خدمت اور اشاعت میں صرف ہوئی ہو، بعض علماء نے علوم دینیہ کی طرف توجہ کی اور بعض رسائل اپنی یادگار چھوڑے، لیکن یہ ان کی ذکاوت اور وسعت علم کا نمونہ ہے، ان کو ان علوم کتاب وسنت میں فنا کا درجہ حاصل نہیں تھا اور جبتک کوئی شخص کسی چیز میں فنا نہ ہو اور اس کا عشق اور اسکی رنگینی اسپر طاری نہ ہو جائے، اس کے پاس بیٹھنے والوں، اور دوسروں میں اس کا ذوق پیدا نہیں ہوتا اور اس کا وہ رنگ دوسروں تک منتقل نہیں ہوتا، دور آخر میں دو علماء اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں، اور ان سے وہ فائدہ پہونچا جو علماء ربانیین سے پہونچنا چاہئے۔ ایک مولانا عبدالحی صاحبؒ فرنگی محلی دوسرے مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی رحمہما اللہ تعالیٰ۔

تیسرا سبب یہ ہو کہ یہاں کے تصوف وطریقت کے خانوادوں اور اہل سلسلہ حضرات کو رد بدعات اور ترویج سنت کا وہ ذوق اور جوش نہ تھا، جو ان خانوادوں اور سلسلوں میں پایا جاتا ہے جو حضرت مجدد الف ثانیؒ یا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے کسی طرح متأثر ہوئے ہیں، ان حضرات کے علو مقام ان کی حقیقت دانی ورمز شناسی سے ہرگز انکار نہیں۔ ان سے جو دینی اور روحانی فائدہ پہونچا، قلوب کی جو تاریکی دور ہوئی، اور یاد الٰہی کا جو ذوق پیدا ہوا اس کے پورے اعتراف کے ساتھ اس حقیقت کے اظہار میں باک نہیں کہ اصلاح عقائد ورسوم اور تجدید دین کا یہ گوشہ ان کے دائرۂ عمل سے خارج رہا۔

سلاطین، علماء، ومشائخ، یہی تین عناصر حکومت ہیں، جن کے زیر اثر مسلمان رہتے ہیں اودھ کی موجودہ حالت انھیں کے رجحانات، مشاغل اور ذوق کا عکس ہے، اس صورت حال کے خلاف

(جو ایک صدی سے زائد مدت سے قائم تھی، اور جو ان طاقتور مؤثرات کا نتیجہ تھی) جن لوگوں نے قدم اُٹھایا، ان کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک اچھا خاصہ میدان جہاد اُن کے سامنے تھا لیکن اُنھوں نے اپنے اخلاص، سرگرمی، روحانیت اور تبلیغی جد وجہد سے اس میدان کو فتح کرلیا۔

حضرت سید احمدؒ شہیدؒ نے سب سے پہلے اس میدان میں قدم رکھا، آپنے حج سے پہلے اودھ کے بیشتر قصبات اور مقامات کے تبلیغی دورے کئے جنیں آپکے ہمراہ سو سو آدمیوں سے زیادہ ہوتے تھے، ہزاروں آدمی بیعت میں داخل ہوئے، اور ہزاروں نے شرک و بدعت اور گناہوں سے توبہ کی خلاف شرع اُمور و مراسم کو چھوڑا اور شرک و بدعات کے شعائر و نشانات اور شیعیت کے آثار مٹائے۔ ۷۰۰ آدمیوں کے قافلہ کے ساتھ آپنے ایک مہینہ لکھنؤ میں قیام فرمایا، علمائے دہلی کے مواعظ ہوئے، اور دار السلطنت میں اصلاح خیال کی ایک رَو دوڑ ہو گئی، اور دینداری اور شرع کی ایک فضا پیدا ہو گئی، یہ کام اور آگے بڑھتا، لیکن ۱۲۳۶ھ میں سفر حج اور ۱۲۴۱ھ میں سفر ہجرت و جہاد کی وجہ سے یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔

لیکن ۱۲۵۹ھ میں جب مولانا سید خواجہ احمدؒ نصیرآبادی حضرت سید صاحب کے خلیفہ مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری سے تعلیم و فراغت حاصل کرکے اپنے وطن نصیرآباد آئے تو آپنے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، اور اسی نواح میں اسکی تکمیل کی۔

آپکے خلیفہ مولوی حکیم سید فخرالدین صاحبؒ مہر جہانتاب میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا کہ ایک عزیز نے خواب دیکھا اور مجھ سے بیان کیا کہ حضرت امام المجاہدین مرشد آفاق سید احمدؒ قدس سرہٗ مسجد میں تشریف رکھتے ہیں اور آپ بھی موجود ہیں، راوی کہتے ہیں میں وضو کر رہا ہوں کہ وضو کرکے اذان کہوں، ابھی میرا وضو ختم نہیں ہوا تھا کہ حضرت سید احمد صاحبؒ نے آپکو (مولانا خواجہ احمد صاحبؒ) حکم دیا کہ اذان دو، مجھے تعجب ہوا کہ آپ کو اذان دینے کا کیوں حکم دیا؛ مولانا نے فرمایا کہ مسجد دنیا میں

بہترین جگہ ہوتی ہے، اور اذان اطلاع و اعلان کا ایک ذریعہ ہے، اسلئے اسکی تعبیر یہ ہے کہ گویا حضرت سید صاحب مجھے اپنے طریقۂ ترویج دین و احیاء سنت کا حکم دے رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں اسکو ان لوگوں تک پہونچادوں جن تک ابھی یہ نہیں پہونچا ہے۔ چنانچہ قصبات اور دیہاتوں کا دورہ اور گاؤں گاؤں تبلیغ اسی کا ظہور ہے۔

اس تبلیغ و ہدایت کا ایک سب سے قوی اور مؤثر ذریعہ بیعت تھا، تحصیل علم اور قطع منازل سلوک کے بعد جوق جوق لوگوں نے آپکی طرف رجوع کیا، اسوقت ان اطراف میں آپ سے بڑھ کر عالی سلسلہ، صاحب نسبت اور جامع شریعت و طریقت کوئی ہستی نہ تھی، اور آپ سے بڑھ کر کوئی عزیمت پر عمل کرنے والا اور صاحب استقامت شیخ نہ تھا، خاندان میں بھی اب دور آخر میں آپ ہی کی ذات تھی، اسلئے جتنے لوگ اس خاندان سے عقیدت رکھتے تھے، یا حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ سے وابستہ تھے ان سب نے آپ کی طرف توجہ کی، دیہاتوں اور قصبات کے ہزاروں مسلمانوں نے آپکے ہاتھ پر توبہ اور بیعت کی اور آپنے ان کو شرک و بدعت سے تائب کر کے سلسلہ میں داخل کیا، اور اتباع شریعت اور پیروی سنت کا عہد لیا، پھر آپ انکی نگرانی اور ان کا احتساب فرماتے رہے اور ان کی تعلیم و تربیت میں کوشاں رہے۔ انہیں سے بہتوں کو اپنی خدمت میں رکھ کر انکی تکمیل کی اور جادۂ شریعت پر ثابت قدم اور مستقیم بنادیا۔ دیہاتوں اور قصبات اور شہروں کے سفر اور دوروں میں سیکڑوں آدمی بیعت ہوتے اور شرک و بدعت خلاف شرع رسوم و اعمال اور معاصی سے توبہ کرتے اور احکام شریعت کی پابندی اختیار کرتے۔ یہ بیعت اصلاح عقائد و اعمال کا بہترین ذریعہ تھی، اور اس سے آپکا یہی مقصد تھا، چنانچہ اپنے ایک اجازت نامہ میں جو آپنے مولوی حکیم سید فخرالدین رحمۃ اللہ علیہ کو عطا کیا اپنے قلم خاص سے تحریر فرماتے ہیں۔

" الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علیٰ رسولہ محمد سید المرسلین و علیٰ آلہ و اصحابہ الذین قاموا بنصرۃ الدین، اما بعد می گوید المفتقر الی اللہ الصمد

عقیر خواجہ احمد حسنی عفی عنہ وعن اسلافہ کہ مقصود از بیعت بر دست مشائخ طریقت ہمین است
کہ راہ رضامندی حق بدست آید، وراہ رضامندی حق منحصر در اتباع شریعت غرا است
ہر کہ سوائے شریعت مصطفویہ را طریق تحصیل رضامندی حق انگارد بیشک آن شخص
کاذب و گمراہ است ودعوئ او باطل و ناسموع، واساس شریعت مصطفویہ دو امر است
اول ترک اشراک و ثانی ترک بدعات، بالجملہ در جمیع عبادات و معاملات وامور معاشیہ
معادیہ طریق خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم را بکمال قوت وعلو ہمت
باید گرفت۔"

اسکی کچھ اور تفصیل و تشریح اس وصیت سے ہوتی ہے جو اس سلسلہ کے لوگ عوام سے بیعت لیتے وقت کرتے تھے چنانچہ آپکے خلیفہ حضرت سید شاہ ضیاء النبی رحمۃ اللہ کی تحریر سے یہ الفاظ نقل کئے جاتے ہیں

"موافق فرمانے خدا اور رسولؐ کے تعمیل کریں، امر کو بجا لاویں جیسے نماز روزہ وغیرہ
اور نہی سے باز رہیں، جیسے شرک و بدعت و گناہ مانند سجدہ کرنے واسطے بزرگوں کے
زندہ ہوں یا مُردہ اور تعزیہ داری اور ناچ اور راگ و سود خواری اور رسوم ممنوعہ
کہ شادی و غمی میں مروّج ہیں، اور سوا اس کے، پس جو اس کے خلاف کرے گا وہ
گنہگار ہوگا، اور توبہ اسکی شکست ہوگئی، تجدید توبہ اُسپر لازم ہے، ہو الموفق والمعین۔"

یہ دونوں اقتباسات ان حضرات کے حقیقی خیالات کا آئینہ ہیں، اور ان سے بیعت کا مقصد اصلی معلوم ہوتا ہے، ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہو کہ جو لوگ بیعت اور عہد و پیمان کرتے تھے، ان کی کسقدر اصلاح ہوتی ہوگی، اور اس سلسلہ سے شرک و بدعات کا کس قدر استیصال اور شریعت و سنت کا کس قدر رواج ہوتا ہوگا۔

تبلیغ کا دوسرا ذریعہ آپکے مواعظ و نصائح تھے، مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب لکھتے ہیں کہ

جمعہ کی نماز سے عصر کے وقت تک سفر میں ہوں یا حضر میں برابر وعظ فرماتے اور بسم اللہ سے لیکر والناس تک قرآن مجید کی تفسیر مسلسل بیان کرتے۔ جب قرآن شریف کا ایک دور ختم ہوجاتا تو دوسرا دور شروع کرتے۔ ایام مرض موت اور بعض غیر معمولی حوادث کے علاوہ کبھی اس معمول میں فرق نہیں آیا، ان مواعظ میں خاص مقام اور اطراف وجوانب کے سیکڑوں آدمی شریک ہوتے اور متاثر ومستفید ہوتے۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ آپ مختلف مقامات پر تشریف لیجاتے وہاں مواعظ ہوتے، جبتک قیام رہتا نصیحت امر بالمعروف، نہی عن المنکر میں مشغول رہتے اور دینی مذکور رہتا، اسی عرصہ میں ہزاروں آدمی بیعت و توبہ کرتے اور ان کی زندگی میں تبدیلی ہوجاتی۔ بہت سے آپکی مجلس مبارک میں حاضر ہوتے سنت وشریعت کا سراپا نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے، بہت سے مسائل اور دین کے احکام دیکھ دیکھ کر اور خدمت میں رہکر سیکھ لیتے اور جہاں آپ اپنے رفقا اور خادموں کے ساتھ کچھ روز قیام فرمالیتے وہاں دین کا رواج ہوجاتا، اور اس کا ایک رنگ پیدا ہوجاتا، آجتک لوگ اپنے وطن اور قصبات میں آپکی آمد اور قیام کے قصے بڑے جذب و شوق سے بیان کرتے ہیں، اور ان برکات کو یاد کرتے ہیں، جو آپکی تشریف آوری اور قیام سے وہاں حاصل ہوئے اور آجتک ان مقامات پر کچھ نہ کچھ دین کا اثر موجود ہے۔

آپکی بیعت وارشاد اور وعظ وتلقین سے جن ہزاروں انسانوں کی اصلاح ہوئی اور انکی زندگی میں کامل تغیر ہوگیا ان کی صحیح تعداد صرف اللہ کو معلوم ہے، لیکن جن مقامات پر آپکا جانا زیادہ ہوتا تھا اور جہاں آپ کے لوگوں کا اثر زیادہ تھا وہاں یہ اصلاحی و دینی اثرات کسی نہ کسی شکل میں اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں ضلع رائے بریلی، پرتاب گڈھ، سلطان پور، جون پور، اعظم گڈھ، غازیپور، وہ مقامات ہیں، جہاں آپکا اثر ہوا، جون پور اور اعظم گڈھ، غالباً وہ مقامات ہیں جو بدعات سے تقریباً پاک ہیں اور بعض معمر بزرگوں کا بیان ہو کہ یہ مولانا سید خواجہ احمد صاحب کا فیض ہے[1]۔

---

[1] روایت حضرة الاستاذ مولانا شبلی صاحب نعیہ دار العلوم ندوة العلماء

ان تبلیغی واصلاحی سرگرمیوں کی مفصل روداد آج ہمیں دستیاب نہیں ہوسکتی نہ اسوقت کوئی ایسا آدمی موجود ہو، جوان سفروں میں ساتھ رہا ہو اور اپنے چشم دید حالات بیان کرے، لیکن اسکی تلافی مولوی حکیم سید فخرالدین صاحب کی قلمی تحریر سے ہوسکتی ہے، جوایک چشم دید گواہ ہیں، مولانا کی خدمت میں عرصہ تک رہ ہیں، اور قریبی خاندانی تعلق کے علاوہ جناب کے خلیفۂ مجاز ہیں، آپ کی تبلیغی کامیابی اور دینی اصلاح و تغیر کا ذکر کرتے ہوئے "مہر جہانتاب" میں لکھتے ہیں۔

"جب اللہ کی نعمتوں کے حصول کے بعد خلق اللہ پر شفقت نے آپکو اصلاح حال پر آمادہ کیا، تو سب سے پہلے وطن کے پھر دوسرے شہر و دیار کے لوگوں نے جوق جوق کسب فیض کے ارادہ سے آپکا قصد کیا، اور آپکے فیوض سے بہرہ اندوز ہوئے، آپکے حلقۂ تربیت میں رہکر اشغال و اذکار و مراقبہ و مشاہدہ کی تعلیم حاصل کی اور ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہکر تکمیل کی اور صاحب ارشاد ہوکر اپنے اپنے وطن واپس گئے اور حصول سعادت کے لئے آنجناب کو اپنے وطن میں تکلیف دی، کچھ زیادہ مدت نہ گزرنے پائی تھی، کہ اس قصبہ کے گرد و نواح شرک و بدعات کے اثرات سے اور ممنوعات شرعی اور امراض باطنی سے پاک ہوگئے، نماز روزہ کی پابندی عام ہوگئی، بیواؤں کے نکاح کا عام رواج ہوگیا، نفوس پاک صاف اور صفات و اخلاق حسنہ سے آراستہ ہوگئے خصوصًا قبائل شرقیہ سے اقوام قریشی جو بالکل ہمہ امیرت تھے اور ہمارے سلطان کو نو مسلم تھے، اور انھیں کی طرح دوسری برادریاں اور قومیں کہ صدیوں سے شرک و بدعات میں مبتلا تھیں، بلکہ ہندوؤں کی طرح ان کے نزدیک کفر و اسلام میں کوئی فرق نہ تھا، وہ خدا کے فضل سے ایسے پابند شریعت بن گئے، کہ اگر ان کی برادری میں کوئی کسی خلاف شرع امر کا مرتکب ہو تو اس کو برادری سے خارج کر دیتے ہیں، اور اس کے ساتھ نشست و

برخاست ترک کر دیتے ہیں، اور وہ لوگ جو ہمیشہ دھوتی باندھتے تھے، اب کرتہ اور شرعی پاجامہ ان کا لباس ہے، دیکھنے والا یہ سمجھے گا کہ ان لوگوں نے آج اسلام قبول کیا ہے۔ اس بنا پر اگر آنجناب کو تیرھویں صدی کے آخر کا مجدد کہا جائے تو بجا ہے کہ ملت محمدی کو زندہ اور سنت احمدی کو برپا کیا، وہ قومیں جو تیرھویں صدی کے مجدد حضرت سید احمد شہیدؒ کے عہد میں فیض سے محروم رہیں اور جنھوں نے اسلام میں سے کوئی حصہ نہ پایا، حضرت مخدوم زماںؒ کے زمانے میں بہرہ ور ہوئے، اور اس کام کی تکمیل ہوئی جس کا حضرت سید شہیدؒ نے آغاز کیا تھا، ان انبیا کرام کی طرح جنھوں نے سابق پیغمبروں کی شریعت کے احکام کا اجرا کیا، اور دُور دُور ان کی اشاعت کی اس قطب زماں نے تیرھویں صدی کے مجدد کے کام کی تکمیل کی اور شریک منصب تجدید ہوئے جس طرح ایک عہد میں ایک سو زائد انبیاء ہوئے ہیں اسی طرح ایک صدی میں دو مجدد ہو سکتے ہیں اور "علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل" سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اسی طرح قصبات اور دور دور کے شہروں کے مسلمان جو اسلام کا دعویٰ کرنے اور ارکان خمسہ ادا کرنے کے باوجود سنت نبوی سے بالکل بیگانہ اور بدعات اور رسم شنیعہ میں منہمک تھے جیسے مُردوں پر نوحہ و ماتم، سیوم، دہم و چہلم، اور مُردوں کے دوسرے کام اور تیل مائن، مہندی، کنگنا، ناچ گانا، اور شادی کے دوسرے مراسم، اسی طرح بدعات کی دوسری قسمیں، جیسے انعقاد مجلس میلاد، ذکر ولادت مبارک کے وقت قیام اور گیارھویں کی مجلس، بزرگوں کے عرس، نیاز اور ان سے اپنی دُنیاوی ضرورتوں میں استمداد و استعانت اور تعزیہ داری وغیرہ، اور انہیں سے بہت سے صوم وصلوٰۃ کے تارک، سود خوار تھے، مردوں کے لئے جو لباس ممنوع ہے پہنتے تھے، داڑھی

مُنڈاتے تھے اور دوسرے خلاف شرع کام کرتے تھے، انمیں سے اکثر ایسے پاک صاف ہوگئے جیسے کپڑا دُھل کر اُجلا ہوجائے اور اس کا سارا میل کچیل اور دھبے داغ مٹ جائیں اور اس کے برخلاف وہ راست معاملہ، صادق القول، اول وقت نماز کے پابند بن گئے، نوافل و اوراد کا التزام کرنے لگے، سود خواری چھوڑدی اور تمام اخلاق ذمیمہ اور اعمال قبیحہ سے توبہ کی، اور صفات حسنہ اور اعمال مسنونہ سے آراستہ پیراستہ ہوگئے۔"

(ترجمہ از مہر جہانتاب ص۱۰۹)

آپ کے خلفاء و مُریدین کے ذریعہ دین کی جو ترویج اور اعمال و اخلاق و رُسوم کی جو اصلاح ہوئی وہ مزید برآں ہے اور اس کا کچھ اندازہ آپ کے خلفاء و مُریدین کے تذکرہ سے ہوگا۔
(باقی)

(بقیہ صفحہ ۳) مربوط کردے کہ مستقبل کا دھندلکا کافور ہوجائے اور مسلمان طلبہ ایک نئے دینی اور ملی احساس سے معمور ہوجائیں ان کی مذہبی روح بیدار ہوجائے اور وہ ایمان و یقین کی قوتوں سے مسلح ہوکر زندگی کے میدان میں قدم رکھیں۔

علمی و دینی حلقوں میں یہ اطلاع بڑے افسوس کیساتھ سنی جائے گی، کہ گذشتہ مہینہ مولانا ابو عبد اللہ محمد سورتی صاحب نے انتقال کیا، مولانا علوم عربیہ اور فنون ادب کے ان چند متبحر اور محقق علماء میں سے تھے جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ممالک عربیہ میں بھی، اپنے اتقان، رسوخ فی العلم اور حفظ و استحضار میں بہت ممتاز اور مرجع و سند کا مرتبہ رکھتے تھے، ادب و لغت کے علاوہ علوم دینیہ بالخصوص فن حدیث سے مرحوم کو بہت شغف تھا، اور اس سب کے علاوہ دینداری، فیاضی و سیرچشمی میں اپنے اقران میں خاص امتیاز رکھتے تھے، افسوس ہے کہ مرحوم کو سکون کیساتھ حسب دلخواہ علمی و تعلیمی خدمت کا موقع نہ مل سکا، پھر بھی جو علمی کام انہوں نے انجام دیئے، انکی قدر و قیمت کا اہل علم کو اعتراف ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انھیں مغفرت و رضوان سے سرفراز فرمائے، اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

اسماء الرجال کی کتب متداولہ کے ماخذ

از
عبدالسلام قدوائی ندوی

پچھلے پچاس ساٹھ برس کے عرصے میں معاندین اسلام نے اسلام کو نقصان پہونچانے کے جو ہشیار طریقے اختیار کئے انمیں شاید سب سے زیادہ ضرر رساں وہ پروپیگنڈا ہے جو انھوں نے احادیث نبویؐ کے خلاف کیا، اس سلسلہ میں انھوں نے دنیا کو باور کرانے کی کوشش کی کہ حدیثیں تین سو برس کے بعد قید تحریر میں آئیں اس لئے ناقابل اعتبار ہیں، لیکن یہ بیان واقعات کے بالکل خلاف ہے، حدیثیں عہد نبویؐ ہی سے لکھی جانے لگی تھیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ہزاروں حدیثیں لکھی گئیں، صحابہ کرامؓ آپکے سامنے لکھتے تھے، آپ خود ضروری باتیں لکھا دیتے تھے اس مسئلہ پر الندوہ (فروری تا جون ۱۹۴۲ء) میں "حدیث کا ابتدائی تحریری سرمایہ" کے عنوان سے ایک مفصل مضمون شائع ہو چکا ہے، اس لئے یہاں مزید تفصیل کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی البتہ اس سلسلہ کا ایک اور پہلو قابل ذکر ہے۔

حدیث کی صحت و ضعف کا مدار ان راویوں پر ہے جنھوں نے یہ حدیث بیان کی ہے، اسلئے محدثین نے حدیث کی جمع و ترتیب کے ساتھ راویوں کے حالات سے بھی بحث کی اور اسماء الرجال کا ایک مستقل فن بن گیا، اسوقت اسماء الرجال کی تاریخ سے بحث نہیں ہے، اس موضوع پر انشاء اللہ کسی آیندہ فرصت میں کچھ عرض کیا جائے گا، سردست اسماء الرجال کی موجودہ کتابیں زیر بحث ہیں جس طرح حدیث کی موجودہ کتابیں پیش کر کے کہا جاتا ہے کہ یہ تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی ہیں اسلئے حدیث کا سارا دفتر ناقابل اعتبار ہے، اسی طرح اسماء الرجال کی متداول کتابیں پیش کر کے

کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ تیسری صدی کی تصنیفات ہیں اسلئے ان کے بیانات ناقابل تسلیم ہیں، لیکن جسطرح حدیث کے متعلق اعتراض بادر ہوا ہو اسی طرح اسماء الرجال کے متعلق اعتراض بھی بے بنیاد ہے حدیث کے ابتدائی تحریری سرمایہ کے متعلق مفصل بحث گوش گذار ہو چکی ہے، اب آج اسماء الرجال کے متعلق ایک مضمون پیش خدمت ہو، جو اس طویل سلسلۂ مضامین کا ایک حصہ ہو جو دار العلوم ندوہ کی علمی انجمن بزم رحمانی میں پڑھے گئے، موضوع کی غیر معمولی خشکی کا اعتراف ہو، لیکن الندوہ کے فاضل قارئین اس خشک بیانی کے عادی ہو چکے ہیں، اسلئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی، ذیل کی سطور میں مختلف اشخاص کے متعلق متفرق اور منتشر اقوال پیش کرنے کے بجائے ایک شخص کے بارہ میں متاخرین کا پورا بیان نقل کر کے متقدمین کے اقوال سے تطبیق دیگئی ہو تاکہ ذہن میں الجھن نہ پیدا ہو اور بحث کا تسلسل قائم رہے، اس مضمون کا مقصد چونکہ صرف متاخرین اور متقدمین کی عبارتوں کے درمیان اتحاد و ہم آہنگی دکھانا ہو اسلئے ترجمہ دینا بیکار معلوم ہوا ہو، پھر یہ بھی یقین ہو کہ اس مضمون کو وہی اہل علم پڑھیں گے جنھیں علم حدیث و رجال سے گہری دلچسپی ہے اور ان کے لئے نہ صرف یہی کہ ترجمہ کی ضرورت نہیں بلکہ ترجمہ ضیاع وقت کا باعث ہوگا، اس بنا پر بے ترجمہ عبارتیں شائع کی جارہی ہیں۔ (عبد السلام قدوائی ندوی)

عبد الرحمن ابن ابی لیلیٰ

تہذیب التہذیب میں انکا ذکر مفصل ہو جو تمام موجودہ کتب رجال کی جامع ہو، عبارت حسب ذیل ہے

"عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ واسمہ یسار ویقال بلال، ویقال داؤد ابن بلال ابن بلیل ابن احیحہ ابن الجلاح ابن الحریش ابن جحجبا ابن کلفہ ابن عوف ابن عمرو بن عوف ابن مالک ابن اوس الانصاری الاوسی ابو عیسیٰ الکوفی والد محمد ولد لست بقین من خلافت عمرؓ، روی عن ابیہ وعن عمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ وسعدؓ وحذیفہؓ ومعاذ ابن جبلؓ والمقدادؓ وابن مسعودؓ وابی ذرؓ وابی ابن کعبؓ وبلال ابن رباحؓ وسہل ابن حنیفؓ وابن عمرؓ وعبد الرحمٰنؓ

ابن ابی بکرؓ وقیس ابن سعدؓ وابی ایوبؓ وکعب بن عجرۃ وعبداللہ ابن زید بن عبدربہ ولم یسمع منہ وابی سعید وابی موسیٰ وام ہانی بنت ابی طالب وانس والبراء بن عازب وزید ابن ارقم وسمرہ ابن جندبؓ وصہیبؓ وعبدالرحمٰن ابن سمرۃ وعبداللہ ابن حکیم واسید ابن حضیرؓ وغیرہم رضوان اللہ علیہم۔

وعنہ ابنہ عیسیٰ وابن ابنہ عبداللہ ابن عیسیٰ وعمرو ابن میمون الاودی وہو اکبر منہ والشعبی وثابت البنانی والحکم ابن عتیبہ وحصین ابن عبدالرحمٰن وعمرو ابن مرۃ ومجاہد ابن جبر ویحیٰی ابن الجزار وہلال الوزان ویزید بن ابی زیاد وابو اسحٰق الشیبانی والمنہال ابن عمرو وعبدالملک بن عمیر والاعمش واسمٰعیل ابن ابی خالد وجماعۃ۔

قال عطاء ابن السائب عن عبدالرحمٰن ادرکت عشرین ومائۃ من الانصار صحابۃ وقال عبدالملک بن عمیر لقد رأیت عبدالرحمٰن فی حلقۃ فیہا نفر من الصحابۃ فیہم البراء یسمعون لحدیثہ وینصتون لہ وقال عبداللہ ابن حارث ابن نوفل ماظننت ان النساء ولدن مثلہ، وقال الدوری عن ابن معین لم یرعمر قال فقلت لہ فالحدیث الذی یروی کنا مع عمر نتراأی الہلال فقال لیس بشئی وقال اسحٰق ابن منصور عن ابن معین ثقۃ وقال العجلی کوفی تابعی ثقۃ۔ ذکر ابو عبید انہ اصیب سنۃ احدی وسبعین وہو وہم، ثم قال ابو عبید واخبرنی یحیٰی ابن سعید عن سفیان ان ابن شداد وابن ابی لیلیٰ فقدا بالجماجم وقد اتفقوا علی ان الجماجم کانت سنہ (۸۲) وفیہا ارخہ خلیفہ وابو موسیٰ وغیر واحد فقال انہ غرق بدجیل واللہ اعلم قلت وقال ابن ابی حاتم قلت لابی یصح لابن ابی لیلیٰ سماع من عمر قال ابو حاتم روی عن عبدالرحمٰن انہ رأی عمر وبعض اہل العلم یدخل بینہ وبین عمر البراء ابن عازب وبعضہم کعب ابن عجرہ وقال الآجری عن ابی داؤد رأی عمر ولا ادری یصح ام لا وقال ابو خیثمۃ فی مسندہ ثنا یزید بن ہارون انا سفیان الثوریؒ عن زبید وہو الایامی عن عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ سمعت عمر یقول صلوٰۃ الاضحیٰ رکعتین والفطر رکعتین الحدیث قال ابو خیثمہ تفرد بہ یزید ابن ہارون ہکذا ولم یقل احد سمعت عمر غیرہ ورواہ یحیٰی بن سعید وغیر واحد عن سفیان عن زبید عن عبدالرحمٰن عن الثقۃ ورواہ شریک عن زبید

عن عبد الرحمن عن عمر ولم یقل سمعت وقال ابن ابی خیثمہ فی تاریخہ قد روی سماعہ من عمر من طرق ولیس تصح وقال الخلیلی فی الارشاد الحفاظ لا یثبتون سماعہ من عمر وقال ابن المدینی کان شعبہ ینکران یکون سمع من عمر قال ابن المدینی ولم یسمع من معاذ بن جبل وکذا قال الترمذی فی العلل الکبیر وابن خزیمہ وقال یعقوب بن شیبہ قال ابن معین لم یسمع من عمر ولا من عثمان وسمع من علی (رضی اللہ عنہم) وقال ابن معین لم یسمع من المقداد وقال العسکری روی عن اسید بن حضیر مرسلا وقال الذھلی والترمذی فی جامعہ لم یسمع من عبد اللہ بن زید بن عبد ربہ وقال الاعمش ثنا ابراھیم عن عبد الرحمن بن ابی لیلی وکان لا یعجبہ یقول ھو صاحب مراء وقال حفص بن غیاث عن الاعمش سمعت عبد الرحمن یقول اقامنی الحجاج فقال العن الکاذبین فقلت لعن اللہ الکاذبین علی بن ابی طالب وعبد اللہ بن الزبیر والمختار بن ابی عبید قال حفص واھل الشام حمیر یظنون انہ یعنیھا علیھم وقد اخرجہم منھا ونعمہم (تہذیب جلد ۶ صفحہ ۲۶۲ تا ۲۶۲)

تہذیب ہی کی مذکورہ بالا عبارت اختصار کے ساتھ دوسرے تذکروں میں ہے اس لئے ہم اس کا اعادہ نہیں کرنا چاہتے اور صرف اسی نقل پر اکتفا کرتے ہیں۔ انھیں "بے سند" اقوال کو متقدمین نے سند کے ساتھ ذکر کیا ہے، ذیل میں اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

حافظ ابن حجر نے ترجمہ کی ابتداء ان الفاظ سے کی ہے۔

" عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ واسمہ یسار ویقال بلال ویقال داؤد بن بلال بن بلیل بن احیحہ بن الجلاح بن الحریش بن جحجبا بن کلفہ بن عوف بن عمرو بن مالک بن الاوس الانصاری ابو عیسیٰ الکوفی والد محمد ولد لست بقین من خلافۃ عمر رضی اللہ عنہ "

ابن سعد نے بھی طبقات میں تقریباً یہی لکھا ہے چنانچہ ان کے الفاظ ہیں۔

" عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ اسمہ یسار بن بلال وبلیل بن احیحہ بن الجلاح بن الحریش بن جحجبا بن کلفہ بن عوف بن مالک عن الاوس " (طبقات جلد ۶)

استیعاب میں بھی اسی قسم کے اقوال ہیں ابن الکلبی نے انکے والد کا نام داؤد قرار دیا ہو جسے حافظ ابن حجر بیان کر کے لکھتے ہیں، اس کے بعد پورا سلسلہ نسب وہی ہو جو تہذیب میں نقل ہوا ہے۔ (استیعاب جلد ۲ ص۳۷۶)

رہا ان کی کنیت کا معاملہ تو اسے بھی ابن سعد نے سند سے بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ

"حدثنا وکیع قال ثنا سفر عن الحکم ان عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کان یکنی ابا عیسیٰ"

"واخبرنا الفضل بن دکین قال اخبرنا اسرائیل عن عبدالاعلی الثعلبی ان عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کان یکنی ابا عیسیٰ" (طبقات جلد ۶ ص۷۵)

دولابی نے بھی اپنی کتاب الکنی میں بسند متصل اسے لکھا ہے۔

اسی ضمن میں حافظ ابن حجر نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"والدہ محمد ولد لست بقین من خلافۃ عمرؓ"

اسکی تصدیق بھی متقدمین کی زبان سے سن لیجئے۔ ابن ابی حاتم فرماتے ہیں۔

"حدثنا علی بن الحسن ثنا احمد بن سعید الدارمی ثنا النضر ثنا شعبہ عن الحکم عن ابن ابی لیلیٰ قال ولدت لست بقین من خلافۃ عمرؓ" (کتاب المراسیل ص۱۲۱)

صاحب تہذیب التہذیب آگے چلکر عطاء بن السائب کا قول نقل کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن لیلیٰ فرماتے ہیں کہ "ادرکت عشرین ومائۃ من الانصار صحابۃ"

ابن سعد نے بھی الفاظ سند سے ذکر کر دیے ہیں، ان کا بیان ہے کہ

"اخبرنا یزید بن ہارون قال اخبرنا شعبہ عن عطاء بن السائب قال سمعت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ قال لقد ادرکت عشرین ومائۃ من الانصار من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا سئل احدہم عن المسئلۃ احب ان یکفیہ غیرہ (الطبقات جلد ۶ ص۷۴)

دوسری اس سے قوی سند ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں۔

"اخبرنا حفص بن عمر الحوضی قال ثنا حماد ابن زید قال حدثنا عطاء بن السائب قال سمعت ابن ابی لیلیٰ قال ادرکت عشرین ومأۃ من الانصار من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما فیہم احد یسال عن شئی الا احب ان یکفیہ صاحبہ الفتیا وانہم ہاہنا یتوثبون علی الامور توثبا" (طبقات ابن سعد جلد ۶ ص۷۵)

اس کے بعد کے دو قول جو عبدالملک بن عمیر اور عبداللہ بن الحارث بن نوفل سے منقول ہیں مجھے ان کی سند نہیں ملی، معلوم نہیں کہاں سے نقل کیا ہے، البتہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں بالمعنی تائید کی ہو، ان کے الفاظ ہیں۔

"قال بن سیرین جلست الیہ واصحابہ یعظمونہ کامیر"

لیکن یہ قول خود سند کا محتاج ہے، ممکن ہے کہ تاریخ کبیر للامام بخاری اس کا ماخذ ہو جو بدقسمتی سے میرے پیش نظر نہیں، ان اقوال کے بعد تہذیب میں دوری کا مقولہ ہو کہ ابن معین فرماتے ہیں کہ

"لم یر عمر فقلت لہ فالحدیث الذی یروی کنا مع عمر (رضی اللہ عنہ) نترائی الہلال فقال لیس بشئی"

انھیں الفاظ کو بعینہ ابن ابی حاتم سے سن لیجئے، وہ فرماتے ہیں "قری علی العباس بن محمد الدوری قال سئل یحیی بن معین عن عبدالرحمن بن ابی لیلی عن عمر (رضی اللہ عنہ) قال لم یرہ فقلت الحدیث الذی یروی قال کنا مع عمر رضی اللہ عنہ نترائی الہلال فقال لیس بشئی" (کتاب المراسیل ص۴۹)

اس کے بعد اسحاق بن منصور کے واسطے سے ابن معین کا قول ثقہ اور اس کے بعد عجلی کا قول "کوفی تابعی ثقہ" ہے۔ ان دونوں کا ماخذ مجھے نہیں ملا لیکن ان کی کوفیت، تابعیت اور ثقاہت میں کیسے شک ہو سکتا ہے اور خود ان کا قول نقل ہو چکا ہے کہ "ادرکت عشرین ومأۃ من الانصار من اصحاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم کی ملاقات کا تذکرہ بھی آچکا ہے اور آگے بھر آئیگا اسکے بعد ابو عبیدہ سے "اصیب سنۃ احدی وثمانین" ہوا ہے مصنف نے خود وہم قرار دیا ہے، کیونکہ یہ مؤرخین کے متفقہ بیان کے خلاف ہے، خود ابو عبیدہ نے اس کے بعد ہی لکھا ہے۔

"اخبرنی یحییٰ ابن سعید عن سفیان ان ابن شداد وابن ابی لیلیٰ فقدا بالجماجم"

اسپر حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

"وقد اتفقوا علی ان الجماجم کانت ۸۲ھ وفیہا ارخہ خلیفہ وابو موسیٰ وغیرہ واحد یقال انہ غرق بدجیل"

ابن سعد طبری اور ابن اثیر سب نے یہی لکھا ہے، ابن سعد نے دجیل کا نام بھی لیا ہے طبری کے الفاظ ہیں۔

"فیہا قتل ابو البختری الطائی وعبد الرحمٰن ابن ابی لیلیٰ وقیل ان فقیلا قال ان الفرار کل ساعۃ بنا القبیح" (طبری تحت ۸۲ھ صفحہ ۱۱ ذکر الجماجم)

صاحب خلاصہ نے البتہ ۸۳ھ لکھا ہے، لیکن اسمیں کوئی حرج نہیں، کیونکہ جماجم کا معرکہ اگرچہ ۸۲ھ میں شروع ہوا، لیکن اس کا سلسلہ ۸۳ھ تک قائم رہا اور قتل کا سن تو ۸۲ھ ہی ہے جیسا کہ ابن اثیر اور طبری میں اسکی شہادت مل سکتی ہے رہا ۸۶ھ کا قول تو شاید حاشیہ پر غلطی سے لکھ دیا گیا ہے، ممکن ہے کہ یہ محمد ابن اشعث کے متعلق کسی حد تک صحیح ہو، اسلئے کہ طبری وغیرہ کی بعض روایتیں اسکی مؤید ہیں، لیکن ابن ابی لیلیٰ کے متعلق کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا اور ابن اشعث کے متعلق بھی امام بخاری ۸۲ھ ہی بتاتے ہیں، ان کے الفاظ ہیں۔

"وقتل بن الاشعث فیہا" (تاریخ صغیر صفحہ ۹۰ تحت ۸۲ھ) (باقی)

حالات ندوہ

امتحان سالانہ کا زمانہ قریب آگیا ہے، طلبا اپنی کتابوں کو پھر سے دیکھ رہے ہیں، ۱۲ر ستمبر سے امتحان شروع ہوگا جس کا سلسلہ ۱۰ دن جاری رہے گا، امتحان بعد صرف دس دن کے لئے دارالعلوم بند ہو جائیگا پھر حسب معمول ۵ر شوال (۱۶ر اکتوبر) کو نئے سال کا آغاز ہوگا، ابتدائی جماعتوں کے نتائج سال ہائے ماسبق کی طرح خاتمۂ تعطیل سے پہلے ہی شائع ہو جائیں گے، اعلیٰ جماعتوں کے نتیجہ میں کچھ دیر لگے گی لیکن اختتام تعطیل سے پہلے انشاءاللہ تعالیٰ وہ بھی شائع ہو جائیں گے۔

ندویوں کے حلقہ میں شاہ محمد جعفر صاحب ندوی کسی تعارف کے محتاج نہیں، ان کی اثر آفریں قرأت ان کی وجد انگیز مثنوی، ان کے دلچسپ اور پُراثر وعظ، اُن کی خوش انداز تقریریں اب بھی سب کو یاد ہوں گی ابکی کئی برس کے بعد شاہ صاحب دار العلوم آئے تو پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ ہوگئی، دوستانہ مجلسوں کے علاوہ انجمن الاصلاح کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا جس میں شاہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں طلبہ کے سامنے ندوہ کا بلند نصب العین پیش کیا۔

مجلس نقبا کا ذکر ان صفحات میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے، جولائی میں اس مجلس کا ایک دور ختم ہوگیا اور وحید الرحمٰن نقیب اعلیٰ اور نقیبان شرق و غرب عبد الغفار و محب اللہ کے بجائے عبد الحلیم گورکھپوری (نقیب اعلیٰ) عبد اللہ پھلواروی، محمد مصطفےٰ (نقیبان شرق و غرب) کا انتخاب ہوا ان کی امداد و اعانت کیلئے محمد اسحٰق افغانی و عبد الغفار (نقیبان تعلیم) محمد عثمان و علی احمد بنارسی (صلوٰۃ) عبد الرحمٰن گونڈوی و واحد علی رامپوری (صحت و صفائی) منتخب ہوئے۔

اس درمیان فٹ بال کے کئی میچ ہوئے جنمیں اسلامیہ کالج لکھنؤ سے مقابلہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے، ندوہ ٹیم کو تین گولوں سے کامیابی ہوئی کھیل کے بعد ایک ٹی پارٹی ہوئی۔

خدا کا شکر ہو کہ مولانا شبلی صاحب مدظلہ کا مزاج اب رو بصحت ہی، پھوڑا تقریباً اچھا ہوگیا ہی آنکھ کی شکایت البتہ ابھی تک باقی ہے بعض ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ آپریشن کی ضرورت ہی مولوی حامد علی صاحب ندوی بھی اب بحمد اللہ بالکل اچھے ہوگئے ہیں اور اس قابل ہوگئے ہیں کہ روزمرہ کا کام کرسکیں، طلباء قدیم کا سہ ماہی جلسہ عنقریب ہونیوالا ہے۔

اوپر امتحان کے متعلق اطلاع درج ہوچکی ہی ابھی رسالہ تیار ہی ہورہا تھا کہ بعض انتظامی ضرورتوں کی بنا پر امتحان کی تاریخوں میں تبدیلی ہوگئی اور ۱۳ ستمبر کے بجائے ۲۲ اگست ہی سے امتحان شروع ہوگیا۔

ضروری اعلان

کاغذ کا ہمارے پاس جو اسٹاک تھا وہ اب بالکل ختم ہوگیا بازار میں بھی ضرورت کے مطابق کاغذ دستیاب ہونا دشوار ہورہا ہے ہم کوشش کررہے ہیں کہ کاغذ کسی طرح ملتا رہے لیکن اگر اس دشواری کی وجہ سے آئندہ رسالہ بروقت شایع نہ ہوسکے تو قارئین کرام ہمیں معذور سمجھیں اس موقع پر اپنے خریداروں اور قدر دانوں سے گذارش ہے کہ وہ ہماری مدد کریں بہت سے احباب ایسے ہیں کہ جن کا چندہ گذشتہ آٹھ ماہ سے باوجود وعدہ کے اب تک وصول نہیں ہوا اگر وہ اس موقع پر اپنی رقم بذریعہ منی آرڈر جلد بھیج دیں تو ہمیں بڑی مدد ملے اور رسالہ کی آئندہ اشاعت ہمارے لیے نسبتاً آسان ہوجائے۔